سعادت کی زندگی

(۲۱ دروسِ احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں)

خرم مرادؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

عالم اسلام کے اردو داں طبقے کے لیے جناب خرم مراد (۱۹۳۲-۱۹۹۶) کی شخصیت ایک جانی پہچانی شخصیت ہے۔ طویل محنت و عرق ریزی، دینِ حق سے غیر مشروط و مخلصانہ وابستگی اور تقریر و تحریر میں سوز و دردمندی کی وجہ سے دین پسندوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے متعارف ہے۔ وہ اسلامی دنیا کے نام ور دانش ور اور تحریک اسلامی کے عظیم مفکر و رہ نما کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ گہرائی فکر اور بلندی خیال ان کی تقریروں اور تحریروں کی خصوصیات تھیں۔

جناب خرم مراد کی اردو میں کم و بیش پچاس اور انگریزی میں چھوٹی بڑی تیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دروس و خطابات ان کے علاوہ ہیں۔

زیر نظر کتاب ''سعادت کی زندگی'' جناب خرم مرادؒ کے ۲۱ دروسِ احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ دروس پہلے ادارۂ منشورات منصورہ، لاہور سے الگ الگ شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ''جنت کا سفر'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوے۔ اب عصر حاضر میں ان کی معنویت اور اہمیت کے پیش نظر مصنف کے ورثا اور ناشر کی اجازت سے اسے ''سعادت کی زندگی'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ فہرستِ مضامین پر نگاہ ڈالنے سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں قرآن و حدیث کی عظمت کو اجاگر کرنے والے مضامین بھی ہیں اور توحید و رسالت کے پہلو کو ممیز کرنے والے بھی، عبادات، نماز، روزہ، حج اور قربانی سے والہانہ شغف پیدا کرنے والے مضامین بھی ہیں اور نیکی و تقویٰ اور توبہ و انابت کے جذبے کو ابھارنے والے بھی۔ ایسی صورت میں یہ کتاب اپنی جگہ اصلاح اعمال اور تزکیہ نفس کے لیے ایک جامع نصاب کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب اس بات کا حق رکھتی ہے کہ اسے نمازوں کے بعد یا بعض دوسرے مواقع پر اصلاح وتربیت کی غرض سے پڑھ کر سنانے کا التزام کیا جائے۔ ان شاء اللہ اِس عمل سے اصلاح معاشرہ، تزکیہ نفس اور تربیت نفوس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ ہم امید کرتے ہیں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کے اس اقدام کو بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا۔

والسلام
ناشر

قرآن کے عجائب

عَنِ الْحَارِثِ الْاَعْوَرِ قَالَ مَرَرْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَاِذَا النَّاسُ يَخُوْضُوْنَ فِي الْاَحَادِيْثِ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَلِيٍّ فَقُلْتُ يَااَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَ اَلَا تَرٰى اَنَّ النَّاسَ قَدْخَاضُوْا فِي الْاَحَادِيْثِ قَالَ وَقَدْ فَعَلُوْهَا؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَلَا اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ فَقُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كِتَابُ اللّٰهِ فِيْهِ نَبَاُمَاقَبْلَكُمْ وَخَبَرُمَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَابَيْنَكُمْ وَهُوَالْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَالصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ هُوَ الَّذِيْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَآءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَآءُ وَلَا يَخْلَقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَآئِبُهٗ وَهُوَ الَّذِيْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا (اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ) مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَوَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هَدٰى اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(الترمذی، کتاب فضائل القرآن باب ماجاء فی فضل القرآن)

حارث الاعور بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بحث کر رہے تھے۔ میں حضرت علیؓ کے پاس گیا اور کہا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ لوگ آپس میں مناظرہ کر رہے ہیں۔ فرمایا: کیا وہ ایسے ہی ہیں۔ میں نے کہا: ہاں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ عنقریب فتنہ برپا ہوگا۔ میں نے کہا کہ اس سے نکلنے کا کیا راستہ ہے یارسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا: کتاب اللہ۔ اس میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں اور بعد میں آنے والے لوگوں کی خبر،

تمھارے درمیان حکم ہے اور اس کی بات قولِ فیصل ہے۔ مذاق نہیں ہے کسی متکبر نے اگر اس کو چھوڑ دیا تو اللہ اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور جس نے قرآن کو چھوڑ کر کسی اور سے ہدایت طلب کی اللہ اسے گمراہ کر دے گا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور یہ ذکرِ حکیم ہے۔ یہ سیدھا راستہ ہے یہ ایسی کتاب ہے کہ اس سے صرف وہی شخص گمراہ ہوتا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔ اس سے زبانیں خلط ملط نہیں ہوتی۔ علماء اس سے سیر نہیں ہوتے۔ بار بار دہرانے سے پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جب جنوں نے سن لیا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حتیٰ کہ پکار اٹھے: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا...... الخ کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے کہ جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے ساتھ ہم ایمان لائے جس نے اس سے بات کی اس نے سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا جائے گا۔ جس نے اس پر فیصلہ کیا اس نے عدل کیا اور جس نے اس کی طرف لوگوں کو بلایا اس نے سیدھے راستے کی طرف بلایا۔

ایک لحاظ سے نبی کریمؐ کی پوری زندگی دراصل قرآنِ مجید کی تفسیر اور اس کی عملی شکل ہے۔ ساری احادیث بھی قرآن مجید کا بیان، اس کی تشریح، اس کی توضیح اور اس کی تفصیلات کے مطابق ہیں۔ زیرِ مطالعہ حدیث بھی قرآن مجید سے متعلق ہے۔ حدیث تو طویل ہے لیکن اس کا مضمون اپنی جگہ پر بہت صاف اور واضح ہے۔ یہ حدیث حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے روایت کی گئی ہے اور اُن سے جو صاحب روایت کرتے ہیں اُن کا نام حارث ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک مسجد سے گزرا تو لوگ بہت ساری باتوں کی کھوج کرید میں لگے ہوئے تھے۔ میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ: اے امیر المومنین! کیا آپ نہیں دیکھتے کہ لوگ بے شمار باتوں کی کھوج کرید میں لگے ہوئے ہیں؟ حضرت علیؓ نے پوچھا: اچھا، کیا لوگ یہ کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے سنا کہ عن قریب فتنہ نمودار ہوگا۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی کتاب۔ اس میں اُن کے احوال ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور جو کچھ تمھارے بعد آنے والا ہے، اُس کی خبر ہے۔ جو کچھ بھی تمھارے درمیان معاملات ہیں اس کا بھی فیصلہ اور حکم اس کے اندر موجود ہے۔ اور یہ قطعی فیصلہ ہے، کوئی کمزور اور بے ہودہ بات نہیں ہے۔ جس نے زبردست اور طاقت ور بن کر اس کتاب کو چھوڑ دیا تو اللہ اُس کو کاٹ کر رکھ دے گا اور جس نے قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں ہدایت تلاش کی تو اللہ تعالیٰ اُس کو گمراہ کر

دے گا۔ یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ حکمت سے بھرپور یاددہانی ہے۔ یہی صراط مستقیم اور سیدھا راستہ ہے۔

یہ وہ چیز ہے کہ اس کے ذریعے آدمی کی خواہشات ٹیڑھے راستے پر نہیں جاتیں اور زبانیں اس کے درمیان خلط ملط نہیں کرتیں۔ عالم اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ جتنا بھی اس کو پڑھا جائے یہ پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو بالکل رکے بغیر اُنھوں نے کہا کہ ہم نے ایک ایسا قرآن سنا ہے کہ جو بڑا عجیب کلام ہے اور وہ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ جس نے قرآن سے بات کی اسے سچ جواب ملا۔ جس نے قرآن پر عمل کیا اُس کو اجر دیا جائے گا۔ جس نے قرآن کے مطابق فیصلہ کیا، اس نے انصاف کیا۔ جس نے قرآن کی طرف بلایا اس نے سیدھے راستے کی طرف بلایا۔

یہ حدیث جو آپ نے تفصیل کے ساتھ سنی ہے یہ قرآن کے مختلف پہلو ہمارے سامنے کھول کر بیان کرتی ہے۔ حدیث کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ایک ساتھی اُن کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوتے ہیں کہ اُنھوں نے کسی مسجد میں یہ دیکھا ہے کہ لوگ کچھ باتوں کی کھوج کرید میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب یہاں حدیث میں اس بات کی تشریح نہیں ہے کہ وہ کون سی باتیں ہیں جن کے بارے میں لوگ بحث ونزاع، جنگ وجدل اور کھوج کرید میں مصروف ہیں۔ لیکن اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے حضرت علیؓ کا دورِ خلافت یاد کریں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہورہے تھے، ان کے درمیان خون ریزی بھی ہوئی تھی اور مختلف گروہ نمودار ہورہے تھے۔ سیاسی معاملات میں، عقائد کے معاملات میں، اور دین کے معاملات میں بے شمار بحثیں چھڑی ہوئیں تھیں۔ تقدیر کا مسئلہ ہو، یا گناہ کبیرہ کرنے والے کا جنت یا جہنم میں جانے کا مسئلہ، بے شمار مسائل تھے جو مسلمانوں کی آپس کی لڑائی نے چھیڑ دیے تھے۔ حدیث میں حدیث کا جو لفظ کہا گیا ہے تو اس سے احادیث نبویؐ مراد نہیں ہیں۔ عربی میں حدیث بات کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ لوگ باتوں کی کھوج میں پڑے ہوئے ہیں، اُس میں بحثیں کررہے ہیں اور ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں اور قرآن کو اُنھوں نے چھوڑ دیا ہے۔

حضرت علیؓ نے اس پر اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ اچھا کیا اب لوگ یہ کرنے لگے ہیں! پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ سے یہ سنا ہے کہ عن قریب فتنہ نمودار ہوگا۔ فتنے کا لفظ عربی زبان میں بہت سارے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی آزمائش کے بھی ہیں اور فتنہ وفساد اور خرابی کے بھی۔ اس کے معنی تشدد اور جنگ کے ذریعے سے لوگوں کو اُن کے عقیدے کے مطابق عمل کرنے سے روکنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ مکہ کی زندگی میں کفارِ قریش مکہ کے مسلمانوں کے خلاف جو مظالم ڈھا رہے تھے، اُن کو بھی قرآن نے فتنے سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے ایک معنی زندگی کے معاملے میں گمراہی کے غلبہ کے بھی ہیں اور اس کے معنی زندگی کے ایسے نظام کے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم نہ ہو۔ یہاں پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لفظ جن معنوں میں استعمال ہوا ہے وہ مسلمانوں کے باہمی افتراق اور انتشار، اُن کے درمیان قتل وخون ریزی اور مختلف چیزوں پر جھگڑے تھے۔ یہ لفظ فتنہ ان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے اس بات کی پہلے سے پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ چیز پیش آنے والی ہے۔ میں نے اس پر آپؐ سے پوچھا تھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ اس سے نکلنے کا راستہ اللہ کی کتاب ہے۔

یہ پہلی بات سب سے پہلے ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اِس امت کی زندگی کی تعمیر اللہ کی کتاب پر ہوئی ہے۔ اس امت کو اس دنیا کے اندر جو کچھ بھی ملا ہے، وہ اللہ کی کتاب کے واسطے سے ملا ہے۔ اس کی سوچ، اس کی فکر، اس کا اخلاق یہ سب اللہ کی کتاب نے بنایا ہے۔ عرب کی سرزمین میں، بدر کے میدان میں اور اُس کے بعد مکہ کی سرزمین میں، جو فتوحات اُن کو حاصل ہوئیں، یہ سب بھی قرآن مجید کی برکت اور اُس کا صدقہ تھا۔ اُس کے بعد تیس سال کے عرصے میں شمالی افریقہ سے لے کر پورے مشرق وسطیٰ پر اُن کا غلبہ ہوگیا جیسی کہ قرآن مجید نے پیش گوئی کی تھی۔

اللہ کی کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے نتیجے میں ان کے دل بھی بدلے، اخلاق بھی بدلے، اعمال بھی بدلے اور زندگی بھی بدل گئی۔ دنیا کے اندر اُن کو خوش حالی نصیب ہوئی اور غلبہ اور عزت اُن کے حصہ میں آئی اور آخرت کا اجر بھی اُن کے لیے لکھا گیا۔ حدیث کے اس ٹکڑے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اندر جب بھی کوئی خرابی پیدا ہوگی تو

اُس خرابی کا علاج سوائے اللہ کی کتاب کے دوسرے نسخے میں نہیں۔

یہ بات ایک اور جگہ اس طرح بھی کہی گئی ہے کہ شروع کے دنوں میں جس چیز سے اِس امت کی بھلائی وابستہ تھی، آنے والے ہر دور میں بھی اُسی سے وابستہ رہے گی۔ ہم ہزار نسخے تجویز کرلیں، اور اُن کو عمل میں لے آئیں لیکن وہ امت جو قائم ہی قرآن مجید اور اُس پر ایمان کی بنیاد پر ہوئی ہے، قرآن مجید کی نفی کرنے کے بعد اس کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو کچھ بھی اس دنیا میں عطا کیا ہے' قرآن مجید کے واسطے سے عطا کیا ہے۔ اُس کے اندر اگر زوال آئے، پستی آئے، پسماندگی آئے، جہالت آئے، مغلوبیت آئے، ذلت آئے، تو اس سب سے نکلنے کا راستہ اللہ کی کتاب ہی ہے۔ اگر باہمی افتراق و انتشار پیدا ہو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کے درپے ہو جائیں، مسلمان کا مال مسلمان کے لیے حلال ہو جائے، مسلمان کا خون مسلمان کے لیے حلال ہو جائے تو بھی آدمی سو نسخے سوچے مگر کوئی نسخہ کام نہیں کرے گا' سوائے ایک نسخے کے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔

یہ اس میں سب سے پہلی بات کہی گئی ہے اور یہی دراصل سب سے اہم بات ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کتاب کے اندر جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہیں' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سب کا ایک ایک کر کے ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا کہ جو تم سے پہلے ہو چکا ہے' اُس کی خبر اس کتاب کے اندر موجود ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جو حالات آج پیش آرہے ہیں، وہی حالات اس سے پہلے بھی پیش آچکے ہیں۔ یہ کتاب کھول کر بیان کرتی ہے کہ اس سے پہلے بھی لوگوں کو فتنوں اور فساد کا اور بگاڑ کا سامنا کرنا پڑا اور اُن کا کردار کس طرح بگڑ گیا اور پھر کس طرح سُدھرا اور ٹھیک ہوا۔ مثال کے طور پر یہ کتاب عاد اور ثمود اور قوم لوط اور قومِ شعیب کا تفصیل سے بیان نہیں کرتی لیکن وہ بنی اسرائیل کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتی ہے۔ بنی اسرائیل ہماری طرح وہ امت تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے کتاب اور اپنی ہدایت کی نعمت سے نوازا تھا۔ اُن کو تورات کی امانت دی گئی اور ان کو اُس نے اپنا کام کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔ اُس کے بعد اُس کے اندر بگاڑ پیدا ہوا، باہمی لڑائی شروع ہوئی، وہ حق کے راستے سے ہٹنے لگے۔ جن لوگوں نے بھلائی کی طرف بلایا اُنھوں نے ان کی مخالفت کی، ناشکری اور نافرمانی کا راستہ اختیار کیا۔ بنی اسرائیل کی تفصیل تورات کے اندر موجود ہے، قرآن مجید نے اس کی طرف

بے شمار اشارے کیے ہیں اور فرمایا کہ کیونکہ انھوں نے ہم سے اپنا میثاق توڑ دیا' اس لیے ہم نے اُن پر لعنت کی اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیا۔ لعنت اور دلوں کی سختی یہ ہے کہ اچھی بات معلوم ہو لیکن دل پر اثر نہیں کرتی۔ وعظ اور تدریس کی کمی نہیں ہے، لیکن امت کی حالت میں بہتری پیدا نہیں ہوتی۔ یہ اس لیے ہے کہ قرآن مجید تو ایک میثاق بن کر نمودار ہوا ہے۔ قرآنِ مجید، اپنے ماننے والوں کے درمیان اور قرآن مجید دینے والے کے درمیان ایک معاہدے اور میثاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ میثاق یہ ہے کہ جو اِس کو مانے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے تو وہ اس کے اوپر عمل بھی کرے اور اس کو لے کر کھڑا بھی ہو۔

فرمایا کہ تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں' ان کی خبر اس کتاب میں موجود ہے۔ آئینہ تمھارے سامنے ہے۔ اس کتاب کو پڑھو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے' ان کے اندر کیا خرابیاں پیدا ہوئیں، اُن کے عقائد کس طرح بگڑے، اُن کی عبادتیں کس طرح خراب ہوئیں، اُنھوں نے نماز کو کس طرح ضائع کیا، مال کی محبت کس طرح پیدا ہوئی، سود کی لعنت میں کس طرح گرفتار ہوئے، یتیموں اور بیواؤں کے اوپر مظالم کیوں شروع ہوئے، بادشاہ اُن کے اوپر کیوں مسلط ہو گئے؟ یہ سارے کے سارے واقعات قرآن نے بھی بیان کیے ہیں اور تورات میں تو بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

پھر فرمایا: جو کچھ تمھارے بعد آنے والا ہے اس کی خبر بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ بعد میں آنے والے کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک تو دنیا میں جو تاریخ بعد میں آنے والی ہے' اُس کی خبر بھی اس کتاب کے اندر موجود ہے۔ اور دوسرے، موت کے بعد جو زندگی پیش آنے والی ہے، جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے' اُس کی خبر بھی اس کتاب کے اندر موجود ہے۔

یہ قرآن مجید کے وہ علوم ہیں جن کو ہمارے علما نے بیان کیا ہے اور اُن کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بعد میں تاریخ کا جو دور آنے والا ہے اُس کے بارے میں قرآن مجید نے یہ پیشین گوئی تو نہیں کی کہ یہ لازماً پیش آنے والا ہے لیکن اُس نے وہ اُصول بیان کیے ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ قوموں کے ساتھ معاملہ کرے گا۔ جو ظالم اور فاسق ہوں گے، جو زمین میں فساد برپا کریں گے' اُن کو اللہ تعالیٰ زمین کی امامت سے ہٹا لے گا اور

تباہ و برباد کردے گا یا معزول کردے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ساری دنیا کے انسانوں کا امام اور قائد بنایا تو اُنھوں نے پوچھا کہ کیا امامت میری اولاد کو بھی منتقل ہوگی؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح کردیا اور فرمایا: لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ○ (البقرۃ: ۱۲۴) ''میرا عہد ظالموں تک منتقل نہیں ہوگا۔'' گویا دوسرے الفاظ میں اس کتاب میں اس بات کی خبر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جو مقام بھی عطا فرمایا ہے' وہ مقام اس لیے نہیں عطا فرمایا کہ اس پر کسی نام کا لیبل لگا ہوا ہے بلکہ اس لیے عطا فرمایا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اس نے وفاداری برتی، اللہ کی اس کتاب پر عمل کیا اور اس کے پیغام کو لے کر وہ کھڑی ہوئی۔ جب وہ اپنی اس وفاداری کو ترک کردے گی اور دوسری جگہ آشنائیاں کرتی پھرے گی تو اللہ تعالیٰ اُس کو ذلیل و خوار کرے گا۔

اس کتاب میں اس کا بھی بیان ہے کہ کون سے اعمال اور طریقے ہیں جن سے تم دنیا میں سربلندی اور عزت حاصل کرسکتے ہو، تمھارے درمیان اعتماد پیدا ہوسکتا ہے، اور کون سا طریقہ ہے کہ جس سے ذلت اور پستی تمھارا مقدر بن جائے گی اور تم باہمی افتراق اور انتشار اور خون ریزی کا شکار ہو جاؤ گے۔ گویا تمھارے جتنے معاملات ہیں اُن کے بارے میں احکام اور فیصلے اس کتاب کے اندر موجود ہیں۔ جن جھگڑوں کے اندر تم پڑے ہوئے ہو اور جن معاملات میں آپس میں تمھارے درمیان لڑائی ہو رہی ہے، ان سب کے بارے میں فیصلہ قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ زندگی کے تمھارے جو بھی معاملات ہیں' اُن سب کے بارے میں اس کتاب کے اندر احکام موجود ہیں۔ اگر زندگی کی راہ چلنی ہو اور صحیح راستہ اختیار کرنا ہو تو وہ اسی قرآنِ مجید سے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ بالکل فیصلہ کن بات ہے۔ اس میں جو احکام دیے گئے ہیں اور جن چیزوں کے بارے میں فیصلہ کردیا گیا ہے وہ بالکل اپنی جگہ قطعی اور اٹل ہے۔ اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ قرآن مجید کی پیشین گوئیاں ایک ایک کرکے پوری ہوتی گئی ہیں۔ یہ وہ پیشین گوئیاں نہیں جو ہمارے زمانے کے نجومی کرتے ہیں، اس سال یہ ہونے والا ہے اور اُس سال یہ ہونے والا ہے۔ بلکہ افراد اور قوموں کی تقدیر کے بارے میں قرآن نے جو بھی فیصلے کردیے ہیں وہ ٹھیک اُسی طرح پورے ہوئے ہیں جس طرح اُس نے بتایا تھا۔

اس حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ زمین پر زبردست بن کر اپنے آپ کو غالب کر لیتے ہیں، وہ جب اس کتاب کو چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ اُن کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ مسلمانوں کے جن حکمرانوں نے غالب ہو کر جبر کا راستہ اختیار کیا، اللہ تعالیٰ ایک ایک کر کے اُن کو معزول کرتا گیا، اُن کی جڑ کٹتی گئی اور اُن کی جگہ دوسری قومیں آتی گئیں اور اس منصب کے اوپر فائز ہوتی گئیں۔ بنوامیہ گئے، بنوعباس گئے، سلاجقہ آئے، ترک آئے، منگول آئے، مختلف قومیں آتی گئیں لیکن جو بھی ظلم، زیادتی اور عدوان کے اندر حد سے آگے بڑھ گئیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ جس نے یہ چاہا کہ وہ زندگی بسر کرنے کا راستہ قرآن کے علاوہ کہیں اور سے تلاش کرے تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو بھٹکا دیا اور گمراہ کر دیا۔ مسلمان، ایرانیوں کے پاس گئے ہوں، جوگیوں کے پاس گئے ہوں یا آج واشنگٹن اور لندن میں بھیک مانگتے پھرتے ہوں کہ زندگی کیسے بسر کی جائے اور زندگی کا نظام کن بنیادوں پر قائم ہو، لیکن جس نے قرآن سے منہ موڑ کر اس کو کہیں اور تلاش کیا تو پھر اللہ تعالیٰ اُس کو گمراہ کر دے گا اور راہ سے بھٹکا دے گا۔ یہ دراصل اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اُس آیت کی طرف جس میں کہا گیا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص (اٰل عمرٰن: ۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور تفرقے میں مت پڑو۔'' اسی میں تمھاری دنیا کی اور آخرت کی بھلائی ہے۔ اسی سے تمھارا اتحاد وابستہ ہے۔ اگر تم نے اللہ کی رسی کو چھوڑا تو تم نسل اور رنگ اور زبان اور مختلف بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اللہ کے ساتھ لڑنا شروع کر دو گے۔ اس رسّی کو چھوڑ کر تم پستی و ذلت کی گہرائی میں جا گرو گے۔ اگر تم نے اس رسی 'قرآن مجید' کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا تو اتحاد اور محبت کی نعمت بھی تمھارے حصے میں آئے گی اور دنیا کے اندر سربلندی اور عزت بھی تمھیں ملے گی۔

یہ دراصل وہ یاد دہانی ہے جو حکمت سے بھری ہوئی ہے۔ قرآن مجید کہیں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں کوئی ایسی بات بتانے آیا ہوں جو تمھاری فطرت اور انسان کی حالت کے لیے اجنبی ہو۔ وہ تو نیکی کو نام ہی معروف دیتا ہے، یعنی وہ چیز جو آدمی کی پہچانی ہوئی ہے، اور برائی کے لیے منکر کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی وہ چیز جو آدمی کے لیے اجنبی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تو تمھیں تمھاری ہی فطرت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے آئے ہیں کہ اپنے خالق کی بندگی کرو، اُس

کی اطاعت میں زندگی بسر کرو۔ خدا کے بندے ہمیشہ یہی پیغام لاتے رہے اور اسی میں ساری حکمت و دانائی پوشیدہ ہے۔ قرآنِ مجید تو حکمت کی اُن ساری باتوں کی دراصل یاددہانی ہے جو ازل سے انسان کے ورثے میں چلی آرہی ہیں۔ یہ کتاب سیدھا راستہ ہے۔ آدمی زندگی بسر کرے تو اِسی کتاب کے اوپر چلے۔

آگے آپؒ نے فرمایا کہ خواہشات تو ہم سب کے اندر ہوتی ہیں۔ خواہش دولت کی بھی ہوتی ہے، محبت کی بھی ہوتی ہے، اچھا کھانے پینے اور پہننے کی بھی ہوتی ہے اور زندگی میں شہرت اور کامیابی کی بھی ہوتی ہے۔ ساری خواہشات بری نہیں ہوتیں، لیکن جو آدمی اس کتاب کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لے تو پھر اُس کی خواہشات اُس کو کبھی کجی اور ٹیڑھ کی طرف لے کر نہیں جائیں گی۔ وہ صحیح راستے سے بھٹک کر غلط راستے کی طرف نہیں جائے گا۔ اُس کی جائز خواہشات پوری ہوں گی اور جو خواہشات اُس کو سیدھے راستے سے ہٹانے والی ہوں گی اُن سے خود قرآن مجید روک دے گا۔ اس طرح زندگی کے بہت سارے مسائل کا حل اس قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ نہ وہ کھانے سے منع کرتا ہے نہ پینے سے، نہ شادی بیاہ سے منع کرتا ہے، نہ کاروبار اور تجارت سے اور نہ سلطنت و حکومت ہی سے منع کرتا ہے لیکن ان سب کو وہ حدود کا پابند کرتا ہے۔ جو اس کتاب کی پیروی کرے گا تو یہ ساری چیزیں حدود کی پابند رہیں گی اور کہیں کوئی کجی اور انحراف پیدا نہیں ہوگا۔

اس کتاب کے مضامین اتنے واضح اور صاف ہیں کہ جو آدمی ہدایت کی نیت سے اس کی جانب جائے اور اس کو سمجھنا چاہے تو اس کے اندر کوئی التباس، کوئی شبہ، کوئی چیز خلط ملط نہیں ہے، بلکہ ہر چیز اپنی جگہ پر واضح، روشن اور صاف ہے۔ اس کے اندر اتنے مضامین اور علوم بیان ہوئے ہیں کہ جو واقعی علم کی تلاش کر رہا ہو وہ اس سے کبھی سیر نہیں ہوسکتا۔ علم کی خواہش اور پیاس کبھی بجھ نہیں سکتی۔ جتنا آدمی اس کو پڑھے گا، جتنا اس میں اُترے گا، جتنا اس سے روشنی حاصل کرے گا اُتنا ہی اس کی پیاس بڑھتی جائے گی۔ یہ اِسی کتاب کا کمال ہے کہ آدمی ایک دفعہ دو دفعہ پڑھ کر یہ نہیں کرتا کہ اِسے شیلف کے اوپر رکھ دے بلکہ چودہ سو سال سے لاکھوں کروڑوں انسان روز اس کو پڑھتے ہیں، مہینہ میں ایک دفعہ ختم کرتے ہیں، سال میں ایک دفعہ ختم کرتے ہیں اور اس کے باوجود اس کے مضامین ختم نہیں ہوتے۔ علما کبھی اس

سے سیر نہیں ہوں گے۔ یہ اِسی بات کی ایک اور پہلو سے تشریح ہے کہ بار بار کثرت کے ساتھ پڑھنے سے بھی کبھی یہ پرانا نہیں محسوس ہوتا۔ اس کی تازگی اور خوشبو ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ بھی برقرار رہتی ہے۔ انسان نے سائنس میں اور ٹکنالوجی میں کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلی ہو، لیکن قرآن مجید کے بیانات آج بھی اُتنے ہی تر و تازہ اور اُتنے ہی صحیح ہیں جتنے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے تھے۔ آج بھی اُس کی آیات اسی طرح چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں جس طرح، پہلے دکھائی دیتی تھیں۔ ایک آدمی اگر اس سے تعلق پیدا کرلے، تو جتنا بھی وہ پڑھتا جائے، اس کو سمجھتا جائے، اس پر اپنا وقت لگائے، راتیں لگائے، دن لگائے لیکن کبھی یہ چیز پرانی اور باسی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ اُس کی شادابی، اُس کی تازگی اور اُس کی شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔

پھر آپؐ نے اُس واقعے کی طرف اشارہ فرمایا جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے کہ نبی کریمؐ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے تو کچھ جن حاضر ہوئے۔ وہ خاموشی سے سننے لگے۔ پھر آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو! کہ یہ کس کتاب کی تلاوت کر رہے ہیں۔ جب تلاوت ختم ہوگئی تو وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ہ یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ (الجن ۱:۱-۲) ''ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' پھر انھوں نے یہ کہا کہ ہم اس پر ایمان لائے۔

آپؐ نے فرمایا کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ جو سچائی اور انصاف سے بھری ہوئی ہے۔ جو آدمی قرآن مجید کی بنیاد پر بات کرے گا' وہ بات سچ ہوگی اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا وہی انصاف کے مطابق ہوگا۔ جو اس پر عمل کرے گا اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور جو قرآن مجید کی طرف بلائے گا تو وہی سیدھے راستے کی طرف بلائے گا۔

اگر آپ اس پوری طویل حدیث کو پھر اپنے ذہن میں تازہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آج امت مسلمہ پوری دنیا میں اور ہمارے ملک میں جس حال سے گزر رہی ہے اور ہم میں سے ایک ایک آدمی اپنی گھریلو اور پرائیویٹ زندگی میں جن حالات سے گزر رہا ہے، اُن سب کی طرف اس حدیث میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ جو بھی جھگڑے ہیں اُن کا حل اِسی کتاب کے اندر موجود ہے۔ مسلمانوں کے لیے اگر کوئی راستہ نجات کا راستہ ہے، بھلائی کا راستہ ہے،

باہمی لڑائی، تفرقے اور خون ریزی کو ختم کرنے کا راستہ ہے، تو وہ وہی ہے جو اس کتاب کے اندر موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس امت کی ساری زندگی قرآن مجید سے وابستہ ہے اور دنیا کے اندر اس کو جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے، اس بنیاد پر پیش آنے والا ہے کہ وہ اِس کتاب کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے۔ اگر وہ اس کتاب پر عمل کرتی ہے تو وہ دنیا میں اور آخرت میں سربلند ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف صاف قرآن مجید میں اس بات کی خبر دی ہے۔ اگر قومیں ایمان اور تقوے کا راستہ اختیار کریں گی تو ہم آسمانوں سے برکتیں برسائیں گے، اور زمین کے نیچے سے رحمتوں کے چشمے ابلنے شروع ہوں گے۔ اگر یہ لوگ قرآن مجید کو قائم کریں گے تو اوپر سے بھی کھائیں گے اور نیچے سے بھی کھائیں گے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

(الاعراف: ۹۶)

"اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقوے کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے"۔

ہماری ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ محض وعدے نہیں تھے بلکہ یہ پورے ہوئے۔ قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد تقریباً ۵۰ سال کے عرصے میں، بڑی بڑی حکومتیں مسلمانوں کے آگے سرنگوں ہوگئیں۔ شہروں نے اپنے دروازے اُن کے لیے کھول دیے۔ آبادیوں کی آبادیوں کے دل اُن کے لیے مسخر ہو گئے اور عرب کے چرواہے اور تاجر اور گڈریے، بھیڑ اور بکری چرانے والے ساری دنیا کے لیڈر اور امام بن گئے۔ مگر جب اُنھوں نے اس کتاب سے گریز کیا تو کبھی اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک قوم کو مسلط کیا، کبھی دوسری قوم کو، کبھی تاتاری آئے اور کبھی یورپین اُٹھے اور اُن کو ذلیل اور رسوا کرتے رہے۔ اگر آج پوری دنیا میں مسلمان ایک ارب سے زیادہ ہونے کے باوجود اور ۵۵ آزاد ملکوں کے ہونے کے باوجود، اور بہترین انسانی وسائل، معدنی وسائل اور مادی وسائل کے باوجود اور دنیا کے پانی کے اور ہوا کے راستوں پر قابض ہونے کے باوجود اگر کہیں ان کا وزن نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی زندگی میں قرآن مجید کا وزن نہیں ہے۔ اس حدیث پر آپ جتنا بھی غور کریں گے تو یہ

محسوس کریں گے کہ یہ ہمارے انفرادی' اجتماعی سارے امراض اور بیماریوں کے حل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔قرآن مجید کا تو یہ دعویٰ ہے کہ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یونس:۵۷) "یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے۔" مرض اور بیماری تو انسان کے سینوں اور دلوں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ حدیث بھی آپ جانتے ہیں کہ آدمی کے جسم میں جو دل ہے، یہ اگر بگڑ جائے تو زندگی بگڑ جاتی ہے، یہ سدھر جائے تو ساری زندگی سدھر جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے امراض کا علاج تو اللہ کی کتاب ہے۔ یہ راستہ بتانے آئی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کے پیچھے چلیں اور اس رسّی کو پکڑ لیں۔ اس میں حکمت کی جو باتیں بتائی گئی ہیں اُن کو اختیار کریں۔ ہمارے معاملات کا جو فیصلہ قرآن مجید نے کیا ہے' اُس فیصلے کو قبول کریں اور اُس کے پیچھے چلیں۔

اللہ کی قدرت و عظمت

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اللّٰہُ عزَّوَجلَّ عِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَآلٌّ اِلَّامَنْ ھَدَیْتُ فَسَلُوْنِی الْھُدٰی اَھْدِکُمْ وَکُلُّکُمْ فَقِیْرٌ اِلَّامَنْ اَغْنَیْتُ فَسَلُوْنِیْ اَرْزُقْکُمْ وَکُلُّکُمْ مُذْنِبٌ اِلَّامَنْ عَافَیْتُ فَمَنْ عَلِمَ مِنْکُمْ اِنِّیْ ذُوْقُدْرَۃٍ عَلَی الْمَغْفِرَۃِ فَاسْتَغْفَرَنِیْ غَفَرْتُ لَہٗ وَلَا اُبَالِیْ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَحَیَّکُمْ وَمَیِّتَکُمْ وَرَطْبَکُمْ وَیَابِسَکُمْ اِجْتَمَعُوْاعَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِیْ مَا زَادَ ذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَحَیَّکُمْ وَمَیِّتَکُمْ وَرَطْبَکُمْ وَیَابِسَکُمْ اِجْتَمَعُوْا عَلٰی اَشْقٰی قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِیْ مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُلْکِیْ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَجِنَّکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَحَیَّکُمْ وَمَیِّتَکُمْ وَرَطْبَکُمْ وَیَابِسَکُمْ اِجْتَمَعُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَّاحِدٍ فَسَاَلَ کُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْکُمْ مَابَلَغَتْ اُمْنِیَّتُہٗ فَاَعْطَیْتُ کُلَّ سَآئِلٍ مِّنْکُمْ مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُلْکِیْ اِلَّا کَمَا لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ مَرَّ بِالْبَحْرِ فَغَمَسَ فِیْہِ اِبْرَۃً ثُمَّ رَفَعَھَا اِلَیْہِ ذٰلِکَ بِاَنِّیْ جَوَادٌ وَاجِدٌ مَاجِدٌ اَفْعَلُ مَا اُرِیْدُ عَطَائِیْ کَلَامٌ وَعَذَابِیْ کَلَامٌ اِنَّمَااَمْرِیْ لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْتُّ اَنْ اَقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ (جامع ترمذی)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندو! تم سب کے سب گمراہ ہو مگر جسے میں نے ہدایت دی، پس مجھ سے ہدایت مانگو میں تمھیں ہدایت دوں گا۔ تم سب کے سب محتاج اور فقیر ہو۔ مگر جس کو میں نے غنی کیا لہٰذا مجھ سے روزی مانگو میں تمھیں روزی دوں گا اور تم سب گناہ گار ہو مگر جسے میں نے معاف کیا لہٰذا جس کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں بخش

دینے پر قدرت رکھتا ہوں پس مجھ سے بخشش مانگے۔ میں اس کو بخش دوں گا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ تمھارے پہلے اور پچھلے، تمھارے زندہ اور تمھارے مردہ اور تمھارے تر وخشک سب کے سب بڑا پرہیزگار اور پاک دل لے کر جمع ہو جائیں، جیسا کہ میرے سب سے بڑے متقی بندہ کا دل ہوتا ہے تو اس سے میرے ملک وسلطنت میں ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا۔ (اسی طرح) اگر تمھارے تمام اگلے پچھلے اور مردے زندے، ایک شقی، بدنصیب اور گناہ گار دل لے کر جمع ہو جائیں جیسا کہ شقی اور بدبخت کا دل ہوتا ہے تو میرے ملک وسلطنت میں ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر تمھارے اگلے پچھلے تمھارے جن و انس، تمھارے مردے زندے اور تمھارے خشک وتر ایک زمین میں جمع ہو جائیں اور تم میں سے ہر انسان دل کھول کر اپنی آرزو و مقصد مانگے اور میں ہر ایک کو جتنا وہ مانگتا ہے دے دوں تو اس سے بھی میرے ملک و بادشاہت میں کچھ کمی نہیں آئے گی مگر اتنی جتنی کہ تم میں کوئی سمندر کے پاس سے گزرے اور اس میں سوئی ڈبوئے پھر اس کو اپنی طرف اٹھائے اور یہ سب اس لیے کہ میں سخی ہوں۔ میں واحد ہوں (بڑی وسعت و کرم والا ہوں) جو چاہتا ہوں کر گزرتا ہوں۔ میرا دینا کہہ دینا ہے۔ میرا عذاب بھی کہہ دینا ہے۔ میرا امر کسی چیز کے لیے یہ ہے کہ جب میں اس کا وجود چاہوں تو کہہ دیتا ہوں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں بڑی قوت رکھنے والا ہوں اور سب میرے سہارے پر ہیں۔ میرے فقیر اور محتاج ہیں۔ روایات میں مختلف الفاظ ہیں۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ: "عَطَائِیْ کَلَامٌ وَ عَذَابِیْ کَلَامٌ" میرا دینا بس اتنا ہے کہ میں بس کہہ دوں اور وہ آدمی کو مل جاتا ہے اور میرا عذاب بھی اتنا ہے کہ میں بس کہہ دوں، یعنی میرا کہنا کافی ہے: اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (یٰسٓ:۸۲) "وہ جب کوئی کام کرنا چاہے تو اس کا کام بس یہ ہے اسے حکم دے کہ: "ہو جا" اور وہ ہو جاتا ہے۔" دوسری روایت میں الفاظ ذرا مختلف ہیں۔ کہا گیا ہے کہ تمھارے اعمال کو میں نے حفاظت کے ساتھ شمار کر کے رکھا ہوا ہے۔ اب جو آدمی بھلائی پائے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور جو آدمی اپنے اعمال کے نتیجے میں برائی، شر اور نقصان پائے تو وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔ کسی اور کو ملامت نہ کرے۔ حدیث تو بڑی طویل ہے اور دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچانے والی ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق کا پورا آئینہ اس حدیث کے اندر پیش کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان بھی اس میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی عظمت اور شان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کا دیا ہوا ہے۔

ہماری زندگی کی ضروریات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو مادی ضرورت

ہے۔ ایک حدیث میں پانی تک کا ذکر ہے کہ تم سب پیاسے ہو سوائے اس کے کہ جس کو میں پانی پلواؤں۔ تو سارے کے سارے خزانے اس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ ہماری ساری مادی ضروریات پوری کرتا ہے۔ دوسری ہماری معنوی ضروریات ہیں۔ کون سا کام کریں، کس طرح اپنے آپ کو رکھیں اور زندگی کیسے بسر کریں کہ جس سے کامیابی اور فلاح ہمارے حصے میں آئے۔ یہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کے ضرر اور نقصان سے بچ جائیں۔ اچھے اعمال کا انجام اچھا ہوتا ہے لیکن برے اعمال کا انجام برا ہوتا ہے۔ تو برے اعمال سے بچانا بھی اس کے دست قدرت میں ہے۔ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں: ''تم رات دن خطائیں کرتے ہو اور میں تمھیں معاف کرتا رہتا ہوں۔''

انسان کی یہ تینوں ضروریات اللہ تعالیٰ پوری کرتا ہے۔ ان تین چیزوں کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ انسان اسباب کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سبب ہوگا تو کوئی چیز پہنچے گی۔ کوئی چیز نہیں ہوتی تو ہم اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں اور اگر کوئی چیز ہو جاتی ہے تو ہم اس تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ کیوں اور کس لیے ہوئی۔ اپنی زندگی میں کچھ ہو یا قومی زندگی میں کچھ ہو، ہم کو اسباب کی تلاش ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو سارے اسباب کا خود خالق ہے۔ اس کو کسی سبب کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس کا کہنا اور ارادہ کرنا اور حکم دینا انسان کو سب کچھ عطا کر دیتا ہے۔ اللہ کے خزانے بے حساب ہیں۔ ان کی کوئی انتہا نہیں۔ اگر انسان وہ سب کچھ بھی مانگ لے جو وہ مانگنا چاہتا ہے اور جو اس کی انتہائی آرزو اور خواہش ہے حتیٰ کہ دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں مانگ لے اور سب کے سب انسان مل کر بھی مانگ لیں اور اللہ تعالیٰ سب دے بھی دے، تب بھی اس کی بادشاہت اور خزانوں میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی۔ مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہ ہوگی۔ اگر کوئی انسان اس کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا اور اگر کوئی نفع پہنچانا چاہے تو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا۔

حدیث میں آتا ہے: رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ ''قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے''۔ نفع و نقصان کی امید تم صرف اللہ سے رکھو۔ یہاں پر اس کی فیاضی اور بخشش کا پہلو ہے۔ کوئی ہاتھ ایسا نہ ہو جو آدمی اللہ کے علاوہ کسی اور کے آگے پھیلائے۔ اس لیے کہ اللہ کے علاوہ اور کسی کے پاس کوئی خزانہ نہیں، ہر چیز اس کے پاس موجود ہے۔ کوئی نگاہ

کسی اور کی طرف اس امید سے نہ اٹھے کہ اس سے میری کوئی حاجت پوری ہوگی۔ ساری حاجتیں پوری کرنے والا اللہ ہے۔ ضروریات ہم کو پریشان کرتی ہیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں، امیدیں باندھتے ہیں۔

گناہوں کے بارے میں تو فرمادیا ہے کہ: لَا اُبَالِیْ مجھے پروانہیں۔ اسے کوئی پروا نہیں ہے۔ آدمی جتنے بھی گناہ کریں' ان گناہوں سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ یہ سوال بھی اکثر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری نیکی سے کیا فائدہ ہے' اور کیوں وہ چاہتا ہے کہ ہم نیک بنیں اور اچھے کام کریں۔ فرمایا کہ نیکی سے یا برائی سے اس کے نفع' نقصان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی ذات ہے جس کا کوئی سرا بھی انسان کی محدود عقل نہیں پا سکتی۔ اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ذات کا کیا مقصد ہے؟ اس کو کیا حاصل ہوتا ہے؟ تو یہ آدمی کا ایسے میدان میں اپنی عقل دوڑانا ہے جہاں عقل دوڑنے سے قاصر ہے۔ ہمارے لیے کیا مقصد ہے' وہ تو واضح ہے کہ آدمی اللہ کی بندگی کی راہ اختیار کرے' اس سے ڈرے' خوف کھائے' زندگی کو اس کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق چلائے تو اس کو فلاح اور کامیابی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں معاشی و مادی وسائل کی خوش خبری سنائی ہے اور آخرت میں بھی جنت کی ساری نعمتیں اس کے لیے تیار ہیں۔ یہ اس نے خوب اچھی طرح بتادیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے تمھیں کیا نقصان پہنچے گا اور فرماں برداری کرنے سے تمھیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ لیکن انسان کی عقل اس سوال کا احاطہ نہیں کرسکتی اور نہ یہ سوال مخلوق کے کرنے کا ہے کہ خالق کو مجھے بنانے کی کیا ضرورت تھی اور میری نیکی کرنے سے خالق کو کیا ملے گا۔ یہاں انسان خالق کو اپنے درجے پر رکھ کر سوچتا ہے کہ جس طرح مجھے کچھ ملتا ہے تو میں اس کے لیے کام کرتا ہوں اور نقصان سے بچنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح خالق کو بھی کرنا چاہیے۔ اس بارے میں بھی حدیث نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اگر سارے کے سارے انسان بھی اتنے نیک ہوجائیں جتنا اللہ کا کوئی نیک بندہ ہے تو اس سے اللہ کی شان میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اور اگر سارے بندے اللہ کے خلاف ہوجائیں تو بھی اسے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اگر اچھے اعمال کریں گے تو اس کا فائدہ عمل کرنے والے کو ہوگا اور اگر برے اعمال ہوں گے تو نقصان بھی عمل کرنے والے کا ہوگا' اللہ کو نہ ہوگا۔

اس کے بعد پھر اللہ نے فرمایا کہ تمھارے اعمال کو میں شمار کر کے رکھتا ہوں۔ جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے، خواہ دنیا میں یا آخرت میں پیش آئے، یہ سارے کا سارا تمھارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اب آدمی یہ پوچھ سکتا ہے کہ اگر سب اعمال کا نتیجہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے یوں کیوں فرمایا کہ جو آدمی بھلائی پائے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جو شخص برائی کرے تو اپنے نفس کو ملامت کرے۔ یہ اس نے اس لیے فرمایا کہ عمل کرنے کے لیے اختیار اس نے دیا ہے۔ اچھے اعمال کرنے پر انعامات کا وعدہ فرمایا ہے۔ اگر آدمی کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا اور وہ یہ عمل نہ کرتا تو اس کو یہ انعامات حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ تو اگر یہ انعامات حاصل ہوئے تو یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے راستے کو کھول دیا ہے۔ زمین پر جو فساد برپا ہوتا ہے، خون ریزی ہوتی ہے، مصائب آتے ہیں تو یہ قوموں کے اعمال کی وجہ سے آتے ہیں: هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (الانعام:۴۷) ''تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا''۔ افراد کے لیے دنیا دارالامتحان ہے۔ ان کو زندگی کے بعد، اعمال کی جزا اور سزا ملے گی۔ یہ اللہ کے دیے ہوئے اختیار کو استعمال کر کے برائی کی راہ پر جانے کا نتیجہ ہے کہ جس کی وجہ سے آدمی کو سزا ملتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ میں نے کیوں ایسا راستہ اختیار کیا۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وشوکت اور اس کی سخاوت اور عطا کے بے پناہ خزانوں کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہر لحاظ سے اس کے محتاج ہیں۔ ہر چیز حتیٰ کہ پانی، اسی کی بدولت ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آتا۔ اگر ہم غور کریں تو دیکھ سکتے ہیں کہ سمندر سے ہوائیں پانی لے کر آتی ہیں۔ وہ پانی آسمانوں سے برستا ہے۔ اس کے بعد وہ ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ آدمی کو پینے کو پانی ملتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک عمل بھی ایسا نہیں ہے جو انسان کے بس اور اختیار میں ہو۔ ہم اگر اس سلسلۂ اسباب کو بھی دیکھیں جس سے غذا ملتی ہے، پانی پہنچتا ہے، پیٹ بھرتا ہے، پیاس بجھتی ہے تو اس سلسلۂ اسباب میں بھی آدمی کے اختیار میں کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ ان کا انتظام کر سکتا ہے لیکن وہ ان کو پیدا نہیں کر سکتا۔ پیدا کرنا تو یہ ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے، آدمی اس کو موجود کرے۔ آپ ذہن میں خیال لے آتے ہیں جو کہیں موجود نہیں ہوتا۔ یہ ایک لحاظ سے تخلیق کے عمل سے مشابہ ہے۔ آپ نے زمین سے کچھ چیزیں لیں، انھی سے کوئی چیز بنائی۔ اسی کے

کسی راز کو آپ نے آشکار کرلیا، مثلاً ایٹم میں کیا طاقت ہے' پانی سے بجلی کس طرح بنتی ہے' کھیتی کن بیجوں سے زیادہ ہوسکتی ہے' کس کھاد سے فصل زیادہ ہوسکتی ہے وغیرہ۔ ان سب کا علم آپ کو دیا گیا ہے۔ علم کی بنیاد پر آپ ان کو استعمال کرتے ہیں۔ اللہ کے خزانے آپ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں اور انسان کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ لیکن انسان ان میں کسی چیز کی تخلیق بھی اپنے طور پر نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (القصص: ۷۱' ۷۲)

''اے نبیؐ! ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک ہمیشہ کے لیے تم پر رات طاری کردے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں روشنی لاکر دے' تم سنتے نہیں؟ ان سے پوچھو! کبھی تم نے سوچا کہ اللہ قیامت تک تمھارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کردے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں رات لاکردے تاکہ تم سکون حاصل کرسکو۔ کیا تمھیں سوجھتا نہیں۔''

قرآن نے اپنے دور کے بادشاہ سے حضرت ابراہیمؑ کا یہ مکالمہ نقل کیا ہے کہ ''حضرت ابراہیمؑ نے کہا: میرا رب تو وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے''۔ تو بادشاہ نے کہا: ''یہ اختیار تو میرے پاس بھی ہے۔ چاہوں تو کسی کی جان بخشی کردوں۔ حکم دوں تو جلاد تلوار سے گردن اڑادے۔'' اگرچہ اس کی دلیل میں کوئی وزن نہ تھا۔ اگر حضرت ابراہیمؑ بحث کرتے تو وہ لمبی ہوجاتی۔ انھوں نے کہا: ''اچھا میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو اس کو مغرب سے نکال کے دکھا۔'' فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ تو انکار کرنے والا حیران رہ گیا کہ کیا جواب دوں۔ ظاہر ہے کہ کائنات کی کوئی بھی قوت انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

اس حدیث کا ایک ٹکڑا اور بھی ہے جسے بعض محدثین نے روایت کیا ہے اور بعض نے نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کا تعلق پورے مضمون سے بہت گہرا ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوتی

ہے کہ: يٰعِبَادِيْ اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَّلِمُوْا۔
”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے اور میں کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اس کو تمھارے درمیان بھی حرام کردیا ہے۔ پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔“

اس پہلے ٹکڑے کا تعلق ساری حدیث سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو خزانے بخشتا ہے یعنی بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے، پیاسے کو پانی پلاتا ہے، بے لباس کو کپڑے دیتا ہے، گناہ گار کی خطائیں معاف فرماتا ہے اور رات دن وہ اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے بخشش کرتا رہتا ہے، اس میں کہیں ظلم کا شائبہ نہیں۔ اگر وہ دیتا ہے تو اپنی حکمت کے تحت دیتا ہے اور رزق روکتا ہے تو اپنی حکمت کے تحت روکتا ہے۔ اگر گناہ معاف فرماتا ہے تو بھی اپنی حکمت اور بخشش و رحمت کی وجہ سے، گناہوں کی سزا دیتا ہے تو اس میں بھی ظلم کا شائبہ نہیں ہوتا۔ قیامت کے روز بھی اللہ تعالیٰ ذرہ بھر ظلم نہیں فرمائے گا۔

غور کریں تو ایک دوسرا تعلق بھی ہے اور وہ یہ کہ بندہ جب دوسرں پر ظلم ڈھاتا ہے تو انھی چیزوں کی وجہ سے ڈھاتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ یہ سب میری مٹھی میں ہیں۔ کھانے پینے کے لیے، دنیا کے مال و دولت کے لیے، عیش و آرام کے لیے، آدمی اپنے حق سے بڑھ کر دوسروں کا حق لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کو ان کے حق سے کم دینا چاہتا ہے۔ یہی ظلم ہے۔ جو اللہ کا حق ہے، وہ بھی ادا کرنا نہیں چاہتا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ حقوق العباد بھی ادا نہیں کرتا۔ اس کو شعور نہیں ہے کہ اس کا اپنے رب سے تعلق کیا ہے اور جن چیزوں کی مدد سے وہ زندگی بسر کر رہا ہے، جو ہوا اس کے جسم میں آ جا رہی ہے، جو غذا اس کی زندگی کی تقویت کا باعث ہے، یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی کو جب یہ پتہ ہے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، ایسی صورت میں بندوں پر ظلم کرنے سے زیادہ بڑی بے حیائی کا کام کیا ہوسکتا ہے۔ اللہ نے تو فرمایا ہے: مجھ سے مانگو، میں تم کو ہدایت بھی دوں گا۔ مجھ سے کھانا، کپڑا، رزق مانگو، سب کچھ دوں گا اور اس کے بعد بھی میرے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کے پاس لینے کے لیے کیوں جاتے ہو جس کے پاس دینے کو کچھ نہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں دے سکتے۔

اللہ نے جہاں بھی اپنے ساتھ تعلق کا ذکر کیا ہے اور بندوں کو یہ بتایا ہے کہ میرے حق

ادا کرو وہاں پر دوسرے بندوں کے حق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر سب انسان ظلم چھوڑ کے حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد بھی ادا کریں تو انسان کی ساری زندگی امن کا گہوارا بن جائے۔ ایک حدیث میں یہ مضمون بڑی طوالت سے بیان ہوا ہے۔ اس پر ہم کو یقین ہونا چاہیے کہ جو لقمہ اندر پہنچا ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے' اس کا ہاتھ ہم کو کھلا رہا ہے۔ اللہ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کی طرح نہیں ہے لیکن اللہ نے اس بات کو کہا ہے کہ اس کا ہاتھ ہے' اس نے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں: وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی "اور جب تم نے پتھر پھینکے تو تم نے نہیں پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے۔" اللہ کا ہاتھ ہی کھلاتا پلاتا ہے' دستگیری کرتا ہے۔ جو اللہ کو اپنے قریب پائے' اس کے بارے میں یقین و احساس رکھے' اس کی نیت میں یہ بات موجود رہے' دستر خوان پر بیٹھا ہو تو ذہن میں ہو کہ اللہ کا ہاتھ ہی کھلاتا پلاتا ہے اور زبان پر ہو: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق ہے۔ صرف زبان سے کلمہ ادا کر لینا تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک حرکی (Dynamic) تعلق ہوتا ہے۔ نفس اور شعور پر چھایا ہوتا ہے۔ دل کے اندر اتر جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ انسان کی آپس میں محبت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو ہر ظلم اور زیادتی سے پاک ہوتا ہے۔

ایک حدیث ہے کہ تم سب لوگ گمراہ ہو سوائے ان کے جن کو میں ہدایت دوں۔ مجھ سے ہدایت مانگو' مجھ سے کھانا مانگو' مجھ سے پانی مانگو' مجھ سے کپڑا مانگو۔ جو کچھ مانگو گے سب کچھ دے دوں گا' اور سب مل کر مانگو گے تو بھی میرے پاس کمی نہیں آئے گی۔ مانگنے میں کمی مت کرو۔ یعنی جو مانگنا ہے مانگو' سب کچھ مل سکتا ہے۔ یہاں نہیں ملے گا تو آخرت میں خوان سجے ہوئے آئیں گے۔ آدمی کہے گا: یہ سب کچھ کیا ہے اور مجھے کہاں سے مل رہا ہے۔ کہا جائے گا' تمھاری دعائیں ہیں جو دنیا میں پوری نہیں ہو سکی تھیں۔ اب یہ سارے تحائف تمھارے لیے موجود ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ کی فیاضی سے فائدہ اٹھایئے۔ اس کے دربار میں حاضر ہوں' اس کی طرف نگاہ رکھیں' اسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ وہ دینے والا ہر وقت دن و رات کی ہر ساعت میں موجود ہے' سن رہا ہے' دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا فقیر' اپنا محتاج' اپنے سے مانگنے والا بنائے اور اپنے بندوں کے ساتھ عدل' انصاف اور شفقت کا معاملہ کرنے والا بنائے۔ (آمین)

شرک سے پاک اللہ کی بندگی

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: بَيْنَا أَنَا رَدِيْفُ النَّبِيِّ ﷺ ، لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ إِلَّا آخِرَةُ الرَّحْلِ، فَقَالَ: يَامُعَاذُ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَامُعَاذُ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ: يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ: لَبَّيْكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ: هَلْ تَدْرِيْ مَاحَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ. قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ، قَالَ: حَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا. ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ : يَامُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ: لَبَّيْكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ: هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ إِذَا فَعَلُوْهُ. قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ، قَالَ: حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمْ.

(بخاری)

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نبی کریمؐ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے آپؐ کے درمیان بیٹھنے کے لیے جو زین ہوتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ یعنی آپؐ سے اتنا قریب تھا کہ میرا جسم آپؐ کے جسم سے لگا ہوا تھا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا: اے معاذ میں نے کہا کہ میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسولؐ اور ساری بھلائی اور نیک بختی کے ساتھ حاضر ہوں اور وہ آپ کے لیے ہے۔ پھر کچھ دیر اور سواری چلتی رہی۔ پھر آپ نے پکارا کہ اے معاذ: میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں حاضر ہوں۔ دو دفعہ جواب دیا کہ میں حاضر ہوں اور ساری بھلائیوں اور نیک بختیوں کے ساتھ حاضر ہوں جو آپ کے لیے ہیں۔ پھر سواری کچھ دور اور آگے بڑھ گئی۔ یعنی کچھ لمحات' چند گھڑی آپؐ کی سواری چلتی رہی۔ پھر آپؐ نے تیسری دفعہ پکارا: اے معاذ میں نے جواب دیا کہ میں حاضر ہوں یا رسول اللہؐ میں حاضر ہوں اور

ساری بھلائی اور نیک بختی آپؐ کے لیے ہے۔اسی کے ساتھ حاضر ہوں۔آپؐ نے فرمایا: کیا تمھیں پتہ ہے کہ اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کریں' اس کی عبادت کریں' اور کسی چیز کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔پھر آپ کچھ دور چند لحات چلتے رہے۔پھر آپؐ نے فرمایا کہ اے معاذ بن جبل۔میں نے پھر کہا کہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں۔تو آپؐ نے فرمایا: تمھیں یہ بھی پتہ ہے کہ بندوں کا اللہ کے اوپر کیا حق ہے اگر وہ اللہ کا حق ادا کریں۔اور صرف اسی ایک کی بندگی کریں۔کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کریں۔میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔آپؐ نے فرمایا اللہ کے اوپر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ پھر ان کو عذاب نہ دے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا اصل مقصد یہ ہے کہ بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح طریقے سے قائم ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں مخلوق اپنے خالق سے صحیح طریقے سے جڑ جائے۔ سارے دین اور شریعت کی بنیاد یہی تعلق ہے۔ اگر یہ تعلق درست ہو جائے تو پھر اخلاق اور اعمال' سیاست اور معیشت سب درست ہو سکتے ہیں۔ کامیابی کے سارے وعدے بھی اسی کے ساتھ مشروط ہیں۔ نبی کریمؐ نے اس بات کی تعلیم دی کہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرنا چاہیے۔ پھر آپؐ نے یہ تعلیم بھی دی کہ نفع و نقصان کا مالک صرف وہی ہے۔ مانگنا ہے تو اس سے مانگو۔ سوال کرنا ہے تو اس سے سوال کرو۔ مدد چاہیے تو اسی سے طلب کرو۔ اس کے چاہے بغیر کوئی کچھ دے نہیں سکتا اور اس کے چاہے بغیر کوئی کچھ چھین نہیں سکتا۔ پھر آپ نے اس کو اور پھیلایا کہ اللہ تعالیٰ تو ایسی ذات ہے جس کا احاطہ آدمی نہیں کر سکتا۔ آپ نے یہ بتا کر اس کو بالکل انسان سے قریب کر دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم بھوکے ہوتے ہو تو میں کھانا کھلاتا ہوں' پیاسے ہوتے ہو تو میں پانی پلاتا ہوں' بے لباس ہوتے ہو تو میں کپڑا پہناتا ہوں' بیمار ہوتے ہو تو میں شفا بخشتا ہوں۔ اور جو بھی تمھاری ضرورت ہے' وہ سب بھی میں دے دوں تو میرے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ تو اپنے اعمال کی فکر کرو' میرے ساتھ اپنا تعلق درست رکھو۔ گناہ بھی ہوں گے تو میں معاف کر دوں گا۔

ایک حدیث میں ان ساری تعلیمات کا خلاصہ آ گیا ہے۔اس حدیث کے راوی حضرت معاذ بن جبلؓ ہیں جو ایک بہت مشہور انصاری صحابی ہیں اور ان سے بے شمار روایات

احادیث کے مجموعوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نبی کریمؐ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے آپؐ کے درمیان بیٹھنے کے لیے جو زین ہوتی ہے' اس کے علاوہ اور کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ یعنی آپؐ سے اتنا قریب تھا کہ میرا جسم آپؐ کے جسم سے لگا ہوا تھا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا: اے معاذ! میں نے کہا کہ میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسولؐ اور ساری بھلائی اور نیک بختی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اور وہ آپ کے لیے ہے۔ پھر کچھ دیر اور سواری چلتی رہی۔ پھر آپ نے پکارا کہ اے معاذ! میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں حاضر ہوں۔ دو دفعہ جواب دیا کہ میں حاضر ہوں اور ساری بھلائیوں اور نیک بختیوں کے ساتھ حاضر ہوں جو آپ کے لیے ہیں۔ پھر سواری کچھ دور اور آگے بڑھ گئی۔ یعنی کچھ لمحات' چند گھڑی آپؐ کی سواری چلتی رہی۔ پھر آپؐ نے تیسری دفعہ پکارا: اے معاذ! میں نے جواب دیا کہ میں حاضر ہوں یا رسول اللہؐ میں حاضر ہوں اور ساری بھلائی اور نیک بختی آپؐ کے لیے ہے۔ اسی کے ساتھ حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمھیں پتہ ہے کہ اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کریں' اس کی عبادت کریں' اور کسی چیز کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ پھر آپ کچھ دور چند لمحات چلتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اے معاذ بن جبل! میں نے پھر کہا کہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ تو آپؐ نے فرمایا: کیا تمھیں یہ بھی پتہ ہے کہ بندوں کا اللہ کے اوپر کیا حق ہے اگر وہ اللہ کا حق ادا کریں۔ اور صرف اسی ایک کی بندگی کریں۔ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کریں۔ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ اللہ کے اوپر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ پھر ان کو عذاب نہ دے۔

یہ حدیث امام بخاریؒ نے مختلف ابواب میں سات جگہ نقل کی ہے۔ کتاب التوحید، اللہ کی راہ میں کوشش کرنے اور سواری پر کسی کے پیچھے سوار ہونے کے باب میں بھی کی ہے۔ چونکہ نبی کریمؐ اور حضرت معاذؓ جس گدھے پر سوار تھے اس کا نام تھا 'وخیر' تو انھوں نے یہ کہا ہے کہ جانور کا نام رکھنا حدیث کی رو سے جائز ہے۔ مختلف جگہ انھوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم میں بھی یہ روایت کی گئی ہے۔ ترمذی میں بھی ہے اور تھوڑے بہت الفاظ کے فرق

کے ساتھ یہ مسند احمد بن حنبل میں بھی روایت کی گئی ہے۔ اس کے اندر بظاہر تو ایسی کوئی نئی بات نہیں ہے جو پہلے سے ہم جانتے اور مانتے نہ ہوں لیکن اس کے چند پہلو ایسے ہیں کہ جن کی تذکیر اور یاد دہانی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے تعلق کے مختلف پہلوؤں کا علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

سب سے پہلے جو چیز قابل غور ہے' وہ طریق تعلیم اور صحابہؓ کا نبی کریمؐ کے ساتھ قرب اور آپؐ سے نزدیک ہونا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ: اے غلام' اللہ کی عیادت کر' اللہ تیری عیادت کرے گا۔ اس میں بھی یہی الفاظ تھے کہ میں آپؐ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور یہاں تو انھوں نے اور تفصیل میں جا کر کہا ہے کہ انا ردیف النبی میرے اور آپؐ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی' سوائے اس کجاوے کے جو جانور کی پیٹھ پر کسا جاتا ہے اور جس پر سوار بیٹھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ نبی کریمؐ نے اچانک کوئی لمبی چوڑی تقریر شروع نہیں کر دی۔ بلکہ آپؐ نے اپنے ساتھی کے ذہن اور توجہ کو مرکوز کرنے کے لیے تین دفعہ خطاب کیا' اے معاذ' اے معاذ' اے معاذ۔ دوسری حدیث میں مختصراً صرف اتنا ہے کہ تین دفعہ آپؐ نے یہ کہا' جب کہ اس حدیث میں تین دفعہ کا الگ الگ ذکر ہے۔ پہلی دفعہ کہہ کر' حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ سواری تھوڑی دیر تک چلتی رہی۔ پھر آپؐ متوجہ ہوئے اور کہا اے معاذ! پھر سواری چلتی رہی' پھر آپؐ متوجہ ہوئے۔ پھر آپؐ نے کہا: اے معاذ! پھر سواری چلتی رہی۔ پھر آپؐ نے کہا کہ کیا تم یہ جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے۔ ایک تو آپؐ کا طریق تعلیم دیکھیں۔ اس میں مخاطب کی توجہ اپنی طرف کھینچنا اور بات کو اس کے دل میں اتارنا ایک اہمیت رکھتا ہے۔ نبی کریمؐ کے طریق تعلیم کی یہ خصوصیت صحابہ کرامؓ نے بیان فرمائی ہے کہ آپؐ بات کو اس طرح فرماتے تھے کہ ہر لفظ الگ الگ سمجھ میں آتا۔ اور کہیں ایسا نہ ہوتا تھا کہ آپؐ تیزی میں' خوشی میں بولتے چلے جائیں۔ ویسے احادیث میں آپؐ کی تقریروں کے حوالے سے یہ روایات ملتی ہیں کہ جب آپؐ بہت جذبات میں آ کر بولتے تھے تو آپؐ کی گردن کی رگیں تن جاتی تھیں' چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ لیکن تعلیم کے وقت ایسا نہ ہوتا تھا۔ یہ بھی احادیث میں ہے کہ آپؐ ایک بات کو تین تین دفعہ دہرایا کرتے تھے' تاکہ سننے

والے اچھی طرح سن لیں، یاد کرنے والے اچھی طرح یاد کرلیں، محفوظ کرنے والے اچھی طرح محفوظ کرلیں اور ان کے دلوں میں بات اتر جائے۔ نبی کریمؐ کا یہی طریق تعلیم ہم کو یہاں نظر آتا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان کے صحابیؓ نے اس پورے عمل کو بیان کرنا ضروری سمجھا۔ ورنہ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضورؐ نے مجھ سے پوچھا کہ بندوں کے اوپر اللہ کا حق کیا ہے اور بتایا کہ یہ ہے کہ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور پھر پوچھا کہ اللہ کے اوپر بندوں کا حق کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ بھی اللہ اور آپؐ بہتر جانتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے۔ لیکن صحابہ کرامؓ کو بھی پورے واقعے کی چھوٹی چھوٹی تفصیل بیان کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ حدیثیں گھڑی ہوئی نہیں ہوسکتیں۔ کوئی شخص حدیث گھڑے گا تو اس طریقے سے اس تفصیل میں نہیں جائے گا۔ کسی گھڑی ہوئی عبارت میں واقعہ اتنی تفصیل سے بیان نہیں ہوتا۔ اس بات سے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ یہ احادیث یقیناً صحابہ کرامؓ سے روایت کی گئی ہیں، اس لیے کہ راویوں نے بعض چھوٹی چھوٹی بظاہر غیر اہم تفصیلات بھی محفوظ کی ہیں۔ مثلاً مصافحے والی مشہور حدیث میں راوی کا بیان ہے کہ میں نے حضورؐ سے مصافحہ کیا تو میں نے دیکھا کہ آپ کا ہاتھ مخمل کی طرح ملائم تھا۔ اور میرے ہاتھ میں ان سے خوشبو آ گئی۔ انھوں نے جس اگلے راوی سے اس روایت کو بیان کیا، انھوں نے کہا کہ اچھا آپ نے ان ہاتھوں سے نبی کریمؐ سے مصافحہ کیا؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ انھوں نے کہا: میں بھی آپ سے مصافحہ کروں گا تا کہ میرے مصافحے کی نسبت بھی حضوؐر تک پہنچ جائے۔ اور آج چودہ سو سال کے بعد بھی وہ راوی موجود ہیں جن کے مصافحے کی نسبت اسی طرح حضوؐر تک پہنچتی ہے۔ ان راوی سے جو سلسلے چلتے ہیں، جب انھوں نے اس واقعے کو بیان کیا تو ہر سننے والے نے کہا: اچھا میں بھی آپ سے مصافحہ کرلوں تا کہ میرے مصافحے کی نسبت بھی حضوؐر تک پہنچ جائے۔ لوگوں کے تعلق کی یہ نوعیت تھی۔ یہ ایک ایک بات کو محفوظ رکھتے تھے اور اسے بتاتے تھے۔ حدیث کے اندر حکمت و دانائی کا اور دین کی تعلیم کا اور دین کی تفصیل کا سارا ذخیرہ اسی لیے آتا ہے۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بڑی واضح اور صاف ہے، لیکن نبی کریمؐ نے اس انداز میں بیان فرمایا ہے کہ یہ اللہ کا بندوں پر حق ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کریں۔ اس

کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اور ساتھ ہی عذاب کے بارے میں بھی فرمایا کہ یہ بندوں کا اللہ پر حق ہے کہ اگر بندے اس کی بندگی میں شرک نہ کریں تو پھر وہ ان کو عذاب نہ دے۔ ان دونوں باتوں پر ہم الگ الگ غور کریں گے۔ اس لیے کہ یہ بڑی اہم باتیں ہیں۔ بظاہر تو بڑی عام باتیں ہیں لیکن ان کی بڑی اہمیت اس لیے ہے کہ انہی پر سارے دین کا مدار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو یہی پیغام دے کر بھیجا کہ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ٥ (النحل: ۲) ''آگاہ کر دو' میرے سوا کوئی تمھارا معبود نہیں' اس لیے تم مجھ سے ڈرو۔'' جو رسول بھی ہم نے بھیجا' وہ کسی زمانے میں آیا' کسی قوم میں آیا' ہندستان میں آیا' یورپ میں آیا' یا چین میں آیا' جاپان میں آیا' شریعت کی' نماز کی' روزے کی' زکوٰۃ کی تفصیل کچھ بھی ہو' لیکن سب کو ہم نے ایک بنیادی پیغام دے کر بھیجا: اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ٥ اس سے آگاہ کر دو' لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے' کوئی معبود نہیں ہے۔ تم کو چاہیے کہ صرف میری بندگی کرو' کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ انبیائے کرامؑ کی دعوت تھی: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ٥ (الاعراف: ۵۹) ''اے قوم! اللہ کی بندگی کرو' اس کے علاوہ تمھارا کوئی الٰہ نہیں۔'' یہ بندگی ایسی عبادت ہے جس میں کوئی شریک نہ ہو۔

یہ بات سارے دین کی بنیاد اور اس کا خلاصہ ہے۔ یہ بات ہم اور آپ سب جانتے ہیں۔ لیکن اس کو ہم پوری طرح سمجھتے نہیں ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب نبی کریمؐ مکہ مکرمہ میں ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دے رہے تھے' یا اس سے پہلے جتنے انبیائے کرامؑ نے ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دی' ان کے مخالفین میں سے کوئی بھی اس بات سے منکر نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ ہے اور وہی سب سے بڑا معبود اور الٰہ ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ قرآن مجید میں تو کفار قریش سے باقاعدہ مکالمے نقل کیے گئے ہیں: ان سے پوچھو! آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ کہیں گے' اللہ نے۔ مردے سے زندے کو' زندے سے مردے کو کون نکالتا ہے؟ کہیں گے اللہ۔ کون کائنات میں تدبیر کرتا ہے؟ اللہ کرتا ہے۔ آسمان سے بارش کون برساتا ہے؟ اللہ تعالیٰ برساتا ہے۔ اس سے ابوجہل کو' ابولہب کو' تین سو سے زائد بتوں کی پرستش کرنے والوں کو' کسی کو اس سے اختلاف نہیں تھا کہ خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے'

رزق دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے، پانی بھی وہ اتارتا ہے، تدبیر بھی اس کی چلتی ہے۔ ایسے ہر سوال کا جواب یہی ملے گا: اَللّٰہُ۔ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ۔ ’’پس وہ کہیں گے اللہ۔‘‘

یہ سوال بڑا اہم بن جاتا ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ خالق تو اللہ تعالیٰ ہے اور مالک تو اللہ تعالیٰ ہے اور رزق دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور نفع و نقصان پہنچانے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے باوجود نبی کریمؐ کی یہ دعوت اپنی قوم کو تھی۔ اس سے پہلے سارے انبیا کی رہی۔ آپؐ نے سب سے یہی مطالبہ کیا اور اسی پر ساری لڑائی اور ناراضی تھی۔ نبی کریمؐ کا ابوجہل سے ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں صرف ایک بات چاہتا ہوں۔ تم وہ مان لو ہماری تمھاری لڑائی ختم ہو جائے گی۔ وہ بہت خوش ہوا کہ پتہ نہیں کون سی بات ہے، جس سے سارے جھگڑے نبٹ جائیں گے۔ آپؐ نے کہا کہ اس بات کو مان لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں۔ وہ اس پر بہت ہی غصہ ہوا۔ یہ اس کا بلکہ سارے کفار قریش کا قول ہے جو قرآن نے نقل کیا ہے: کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود سمجھا ہے۔ وہ یہی الٰہ ہوگا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہستی معبود ہے اور کوئی اس لائق نہیں ہے کہ اس کی شریک ہو، اس کی ذات میں شریک ہو، اس کے اختیارات میں شریک ہو اور مختلف چیزوں میں شریک ہو۔

شرک کی قسمیں تو بہت ساری ہیں اور کتابوں کے اندر سب بیان بھی ہوئی ہیں۔ اگر تین چار باتیں ہماری سمجھ میں آجائیں تو ہم اس بات سے محفوظ رہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے اعمال میں اور بندگی میں کسی کو شریک کریں۔ اللہ کی بندگی سب کرتے تھے۔ کفار قریش بھی کرتے تھے۔ نماز بھی پڑھتے تھے۔ حج بھی کرتے تھے۔ اللہ کی راہ میں خرچ بھی کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی کام ایسا نہیں تھا جس سے ان کو انکار ہو۔ ان میں سے بعض کرتے تھے، بعض نہیں کرتے تھے۔ اور آج بھی یہی ہے کہ بعض مسلمان کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے۔ لیکن اصل بات جس پر جھگڑا اور اختلاف تھا، وہ یہ تھا کہ کیا صرف ایک اللہ ہی پرستش اور بندگی کا مستحق ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی مستحق ہے۔ لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ جب قرآن مجید یہ کہتا ہے: مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ تو اس کے معنی کیا ہیں۔ لوگ اس پر برافروختہ بھی ہوتے تھے،

ناراض بھی ہوتے تھے۔ آج بھی لوگ جانتے بوجھتے یا بغیر جانے بوجھے شرک کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں اور اس سے اپنے آپ کو نہیں بچا پاتے۔ اس لیے اس بات کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمادیا کہ صرف میری بندگی کرو' اس بندگی میں کسی کو شریک نہ کرو تو اس کا کیا مطلب ہے؟

دنیا کے اندر ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اللہ کی ذات میں کسی کو شریک کریں اور یہ کہیں کہ ایک اللہ اور بھی ہے۔ عیسائی اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تین وجود ہیں۔ (۱) باپ (۲) بیٹا (۳) روح القدس۔ یہ ان کا بڑا صاف شرک ہے۔ لیکن اگر آپ کسی عیسائی سے بات کریں اور اس سے کہیں کہ تم مشرک ہو تو وہ سخت ناراض ہوگا۔ اس نے بھی اپنے عقیدے کی تعبیر ایسی کر رکھی ہے جس میں وہ اس کو توحید ہی کا مظہر سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تو ایک ہی ہے۔ یہ اس کے تین ظہور ہیں جو کائنات میں مختلف انداز میں ہوتے ہیں۔ بحیثیت باپ' محبت' رحمت' شفقت کے لیے ہوا ہے۔ کہیں انصاف کرنے کے لیے' ہدایت دینے کے لیے حضرت عیسیٰؑ کے روپ میں ہوا ہے اور کہیں مسلسل لوگوں کی رہنمائی کرنے کے لیے روح القدس کی صورت میں ہوا ہے۔ لیکن کوئی عیسائی یہ نہیں کہے گا کہ میں شرک کرتا ہوں۔ اگر آپ کہیں گے تو وہ آپ سے ناراض ہوگا' آپ سے لڑے گا اور آپ سے غصہ کرے گا کہ مجھے تم مشرک کیوں کہتے ہو جب کہ میں تو اللہ کو ایک مانتا ہوں۔ میں تو موحد ہوں۔ عیسائی مسلمانوں سے یورپ میں جب مکالمے کرتے ہیں تو اسی بنیاد پر کرتے ہیں کہ ہم تینوں اللہ کو ایک ماننے والے ہیں۔ مسلمان بھی ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ یہودی بھی ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ عیسائی بھی ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ اور یہی ہمارے درمیان قدر مشترک ہے تو اس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ وہ غلط ہیں' اس لیے کہ یہ بات تو ظاہر اور صاف ہے۔ اس پر گفتگو ہوسکتی ہے۔ بحث یہ ہے کہ لوگ شرک کرتے ہوئے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم توحید پر قائم ہیں۔ عیسائی دنیا کی ایک تہائی آبادی ہیں۔ وہ شرک کرتے ہیں لیکن سمجھتے ہیں ہم توحید پر قائم ہیں۔ اگر آپ ہندو فلسفیوں کے پاس چلے جائیں جو بڑے پڑھے لکھے لوگ ہیں تو وہ شرک سے صاف اعلان برأت کرتے ہیں کہ ہم پتھر کے بتوں کو نہیں پوجتے۔ یہ

تو اللہ تعالیٰ کی صفات کی صرف علامت اور نشانی ہے۔ کہیں وہ دولت دیتا ہے تو اس کا ایک بت بن گیا ہے۔ کہیں اس کی قدرت ہے' اس کے آٹھ دس ہاتھ ہیں تو دوسرا بت بن گیا ہے۔ یہ تو ہم نے علامتیں بنالی ہیں۔ اس کی نشانیاں ہیں لیکن ہم ان کی پرستش نہیں کرتے۔ پرستش تو ہم صرف خدائے واحد کی کرتے ہیں۔ یہودیوں اور ہندوؤں کے وید میں فلسفے ہیں۔ یہ میں آپ کو اس لیے نہیں بتا رہا ہوں کہ عیسائی ٹھیک ہیں' ہندو ٹھیک ہیں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ دنیا کے اندر ایسی قومیں موجود ہیں جو صاف صاف اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ نہیں' ہم شرک نہیں کرتے ہم موحد ہیں' ہم ایک خدا کو مانتے ہیں' لیکن قرآن مجید کی' حدیث کی ہر تعلیم کی رو سے وہ مشرک ہیں۔ ہمارا بھی تو وہی حال نہیں ہے۔ ہم کو سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا جو حق مختصراً بیان کر دیا: اَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ''اللہ کی بندگی کریں اور اس عبادت میں کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔'' اس کا کیا مطلب ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ الٰہ اور رب کے معنی بھی ہم عام طور سے نہیں جانتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں پر آدمی جا کر سجدہ کرے اور رکوع کرے اور مرادیں مانگے بس وہی رب اور الٰہ ہے۔ جو بہت آگے بڑھتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ بس یہی بندگی ہے۔ اس پر شرک کا فتویٰ لے کر آتے ہیں کہ مزاروں پر جا کر یہ کچھ کیا جاتا ہے۔ اس سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو بھی اللہ کے علاوہ کسی کو وفاداری' محبت' پرستش' اطاعت اور طاقت کا ایسا سرچشمہ مانے کہ وہ اللہ کے ساتھ اس کے اختیارات میں شریک ہے یا اس سے الگ بھی کوئی چیز اس کے پاس موجود ہے تو یہی شرک ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس لحاظ سے انسان خود اپنا بھی معبود بن جاتا ہے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ط (الفرقان: ۴۳) ''کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ اور معبود بنا لیا؟'' تو یہ نہیں کہ معبود صرف پتھر کا یا سونے کا یا چاندی کا یا درخت یا چاند اور سورج ہی ہوتے ہیں یا وہ قبریں ہوتی ہیں' بلکہ جب آدمی خود اپنا ایسا شیفتہ و فریفتہ ہو جائے کہ اپنی خواہش کو اللہ کے احکام پر ترجیح دے' اس کے ساتھ وفاداری' اس کی دل ربائی' اس کے ساتھ محبت اللہ سے بڑھ کر ہو جائے' وفاداری اور پرستش

کا مرکز اپنا نفس اور اپنی ذات ہوجائے تو وہ بھی الٰہ ہے۔ قرآن مجید نے عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں فرمایا ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ''انھوں نے اپنے علما اور دینی رہنماؤں کو (رہبان تو خانقاہ میں بیٹھنے والے صوفی سمجھئے اور احبار علما ہیں) اللہ کے علاوہ اپنا رب بنالیا ہے۔

عدی بن حاتمؓ کی ایک حدیث سے آپ واقف ہوں گے۔ وہ حاتم طائی کے لڑکے تھے۔ عیسائی تھے۔ قبیلہ طے کے سردار تھے۔ وہ ایمان لاکر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہت طویل حدیث ہے جس میں آتا ہے: اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ، آگ سے بچو اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دے کر سہی۔ اسی حدیث کا ایک حصہ ہے۔ انھوں نے نبی کریمؐ سے پوچھا کہ یہ آیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم ان کو سجدہ کرتے ہیں، نہ ان کو رکوع کرتے ہیں، نہ ان کی بندگی کرتے ہیں، نہ ان کی پرستش کرتے ہیں، نہ منتیں مانتے ہیں۔ پھر قرآن نے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہم نے ان کو اپنا رب بنالیا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ جس چیز کو حلال کردیں، تم آنکھیں بند کر کے اس کو حلال مان لیتے ہو اور جس چیز کو وہ حرام کردیں، تم آنکھیں بند کر کے اسے حرام مان لیتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ایسا تو ہے۔ ہم نے تو پورا دین حرام اور حلال ان کے حوالے کر رکھا ہے۔ آپؐ نے کہا کہ یہی تو ان کو رب بنانا ہے۔ اس لیے کہ یہ حق تو اللہ کا ہے کہ آدمی بلا چون و چرا آنکھیں بند کر کے اس کا بتایا ہوا حلال و حرام مان لے۔ یہ اختیار نہ کسی ریاست کا ہے اور نہ کسی فرد کا ہے، نہ کسی پارلیمنٹ کا ہے، نہ کسی عالم کا ہے، نہ کسی صوفی کا ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کا حلال حرام اللہ کے حلال حرام سے الگ یا اس سے بالا یا اس سے ماورا یا اس سے علیحدہ ہو۔ قرآن نے جانوروں کے کھانے پینے کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیے جائیں تو مت کھاؤ، بتوں کے نام پر ذبح کیے جائیں تو مت کھاؤ۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ شیطان اور دوسرے لوگ تمھارے دل میں وسوسے ڈال دیں گے کہ جانوروں کے کھانے میں کیا ہے۔ فرمایا کہ اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو پھر تم مشرک ہوجاؤ گے۔ یعنی وہ جانور کھانا جو بت کے نام پر چڑھایا گیا ہے، یہ بھی شرک ہے۔ جو اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا گیا، اس کا کھانا بھی شرک ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ احکام

میں اطاعت بھی شرک ہے۔ نفع ونقصان کی امید اللہ کے علاوہ کسی سے باندھنا بھی شرک ہے۔ لیکن اگر آپ کسی ڈاکٹر سے دوا لیتے ہیں تو یہ اس میں شامل نہیں ہے۔ دنیا کے کسی اور کام کے لیے آپ بھاگ دوڑ کرتے ہیں تو یہ بھی نفع و نقصان کی امید باندھنے میں شامل نہیں ہے۔ ہمارے بعض صوفیائے کرامؒ نے اس کو اتنا آگے پہنچادیا ہے جہاں عام انسان کے بس کی بات نہیں رہتی۔ مثلاً ایک صوفی کے مکاشفے میں ایک بزرگ (واقعہ نہیں مکاشفہ ہے) اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اللہ نے پوچھا: آج کیا لائے ہو؟ انھوں نے کہا: بس ایک ہی چیز لایا ہوں۔ کبھی کسی کو تیرے ساتھ شریک نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اچھا تم دودھ والی بات بھول گئے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا: دودھ والی بات کیا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا: تم نے کہا تھا کہ میں نے دودھ پی لیا ہے' اس وجہ سے میرے پیٹ میں درد ہوگیا ہے' حالانکہ ہر چیز تو اللہ کے چاہنے سے اور اللہ کے کہنے سے ہوتی ہے۔ اس طرح کی بات جذبات اور تربیت کے لیے تو اچھی بات ہوسکتی ہے لیکن توحید اور شرک کی حدود میں اس طرح کی بات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس میں غلو ہے۔ اس لیے کہ کوئی آدمی بھی اپنی زبان کو اتنا پاک نہیں کرسکتا کہ اس کی زبان سے یہ نہ نکلے: گرمی میں چلا تو لو لگ گئی اور میں نے کھانا کھالیا تو میرے پیٹ میں درد ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی نفع ونقصان اس کے اندر رکھا ہے۔ لیکن جو آدمی یہ سمجھے کہ یہ نفع ونقصان اللہ کے علاوہ بھی کوئی پہنچا سکتا ہے' اللہ سے ماورا پہنچا سکتا ہے' اللہ کے اختیارات میں شریک ہے' تو یہ وہ مقام ہے جہاں شرک پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح خوف کا معاملہ ہے۔ ایک انسان کا فطری خوف ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپ بن گیا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹے۔ پیغمبر تھے' نبی تھے' اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے تھے۔ ان کا بڑا اونچا مقام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا ہے کہ میں نے تجھ کو اپنی ذات کے لیے چن لیا' تربیت دی' لیکن بہر حال وہ انسان تھے۔ انھوں نے دیکھا لکڑی اچانک سانپ بن گئی تو فطری خوف ان پر طاری ہوا۔ وہ پیچھے ہٹے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: لاتخف۔ نہ ڈرو' آگے آؤ' اس کو ہاتھ میں لو۔ خوف اللہ تعالیٰ کی تسلی سے دور ہوگیا۔ اس میں غلو کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بہر حال ظاہر ہے کہ نفع و نقصان اللہ کی طرف سے ہے۔

ذات کے اندر شرک تو امت کے اندر شاذو نادر ہی پایا جاتا ہے۔ بلکہ تقریباً پایا ہی نہیں جاتا لیکن صفات میں شرک اور بندگی میں شرک پایا جاتا ہے۔ عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے خالص اور مخصوص ہونی چاہیے۔ پرستش اللہ کے لیے ہو اور سجدہ اللہ کے آگے ہو۔ نذر آدمی اس کے نام پر مانے' منتیں اس کے آگے مانے' اسی کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو۔ اپنی محبت کے اظہار کے لیے آدمی جو طریقے بھی جانتا ہو وہ اللہ کے لیے مخصوص ہوں۔ اپنی شیفتگی اور وفاداری کا مرکز اسی کو رکھے۔ اختیار سارا اس کے پاس سمجھے۔ اختیار اس حد تک اس کے پاس ہے کہ بعض صحابہؓ نے کبھی کہا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَاشَاءَ مُحَمَّدٌ (جو اللہ چاہے اور جو محمد چاہیں) تو نبی کریمؐ نے اس سے منع فرمایا۔ آپؐ نے کہا: یہ بات مت کہو۔ جو اللہ چاہتا ہے بس وہی ہوتا ہے۔

سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے بڑی اچھی تمثیل اور واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ آج کے دور کے بالکل حسب حال ہے۔ دو آدمی تھے۔ ایک آدمی کا بڑا عمدہ باغ تھا' بڑا سرسبز' اور بڑا زرخیز۔ اتنا زرخیز باغ تھا کہ درختوں کے بیچ میں بھی پودے لگے ہوئے تھے۔ جیسے دو درختوں کے بیچ میں آدمی چلغوزہ لگا دیتا ہے۔ صرف فصل ہی نہیں ضمنی فصل بھی موجود تھی۔ اور اس کے اندر پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ اس فصل کے باقی رہ جانے کے انتظامات بھی وہاں موجود تھے۔ اُس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ اِس آدمی نے اُس سے کہا کہ یہ تو میرے اپنے زور بازو کا نتیجہ ہے۔ یہ میں نے خود اپنے ہاتھ سے' اپنی سائنس سے' اپنی ٹکنالوجی سے' اپنے علم سے خود کیا ہے اور یہ اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔ یہ تو ہمیشہ رہے گا۔ اس آدمی نے کہا کہ ماشاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ۔ تو نے شرک کیا۔ تجھ کو یہ کہنا چاہیے تھا' جو اللہ نے چاہا وہی ملا اور کسی کے پاس اللہ کے علاوہ کوئی قوت نہیں ہے۔

عہد جدید کا شرک تو یہی ہے کہ ہر چیز کو مادی اسباب میں تلاش کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مادی اسباب پر نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔ نہیں' دیکھنا چاہیے۔ لیکن اسی کو کُل سمجھ لینا کہ جو کچھ ہوتا ہے' انھیں کی وجہ سے ہوتا ہے اور آدمی نے جو کچھ کیا' اپنے زرخیز ذہن کی وجہ سے کیا اور یہ ترقی ہوئی اور ہوتی رہے گی' یہ شرک ہے۔ جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے' وہ جانتے

ہیں کہ ۱۹۱۴ کی جنگ سے پہلے یورپ کے سارے فلاسفر اور سیاست دان اور علما اس بات کے قائل تھے کہ انسان یہ ترقی ایسی کر رہا ہے جو مسلسل جاری رہے گی۔ جس کو انگریزی میں linear progress کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک لائن میں ترقی بڑھتی جائے گی، گھٹے گی نہیں۔ لیکن پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے قصے میں کہا ہے کہ اچانک ایک طوفان آیا، اور ساری کھیتی اوندھی ہو کر رہ گئی، سب کی جڑ کٹ گئی، اسی طرح دوسری جنگ عظیم کا طوفان آیا اور ڈھائی کروڑ آدمی مر گئے۔ پورا یورپ تخت و تاراج ہو گیا۔

یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ لڑائی کس لیے ہوئی۔ بعد میں بڑی تحقیق ہوئی، سیاستدانوں کے کاغذات نکال کر دیکھے گئے۔ معلوم ہوا کہ کوئی شخص لڑائی نہیں چاہتا تھا۔ کوئی حکمران، کوئی بادشاہ، کوئی وزیر اعظم کوئی بھی لڑائی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن چار و ناچار لڑائی کی طرف دھکیل دیے گئے۔ اس کے بعد یورپ کے سارے فلسفے بدل گئے۔ نقطۂ نظر بدل گئے۔ لوگ مایوس ہو گئے۔ انسان سے مایوس ہو گئے۔ نئے نئے فلسفے ایجاد ہوئے۔ لیکن یہ بالکل وہی قوت ہے، ماشاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ۔ اب بھی انسان اس گھمنڈ میں آتا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی سب کچھ کر سکتی ہے۔ چاند تک بھی پہنچا سکتی ہے۔ ستاروں کے اندر بھی پہنچا سکتی ہے۔ آدمی جو کام چاہے کر سکتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے حکم سے ہی انجام دیتی ہے۔ حکم نہ ہو تو ہر چیز بے کار ہو جاتی ہے۔ چاند پر جانے والا سیارہ زمین پر کھڑے جل سکتا ہے، بھک سے اڑ سکتا ہے۔ اس کا کمپیوٹر، اس کا علم، اس کی احتیاطیں سب ناکام ہو سکتی ہیں۔ ٹارنیڈو آتا ہے تو بڑی بڑی احتیاطوں کے سوا کہ عمارات خالی کرالیں، آبادیاں خالی کرالیں۔ انسان کے پاس کوئی دوسرا علاج نہیں ہوتا۔ اگر آج سان فرانسسکو اور ٹوکیو میں زلزلہ آجائے تو انسان کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہے کہ پورا کا پورا شہر درہم برہم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ اسی بات کو فرماتا ہے کہ میری عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو، اختیارات سارے میرے ہیں، کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ نفع و نقصان کی امید

صرف مجھ سے باندھو۔ پرستش کے جتنے بھی مظاہر ہیں' مانگنا اور ہاتھ پھیلانا اور منتیں مانگنا اور سجدہ کرنا اور عبادت کرنا' یہ سب بھی صرف میرے لیے ہونے چاہییں۔ اور اطاعت بھی سب سے بڑھ کر میری ہو۔ یہ نہیں کہ کسی اور کا کہنا نہ مانو۔ والدین کا کہنا مانو' حکمرانوں کا کہنا مانو لیکن یہ سب اطاعت میری اطاعت کے تابع ہونا چاہیے۔ حکمران اعلیٰ صرف میں ہوں۔ یہ عبادت کے چند پہلوؤں کے معنی ہیں' ورنہ شرک پر تو بڑی طویل گفتگو ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس بات کو کہا ہے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ کس نے آسمان سے پانی اتارا؟ کس نے زمین سے خوشنما پودے اگائے؟ ءَ اِلٰـہٌ مَّعَ اللّٰہِ۔ ''کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ بھی ہے؟'' کس نے زمین کو اس قابل بنایا کہ تم اس میں زندگی بسر کرسکو۔ اتنے نازک ترازو پر زمین کا میزان قائم ہے کہ جو لوگ سائنس نہیں جانتے' وہ تصور نہیں کرسکتے کہ کس طرح چند درجۂ حرارت کے ساتھ انسان کی زندگی کی بقا وابستہ ہے۔ برف اتنا ہی بھاری ہوتا جتنا پانی' تو سارا پانی جم جاتا اور مچھلیاں مرجاتیں۔ ایک ایک ماشے' ایک ایک رتی کے چھوٹے چھوٹے فرق کے اوپر اللہ نے انسان کی زندگی کو قائم کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کے نیچے پانی کا انتظام کیا۔ میٹھا پانی پلایا۔ سمندر سے ہوائیں آتی ہیں۔ آپ اگر کوئی پانی صاف کرنے کا کارخانہ لگائیں تو اربوں ڈالر خرچ کریں گے۔ سورج نکلتا ہے۔ کھارا پانی صاف ہوجاتا ہے۔ آپ پانی پہنچانا چاہیں گے تو آپ نہریں کھودیں گے' پائپ لائنیں ڈالیں گے' تخمینے لگائیں گے کہ اس میں اتنا خرچ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کے دوش پر پانی کو سوار کردیا۔ وہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ برس جاتے ہیں۔ اس کو محفوظ بھی کردیا۔ کنوؤں میں' تالابوں میں' نہروں میں' دریاؤں میں۔ ءَ اِلٰـہٌ مَّعَ اللّٰہِ ''کیا اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہوسکتا ہے؟'' جب آدمی بالکل مضطرب' حیران' پریشان ہوتا ہے' سارے مادی وسائل کٹ جاتے ہیں' جو مومن نہیں ہیں' اللہ کو نہیں مانتے وہ بھی جب اس مقام کو پہنچتے ہیں تو کسی نادیدہ ہستی کو پکارتے ہیں: ءَ اِلٰـہٌ مَّعَ اللّٰہِ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ؀ ''کیا اللہ کے سوا کوئی الٰہ ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔''

پھر کون ہے جو تمھارے ہوائی جہاز چلاتا ہے۔ کون تمھیں سمندروں اور خشکیوں

میں چلاتا ہے۔ اور اب تو ہواؤں میں بھی چلاتا اور اڑاتا ہے۔ اپنے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ تم اپنی راہ کو پا لیتے ہو۔ کس نے آسمانوں کو قطب شمالی کا راستہ بتایا جس سے تم راستے بناتے ہو۔ زمین میں نشانیاں پھیلا دیں۔ ستارے بنا دیے۔ جن سے آدمی راستہ پائے یہ کس کا کام ہے؟ تعالَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَo ''اللہ اس شرک سے بالا و برتر ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔'' بے شمار مقامات پر قرآن مجید نے کائنات کی نشانیاں کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ پھر فرمایا ہے کہ اگر کوئی آدمی عبادت کا یہ طریقہ اختیار کر لے کہ میری بندگی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے تو جیسا کہ آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے پوچھا: کیا جانتے ہو کہ اللہ کے اوپر بندوں کا حق کیا ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ اور رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ کے اوپر بندوں کا حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ دے۔

جو آدمی اس زندگی کو اختیار کرے اور شرک سے اپنے آپ کو پاک کر لے تو اللہ تعالیٰ اس بندگی کے صدقے میں اس کے گناہ بھی معاف کرے گا۔ بندوں سے بھی حقوق معاف کروائے گا۔ اس کا ذکر میں بار بار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کے لیے کہا ہے کہ میں خود مدعی سے کہوں گا۔ میں اس کو بڑا زبردست محل دکھاؤں گا۔ مدعی کہے گا کہ مجھے اس سے میرا حق دلوایئے تو میں کہوں گا کہ یہ محل دیکھو۔ وہ پوچھے گا کہ یہ کس کے لیے ہے؟ میں کہوں گا کہ اس کے لیے ہے جو معاف کر دے۔ وہ کہے گا کہ میں معاف کرتا ہوں' میں اس محل میں جانا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان بندوں سے جو اس کی بندگی کریں اور کسی کو شریک نہ کریں' دنیا میں بھی سربلندی کے وعدے کیے ہیں: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ''اگر تم واقعی صحیح معنوں میں ایمان رکھنے والے ہو تو تم دنیا میں غالب رہو گے۔'' اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ (النور:۵۵) ان کو زمین میں غلبہ دے گا' خلافت عطا فرمائے گا۔ ان کے دین کو غالب کرے گا اور خوف اور ذلت کی حالت کو دور کرے گا۔ شرط بس یہ ہے کہ یَعْبُدُوْنَنِیْ، صرف میری بندگی کریں۔ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

یہ شرط پوری کر دو گے تو دنیا کی عزت اور سربلندیاں بھی ہیں اور آخرت کا بھی اجر

ہے۔ معاشی ترقی بھی ہے۔ آسمان سے بھی رزق برسے گا' زمین سے بھی۔ اوپر سے بھی کھاؤ گے' نیچے سے بھی کھاؤ گے۔ لیکن سب کے ساتھ یہی شرط ہے کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، أَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسْأَلُہٗ فَقَالَ: "أَمَا فِیْ بَیْتِکَ شَیْءٌ" قَالَ: بَلٰی حِلْسٌ نَلْبَسُ بَعْضَہٗ وَنَبْسُطُ بَعْضَہٗ، وَقَعْبٌ نَشْرَبُ فِیْہِ مِنَ الْمَآءِ، قَالَ "اِئْتِنِیْ بِھِمَا" فَأَتَاہُ بِھِمَا، فَأَخَذَھُمَارَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِہٖ وَقَالَ: "مَنْ یَّشْتَرِیْ ھٰذَیْنِ"؟ قَالَ رَجُلٌ: اَنَا آخُذُھُمَا بِدِرْھَمٍ، قَالَ "مَنْ یَّزِیْدُ عَلٰی دِرْھَمٍ"؟ مَرَّتَیْنِ أَوْثَلَاثًا، قَالَ رَجُلٌ "أَنَا آخُذُھُمَا بِدِرْھَمَیْنِ" فَاَعْطَاھُمَا اِیَّاہُ، وَاَخَذَ الدِّرْھَمَیْنِ وَاَعْطَاھُمَا الْاَنْصَارِیَّ، وَقَالَ "اِشْتَرِ بِاَحَدِھِمَا طَعَاماً فَانْبِذْہُ إِلٰی أَھْلِکَ، وَاشْتَرِ بِالْاٰخَرِ قَدُوْمًا فَأْتِنِیْ بِہٖ" فَاَتَاہُ بِہٖ، فَشَدَّ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عُوْداً بِیَدِہٖ ثُمَّ قَالَ لَہٗ "اِذْھَبْ فَاحْتَطِبْ وَبِعْ، وَلَا اَرَیَنَّکَ خَمْسَۃَ عَشَرَ یَوْمًا" فَذَھَبَ الرَّجُلُ یَحْتَطِبُ وَیَبِیْعُ، فَجَآءَ وَقَدْ اَصَابَ عَشْرَۃَ دَرَاھِمَ، فَاشْتَرٰی بِبَعْضِھَا ثَوْبًا وَبِبَعْضِھَا طَعَامًا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "ھٰذَا خَیْرٌلَّکَ مِنْ اَنْ تَجِیْءَ الْمَسْاَلَۃُ نُکْتَۃً فِیْ وَجْھِکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ، إِنَّ الْمَسْاَلَۃَ لَا تَصْلُحُ إِلَّا لِثَلَاثَۃٍ: لِذِیْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ، اَوْلِذِیْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ، اَوْلِذِیْ دَمٍ مُوْجِعٍ۔" (ابوداؤد، جلد ۳ ص ۱۲)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک مرد انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا سوال کرنے کو۔ آپؐ نے پوچھا: تیرے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ وہ بولا کیوں نہیں ایک کمبل ہے کچھ اس میں ہم اوڑھتے ہیں کچھ بچھاتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: وہ دونوں چیزیں ہمارے پاس لے آ۔ وہ گیا اور لے کر آیا۔ آپؐ نے ان دونوں کو ہاتھوں میں لیا اور فرمایا: کون خریدتا ہے ان دونوں چیزوں کو؟ ایک شخص بولا: میں لیتا ہوں دونوں کو ایک درہم کے بدلے میں۔ آپؐ نے فرمایا: کون زیادہ دیتا ہے ایک درہم سے' دوبار یا تین بار (یہی نیلام) ایک شخص بولا: میں دو درہم میں لیتا ہوں۔ آپؐ نے وہ دونوں چیزیں اس کو دے دیں اور دو درہم لے لیے اور مرد انصاری کو دے کر فرمایا کہ ایک درہم کا اناج لے کر اپنے گھر میں ڈال دے اور ایک درہم کی کلہاڑی لے کر آ۔ وہ کلہاڑی لے کر آیا۔ آپؐ نے اس میں ایک لکڑی اپنے ہاتھ سے ٹھونک دی اور فرمایا: جا لکڑیاں کاٹ کر لا اور بیچ' پندرہ دن تک میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ وہ شخص گیا اور لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا اور بیچتا تھا۔ پھر وہ شخص آیا۔ اس نے دس درہم کمائے تھے۔ کچھ درہموں کا کپڑا خریدا اور کچھ داموں کا غلہ۔ آپؐ نے فرمایا: تیرے لیے یہ بہتر ہے اس سے کہ سوال تیرے منہ میں ایک داغ ہو قیامت کے روز۔ سوال درست نہیں ہے' مگر تین آدمیوں کے واسطے ایک تو وہ جو نہایت محتاج ہو' خاک میں لوٹتا ہو' دوسرا وہ جو بھاری قرضہ گھبرا دینے والا سر پر رکھتا ہو' تیسرا وہ جس نے خون کیا ہو اور اس پر دیت لازم ہو جائے اور وہ دیت نہ ادا کر سکے تو یہ مجبوری سوال کر سکتا ہے۔

اپنے جیسے انسانوں کی مدد کرنا' دوسروں کی ضرورت پوری کرنا' بھوکوں کو کھانا کھلانا' مجموعی طور پر اپنے مال کو اپنا نہ سمجھنا بلکہ خدا کی امانت سمجھنا اور زندگی کے معاملات میں وسعت قلب کے ساتھ لوگوں سے معاملہ کرنا اخلاق کا ایک پہلو ہے۔ اسی ضمن میں اخلاق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے خود کو بچائے۔ اس کا ایک پسندیدہ پہلو یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کمائے اور کام کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیلانے' سوال کرنے اور بھیک مانگنے سے بہت اچھے اور انتہائی سادہ الفاظ میں' الا یہ کہ بہت زیادہ ضرورت اور مجبوری ہو' منع فرمایا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت انس بن مالکؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری نبی کریمؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے مانگنے لگا۔ آپؐ نے پوچھا: کیا تیرے گھر میں کوئی چیز نہیں؟ اس نے کہا کہ ہاں ہے۔ ایک چادر ہے جس کا کچھ حصہ ہم اوڑھ لیتے ہیں اور کچھ حصہ نیچے بچھا لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں' یہ گھر کی کل متاع ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان دونوں چیزوں کو لے آؤ۔ وہ ان دونوں چیزوں کو رسولؐ کے پاس لے آیا۔ رسولؐ نے اپنے ہاتھوں میں ان دونوں چیزوں کو پکڑا اور کہا کہ ان دونوں چیزوں کو

کون خریدتا ہے؟ ایک آدمی نے کہا کہ میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپؐ نے دو تین مرتبہ پوچھا کہ کیا کوئی اس سے زیادہ قیمت لگانے والا بھی ہے؟ ایک آدمی نے کہا کہ میں ان کو دو درہم کے بدلے لیتا ہوں۔ نبی کریمؐ نے دونوں چیزیں اس کو دے دیں۔ اور درہم لے کر سوال کرنے والے انصاری کو دیے اور فرمایا: ایک درہم کا کھانا خریدو' اور یہ کھانا اپنے گھر والوں کے لیے لے جاؤ اور دوسرے درہم سے کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ۔ وہ کلہاڑی خرید کے نبی کریمؐ کے پاس لے آیا۔ آپؐ نے اس کلہاڑی کے اندر اپنے ہاتھ سے دستہ لگایا' کلہاڑی دی اور فرمایا جاؤ اور اس کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹو' جمع کرو اور ان کو بیچ دو۔ اب میں ۱۵ دن تک تمھیں نہ دیکھوں۔

آدمی چلا گیا اور اس نے لکڑیاں جمع کرنا اور بیچنا شروع کر دیں۔ ۱۵ دن کے بعد وہ آدمی آپؐ کے پاس آیا اور بتایا کہ اب اس کے پاس ۱۰ درہم ہیں۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ گھر کی کل پونجی ایک چادر تھی اور اب وہ ۱۰ درہم کا مالک تھا۔ اس نے اس رقم میں سے کچھ سے کپڑا خریدا اور کچھ سے کھانا خریدا۔ رسول اللہؐ نے اس سے فرمایا کہ یہ تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ تو مانگتا پھرے اور قیامت کے روز تیرے چہرے پر مانگنے کا داغ ہو۔

اپنے ہاتھ سے کمانا مانگنے سے بہتر ہے۔ مانگنا' تین آدمیوں کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ ایک وہ جسے ایسی غریبی ہو جس نے اسے زمین پر گرا دیا ہو' یا کسی کے پاس کسی کا قرض ہو اور وہ اس قرض کا ضامن ہو' یا کوئی خون کا بدلہ دینا ہو اور اسے ادا کرنے کی وہ قوت نہ رکھتا ہو۔ یہ روایت ابوداؤد اور ابن ماجہ میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے لیکن اس کے اندر وہ سبق پوشیدہ ہے جو دوسری احادیث میں اور خود قرآن مجید میں بڑے اہتمام کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اس واقعے کے آخر میں جو بات کہی گئی ہے اس پر غور کر لیجیے کہ وہ کون سے تین آدمی ہیں جن کے لیے مانگنا جائز ہے۔ جو سوال کرتا ہے وہ دراصل اپنے چہرے پر ایک زخم لگاتا ہے۔ چہرے پر یہ زخم بے عزتی کی علامت ہے۔ نبی کریمؐ نے ایک طرف تو اس بات کی تعلیم دی اور بڑی تاکید فرمائی کہ جو بھی مانگنے والا آئے تم اس کی ضرورت کو پورا کر دو۔ قرآن مجید نے خود یہ فرمایا کہ وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ٥ (الذاریات:۱۹)''جو مومن ہیں ان کے مال میں مانگنے والے کا اور محروم کا بھی حق ہے۔'' جب کسی کے آگے کوئی ہاتھ دراز کردے تو آدمی کوشش کرے کہ اس کا سوال پورا کردے۔ جو محروم ہیں' جن کے پاس مال نہیں ہے' جو بے سہارا ہیں' ان کا حق تو ثابت ہی ہے' لیکن مانگنے والے کا بھی حق ہے۔ نہ دے سکے تو جھڑکنے کے بجائے قول معروف' یعنی بھلی بات کہے' نرم زبان استعمال کرے۔ نہ دینا چاہے' جیسے اس پر بھروسا نہیں ہے' سمجھتا ہے کہ بار بار مانگنے والا ہے' دھوکہ دے رہا ہے' مستحق نہیں ہے' تو بھی بھلائی سے جواب دینے کا حکم ہے' مثلاً یوں کہے کہ اللہ برکت دے' اللہ معاف کرے وغیرہ۔

یہ تعلیم تو ان کے لیے ہے جن کے پاس دینے کے لیے کچھ ہے اور وہ دے سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ تعلیم بڑی وسیع ہے۔ جس کے پاس دینے کے لیے پیسہ ہو اس کے لیے بھی راستے ہیں۔ وہ کسی کی مدد کردے۔ مدد کرنے کے لیے پیسہ نہ ہو تو جسمانی مدد کردے۔ جسمانی مدد نہ کرسکتا ہو تو کم از کم بھلی بات ہی کہے۔ اسلام میں لینے اور دینے کا بہت وسیع تصور ہے۔ اس کو نبی کریمؐ کی بہت سی حدیثوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں ذکر دینے والوں کا نہیں' بلکہ مانگنے والوں کا ہے۔ جن کا ہاتھ اوپر نہیں بلکہ نیچے ہے۔ بہت سی احادیث میں یہ آتا ہے کہ رسول اللہ منبر پہ بیٹھ کے اور کھڑے ہو کے مختلف الفاظ میں فرماتے تھے کہ ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ جس کے پاس بھی استطاعت ہو' وہ دوسروں کو دے سکتا ہو تو وہ دے۔ جو مانگتا ہو' ہاتھ پھیلاتا ہو وہ بدتر ہے''۔ آپؐ نے بہت سے طریقوں سے دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی کی طرف متوجہ کیا ہے اور سوال کرنے کی مذمت کی ہے۔ جیسے اس حدیث میں بھی ہے کہ سوال کرنا تو چہرے پہ زخم لگانا ہے۔ چہرے کے زخم کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پوری شخصیت داغ دار ہوگئی۔ سب انسان برابر ہیں' کوئی انسان دوسرے انسان سے بالاتر نہیں ہے کہ مالک بن بیٹھے۔ انسان اگر بلاضرورت مانگتا ہے تو وہ اپنے لیے آگ جمع کرتا ہے۔ اس حال میں اگر وہ برابر مانگتا بھی رہے' پوری زندگی مانگ مانگ کے بسر کرے تو قیامت کے روز اللہ کے سامنے اس حال میں آئے گا کہ پورا چہرہ داغ دار ہوگا۔ ہر سوال چہرے پر ایک داغ بناتا ہے۔

مسلمان تو نماز کے اندر ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، تجھ ہی سے مانگیں گے۔ آدمی اس وقت ضرورت کے وقت ہاتھ پھیلا سکتا ہے جب وہ مضطر ہو۔ مضطر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پاس کوئی راستہ نہ ہو اور یہی راستہ اس کی زندگی کو بچا سکتا ہو۔ مضطر کے لیے حرام چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں۔ مضطر کے لیے سور کا گوشت بھی حلال ہو سکتا ہے۔ اگر جان پر بنی ہوئی ہے تو شراب بھی پی سکتا ہے۔ اسی طرح مجبوری کے وقت سوال کی اجازت ہے۔ اگر انسان مانگنے کو اپنی ضرورت بنا لے اور ذرا ذرا سی بات پر مانگے یا اس کے نفس کے اندر کوئی احساس نہ ہو، وہ بلاتکلف لوگوں سے سوال کرتا پھرے تو یہ مومن کی شان کے خلاف ہے۔ مومن اللہ کا بندہ ہے، اللہ سے تعلق رکھتا ہے، اس سے معاہدہ کرتا ہے کہ تجھ ہی سے مانگیں گے، تیرے علاوہ دوسرے انسانوں سے نہیں مانگیں گے۔

سوال نہ کرنا انسان کے نفس کی بلندی اور بھلائی کے لیے اتنا ضروری ہے کہ نبی کریمؐ لوگوں سے اس بات کی بیعت لیا کرتے تھے کہ تم لوگوں سے سوال نہیں کرو گے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سات آدمی تھے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ مجھ سے بیعت نہیں کرو گے؟ بیعت طریقہ تھا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا اور نیکی کا وعدہ کرنے کا۔ ہم نے ماضی قریب میں بھی حضورؐ سے بیعت کی تھی، اس لیے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم نے ابھی تو آپؐ سے بیعت کی ہے۔ آپؐ نے وہی الفاظ دہرائے: کیا تم لوگ مجھ سے بیعت نہیں کرو گے؟ راوی کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے پھر اپنی بات دہرائی۔ چونکہ نبی کریمؐ نے دو مرتبہ فرمایا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ ہاتھ آگے بڑھایا جائے۔ ساتھ ہی ہم نے پوچھا: اب کس بات پر بیعت کی جائے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس پر کہ تم اللہ کی عبادت کرو گے، نماز قائم کرو گے، اطاعت کرو گے، اور اگر مانگو گے تو صرف اللہ سے مانگو گے۔ اس بیعت کے بعد ان حضرات کا یہ حال تھا کہ اگر گھوڑے سے چابک گر جاتا تو وہ خود نیچے اتر کر چابک اٹھاتے، کسی سے مانگتے نہیں تھے اور پھر گھوڑے پر سوار ہوتے۔ اب یہ بات تو بڑی معمولی ہے کہ ہم کسی سے کہیں کہ یہ کر دو اور وہ کر دو، لیکن انھوں نے چونکہ حضورؐ سے خصوصی بیعت کی تھی اور آپؐ نے بڑے اہتمام اور تاکید سے یہ بیعت لی تھی، اس لیے وہ اس کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔

سب کے لیے کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسا ہی کریں۔ لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزتِ نفس اخلاق کی بلندی کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ اگر کوئی چیز ہاتھ سے گر پڑے تو اسے اٹھانے کے لیے گھوڑے پر سے اترنا اور چڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے' لیکن چونکہ ان لوگوں کو اونچے درجات پر فائز ہونا تھا' اس لیے وہ اپنے کام خود کرتے تھے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم بھی باوجود مجبوری کے سارے کام خود کریں۔ کسی سے اپنا کام کروانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لوگوں نے خود اس بات کو اس حد تک پہنچایا اور اس حد تک عمل کیا اور زندگی میں اسے اختیار کیا۔

یہ حدیث مختلف کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ان سے خاص طور پر کہا کہ تم لوگوں سے کوئی چیز کبھی بھی نہ مانگنا اور خود ہی اس پر یہ اضافہ بھی فرمایا کہ اگر تمھارے ہاتھ سے سواری سے تمھارا کوڑا بھی گر پڑے تو کسی سے یہ مت کہنا کہ یہ اٹھا کر دے دو' بلکہ خود اتر کے اس کو اٹھانا۔ پہلی حدیث میں تو یہ بات نہیں ہے کہ حضورؐ نے اس حد تک تاکید فرمائی اور اس کی وضاحت فرمائی ہو۔ دراصل حضرت ابوذرؓ کا مقام بہت اونچا تھا' اس لیے ان کی خاص تربیت کی گئی۔ انھوں نے کبھی مال جمع کر کے نہ رکھا۔ ان کی شہرت کی وجہ ہی ان کا یہ نقطہء نظر ہے کہ ضرورت سے زیادہ مال رکھنا منع ہے۔ اگرچہ سارے صحابہ کرامؓ کا اس بات پر اجماع ہے کہ آدمی زکوٰۃ دے دے اور مال کو اللہ کی راہ میں سچے دل سے خرچ بھی کرے تو مال جمع کرنے پر اسلام میں کوئی پابندی نہیں ہے۔

حضورؐ کے ایک غلام تھے جن کا نام ثعبان تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا کہ ''کوئی شخص ہے جو مجھ سے اس بات کا عہد کرے کہ وہ لوگوں سے سوال نہ کرے گا۔ میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔ جب انھوں نے یہ سنا تو انھوں نے حضورؐ سے بیعت کی اور اس کے بعد وہ کسی سے کوئی بھی سوال نہ کرتے تھے' کوئی چیز نہ مانگتے تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اس عہد کو نبھاتے ہوئے گزار دی۔

مال مانگنا' لوگوں کے سامنے ضرورت کا اظہار کرنا ممنوع اور حرام تو نہیں ہے' لیکن یہ پسندیدہ بات نہیں ہے۔ آدمی جتنا بھی اپنے آپ کو اس سے پاک رکھ سکے وہ اخلاقی لحاظ

سے بلند مقام حاصل کرے گا۔ اس کی اجازت ہے کہ ضرورت پڑنے پر آدمی مانگ لے۔ دینے کا حکم بھی ہے۔ لیکن اپنا مال بڑھانے کے لیے مانگنا' اپنا پیٹ بھرنے کی ضرورت کے لیے ہو پھر بھی سوال کرنا' مانگ مانگ کے زندگی گزارنا' دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا' اپنے نفس کی عزت کا خیال نہ رکھنا' ان چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ تین صورتیں کون سی ہیں کہ جن میں کسی آدمی کے لیے مال مانگنا اور سوال کرنا جائز ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ غربت اور افلاس ایسا ہو جو زمین پر گرا دینے والا ہو۔ غریب اور مفلس تو بہت سارے ہوتے ہیں۔ احادیث میں ان کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ وہ آدمی جس کے پاس ایک دن کا بھی کھانے پینے کا سامان ہو تو اس کو اس کے ختم ہونے تک مانگنا نہیں چاہیے۔ لیکن یہ اخلاقی فضیلت کی تعلیمات ہیں۔ آدمی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کہاں پر وہ اتنا مجبور ہے کہ مانگ لینا چاہیے۔ دوسرے' اس آدمی کو مانگنے کی اجازت ہے جو مقروض ہو اور اس کا قرض اتنا بھاری ہو کہ وہ اسے ادا نہ کر سکتا ہو۔ وہ بھی اضطراری حالت میں مانگ سکتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ جو کسی دوسرے کا ضامن بن جائے' ضامن کے معنی ہیں کہ کوئی کسی دوسرے کو اپنی ضمانت پر قرض دلوا دے کہ اگر وہ قرض واپس ادا نہ کرے گا تو وہ ادا کر دے گا' اب ضامن کے پاس بھی مال نہیں ہے اور وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو ایسے آدمی کے بارے میں حدیث بیان کی گئی ہے کہ اس کا سوال کرنا جائز ہے۔ تیسرا وہ آدمی ہے جس پر کسی خون کی دیت آتی ہو یا وہ کسی دیت کا ضامن بن جائے کہ میں ادا کر دوں گا اور پھر اس کے پاس اتنا پیسہ نہ ہو کہ وہ دیت کو ادا کر سکے' اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے۔ اس کے علاوہ جو آدمی بھی سوال کرتا ہے' مانگتا ہے وہ اپنے چہرے کو داغ دار اور اپنی عزت کو خراب کرتا ہے۔

نبی کریمؐ اس قسم کے آدمی تیار کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے ایسے آدمی تیار کیے جو ایسے نہ ہوں کہ اللہ سے یہ معاہدہ کریں کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اور پھر کسی دوسرے کے آگے اپنے مال میں اضافے کے لیے اور اپنی تجارت بڑھانے کے لیے قرض کی خاطر ہاتھ پھیلائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو آدمی اس طرح مال مانگتا ہے وہ گویا آگ کا انگارہ مانگتا ہے۔

اپنے مال میں مسلسل اضافے کے لیے قرض مانگنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ سفر کے لیے چیز پاس نہیں ہے' اس صورت میں اتنا ہی مانگنا جائز ہے جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور زندگی قائم رہ سکے۔ اس سے زیادہ مانگنا ٹھیک نہیں ہے۔ کسی آدمی کو مصیبت درپیش ہو' فاقہ ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ محلے کا کوئی آدمی واقف کار ہو جو اس پر گواہی دے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان صورتوں کے علاوہ کوئی سوال کرے تو اس کے لیے سوال کرنا بھی حرام ہے' جو مال اس طرح ملے' وہ بھی حرام ہے۔ جہاں ایک طرف اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ آدمی سخی ہو اور اپنی دولت کو بینکوں میں بھر کر نہ رکھے' اس کو سرمایہ کاری میں لگائے' لوگوں پر خرچ کرے' کاروبار سے لوگوں کو روزگار ملے' اپنے اوپر بھی خرچ کرے' کھائے' پیے' پہنے اور اپنی اولاد اور جو ضرورت مند ہوں ان پر بھی خرچ کرے لیکن دوسری طرف جو ضرورت مند ہے' اس کو جب تک مجبور اور بے کس نہ ہو جائے' سوال کرنے سے روکا گیا ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ مال پر ان کا حق ہے جو چپک چپک کر (جس طرح آدمی لحاف اوڑھ لیتا ہے' چمٹ چمٹ کر) لوگوں سے نہیں مانگتے بلکہ خود بے نیاز دکھائی دیتے ہیں اس اور بے نیازی کی حالت میں رہتے ہیں اور وہ گوارا نہیں کرتے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ ان کی عزت نفس یہ گوارا نہیں کرتی۔ جو آدمی صرف اپنے رب کا ہی بندہ ہو اور اسی سے مانگتا ہو' یہ جانتا ہو کہ دینا اس کے ہاتھ میں ہے' قوت کے سرچشمے اس کے ہاتھ میں ہیں' سارے خزانے اس کے پاس ہیں تو جب تک مجبور اور بے کس نہ ہو' اللہ کو چھوڑ کے کسی کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلائے۔

یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اگر کسی کو بغیر مانگے مال ملتا ہو تو اس سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بھی ایک حد ہوتی ہے جہاں لوگ اس حد تک اپنے آپ کو مال سے بے نیاز کرتے ہیں کہ اگر جائز مل رہا ہو اور بغیر مانگے مل رہا ہو تو آدمی کہتا ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں: ایک دفعہ حضورؐ نے میرے سپرد کوئی خدمت کی۔ خدمت اس زمانے میں عموماً زکوٰۃ اور بیت المال اور صدقے کا مال جمع کرنے کی ہوا کرتی

تھی۔ زکوٰۃ کا مال جمع کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا کہ آدمی نے بینک میں جمع کر دیا بلکہ بھیڑوں' بکریوں اور اونٹوں میں سے حصہ نکالنا پڑتا تھا' جا کے حساب کرنا پڑتا تھا۔ جو لوگ یہ حصہ وصول کر کے لاتے تھے' ان کا معاوضہ ہوتا تھا۔ جو زکوٰۃ جمع کرتے ہیں' وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا' قرآن مجید کے فرمان کے مطابق ان کا معاوضہ زکوٰۃ میں سے ہی لیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ حضورؐ اس کو آپ کسی ایسے آدمی کو دیں جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو' مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسے لے لو۔ ضرورت ہو تو خرچ کر لو' ضرورت نہ ہو تو اسے اپنے مال میں شامل کر کے صدقہ کر دو' لیکن لے لو۔ جو نہ ملتا ہو اس کے پیچھے مت پڑو۔ بغیر مانگے جو مل رہا ہے یا اپنی محنت کا معاوضہ ہو اس کے لینے سے غنی بننا اتنی بھلی بات نہیں ہے۔

دین نے ہر طرف سے افراط و تفریط سے بچایا ہے۔ مال سے محبت کرنے کو منع کیا ہے لیکن مال کو جمع کرنے سے منع نہیں کیا۔ مال کو اس طرح جمع کرنے سے منع کیا ہے کہ آدمی اسے سینت سینت کر رکھے۔ مال کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ پہلے اپنا پیٹ بھرو' اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرو' پھر باہر والوں کا۔ وصیت کرنے کی اور مال دینے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن اتنا مال دینا کہ اولاد مفلس رہ جائے اور باہر والے خوب لے جائیں مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنی اولاد کو غنی حالت میں چھوڑ کے جائے۔

ایک تو یہ حکم ہوا کہ تمھارے مال میں مانگنے والے کا حق ہے۔ اس حق کو ادا کرنے کی کوشش کرو کہ جو مانگنے آئے اسے دے دو۔ اگر دے نہ سکو تو بھلے طریقے سے منع کر دو۔ لیکن دوسری طرف یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے پاس مال ہو تو مانگنا گویا آگ کا لینا ہے۔ اگر ضرورت مند نہ ہو تو سوال کا مال کھانا حرام ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک صورت ایسی ہے کہ آدمی کے پاس کھانے کے لیے بھی نہ ہو۔

حضورؐ نے اپنے قریبی صحابہؓ کی تربیت اس طرح کی کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہ مانگتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بندگی کی اصل روح یہی ہے کہ آدمی سراسر اللہ کا محتاج ہو اور اس محتاجی کے اندر پوری زندگی آجاتی ہے' مثلاً ہدایت' قانون' زندگی کیسے بسر کریں وغیرہ۔ اس کی محتاجی ہو تو دعا مانگے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ بس اپنے آپ کو اللہ کے در پہ ڈال دے'

سب سے بے نیاز ہو جائے اور خواہ مخواہ مانگتا نہ پھرے کہ اس سے چہرہ بھی داغ دار ہو گا اور اللہ کے حضور اس طرح آئے گا کہ چہرے پر بھیک کا داغ لگا ہو گا' جب کہ مومن تو اس طرح اللہ کے پاس جائے کہ چہرہ روشن ہو' اور دل غنی۔ انسانوں کا محتاج نہ ہو بلکہ ان کو دینے والا ہو۔ ہاتھوں سے' مال سے' جان سے جیسے مدد کر سکتا ہو کرے۔ زبان سے کسی کو خوش کر سکتا ہو تو خوش کر دے۔ ایک تو اللہ کی راہ میں دینا ہے دوسرے خود کو مانگنے سے روکنا ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں ہوں گی وہاں پر توازن اور بھلائی ہو گی اور جہاں پر ان میں سے صرف ایک چیز ہو' وہاں پر بھلائی نہیں ہو گی۔ نبی کریمؐ نے دولت اور انسانوں کے ساتھ تعلق کے معاملے میں انھی دو باتوں کی تعلیم دی ہے۔

نماز کیسے بہتر بنائیں

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الصُّنَابِحِيِّ، قَالَ: زَعَمَ أَبُوْمُحَمَّدٍأَنَّ الْوِتْرَ وَاجِبٌ، فَقَالَ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: كَذَبَ أَبُوْ مُحَمَّدٍ، أَشْهَدُ أَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُوْلُ: "خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى: مَنْ أَحْسَنَ وُضُوْئَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَأَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ أَنْ يَّغْفِرَلَهٗ، وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ إِنْ شَآءَ غَفَرَلَهٗ وَإِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ. (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ صنابحی سے روایت ہے کہ ابومحمد نے کہا: وتر واجب ہے۔ (ابومحمد صحابی ہیں، نام ان کا مسعود بن زید ہے یا مسعود بن اوس یا قیس بن عبایہ) یہ بات عبادہ بن صامت کو پہنچی۔ انھوں نے کہا: غلط کہا ابومحمد نے۔ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے: پانچ نمازیں ہیں جن کو فرض کیا اللہ عزوجل نے۔ جو شخص اچھی طرح ان کے واسطے وضو کرے گا، اور وقت پر ہر ایک کو ادا کرے گا اور رکوع پورا کرے گا اور خشوع سے پڑھے گا (دل لگا کر) تو اللہ جل جلالہٗ پر اس کا وعدہ ہوگا مغفرت کا۔ اور جو ایسا نہ کرے گا اس کا وعدہ اللہ پر نہیں ہے۔ چاہے اس کو بخشے چاہے عذاب کرے۔

نماز سارے دین کی بنیاد ہے۔ نماز کی اہمیت بہت سی احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ اس حوالے سے ایک روایت حضرت عبادہ بن صامت انصاریؓ سے ملتی ہے۔ یہ وہ صحابیؓ ہیں جو بیعت عقبہ میں بھی شریک تھے اور ان سے بہت سی روایات حدیث کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے سنا کہ پانچ

نمازیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے۔ جس نے ان کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور اس کا حق ادا کیا، اور جس نے ان کے لیے رکوع و سجود کیے اور خشوع کے لحاظ سے ان کو مکمل کیا، تو اس کے لیے اللہ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اس کو بخش دے گا۔ اور جو ایسا نہ کرے اس کی طرف سے اللہ کے اوپر کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو اسے بخش دے گا اور چاہے گا تو اسے عذاب دے گا۔

یہ حدیث اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے۔ اکثر احادیث میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ حدیث کے ساتھ کسی تفسیر یا تحقیق کی کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ کے رسولؐ اٹھتے بیٹھتے عام زندگی میں تعلیم دیا کرتے تھے اور لوگ بغیر کسی تفسیر کے اس بات کو سمجھ جایا کرتے تھے۔ چونکہ ہمارا مقصد صرف اس حدیث کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے دین کی ان بنیادی تعلیمات کی ایک تذکیر اور یاددہانی بھی ہے جو اس حدیث کے ساتھ وابستہ ہیں، اس لیے ہم اس کی تشریح کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے اس کے انداز بیان پر غور فرمائیے۔ حضرت عبادہ بن صامت انصاریؓ فرماتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں۔ اس کے اندر ایک زور ہے اور تاکید ہے کہ یہ وہ بات ہے جو میں نے خود نبی کریمؐ سے سنی اور آپ کا یہ فرمان میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ اگر اس حدیث کے آخری الفاظ پر بھی غور کیا جائے تو وہ بھی بہت اہم ہیں، اس لیے کہ ان میں پانچ نمازوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کی شرائط یہاں بیان کی گئی ہیں: عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اَنْ يَّغْفِرَ لَهُمْ ''اللہ کے اوپر عہد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بخش دے گا۔'' ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو ان شرائط کو پوری طرح ادا نہیں کرے گا تو پھر اس کا کوئی ذمہ اللہ نے نہیں لیا۔ لیکن دروازہ کھلا ہوا ہے، چاہے گا تو بخش دے گا، اور چاہے گا تو اسے عذاب دے گا۔

یہ حدیث سنن ابی داؤد میں، سنن نسائی میں، امام مالک کی مؤطا میں اور مسند امام احمد بن حنبل میں روایت کی گئی ہے۔ الفاظ کچھ تھوڑے سے مختلف ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے جو الفاظ پڑھے ہیں وہ مسند احمد کے الفاظ ہیں۔ اس مسند میں یہ حدیث کچھ تھوڑے سے مختلف

الفاظ کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے۔ الفاظ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی حدیث کا حصہ ہیں۔ لیکن یہ الگ الگ روایت ہوئی ہیں۔ حدیث کا بیش تر مضمون تو وہی ہے لیکن فرمایا گیا ہے: جو ان نمازوں کو اس حیثیت سے لے کر آیا کہ اس نے ان کے حقوق کو، ان میں سے کسی حق کو بہت ہلکا اور کم قیمت کا سمجھ کر ضائع نہیں کیا، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی مغفرت کر دے گا۔ دو روایات کے دو حصے ایک دوسرے کی بات کو مکمل کرتے ہیں۔ ایک طرف تو مثبت بات ہے جس نے اس کے لیے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا، جس نے ان نمازوں کو وقت کے اوپر پڑھا، جس میں کہ ان کے رکوع اور سجود اور خشوع، تین چیزوں کا ذکر ہے، تینوں کے لحاظ سے ان کو پورا کیا تو اس کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے کہ اس کو بخش دے گا۔

دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے جو نماز کے حقوق ہیں یعنی یہ کہ ان کو وقت پر پڑھا جائے، ان کے لیے وضو اچھی طرح کیا جائے، ان کے رکوع' سجود اور خشوع کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے کہ بس کھڑا ہوا، نیت باندھی اور چند حرکتیں کیں اور نماز ادا ہوگئی۔ جس نے ان حقوق کو ضائع نہیں کیا، ان کو ہلکا سمجھ کر نہیں چھوڑا، غلطی سے چھوٹ گیا کہ انسان سے کوتاہی بھی ہو جاتی ہے وہ الگ بات ہے' تو اس کے لیے اللہ نے ذمہ لیا ہے کہ اس کو بخش دے گا۔ اس کے اندر جو وعدہ فرمایا گیا ہے اور اس کے لیے جو زبان استعمال کی گئی ہے' وہ بھی قابل غور ہے۔ فرمایا کہ اللہ کا عہد اور وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنے کے لیے مجبور نہیں ہے، وہ جس کو چاہے عذاب دے اور جس کی چاہے مغفرت فرمائے۔ لیکن اس کے سارے کام اس کے قانون کے تحت ہوتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کی ذمہ داری لے لی ہے تو یہ اس کی طرف سے وعدہ ہے۔ ایمان اور احتساب کی دو شرائط کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے، نماز اور تلاوت اللہ کے یہاں قبول ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس بات پر بھی ایمان اور اجر کی طلب اور توقع ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچ نمازوں کے ساتھ جو وعدہ فرمایا ہے' جن کو ہم میں سے اکثر روزانہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے ہیں، تو وہ ایک مضبوط وعدہ ہے۔ اگرچہ کچھ شرائط کے ساتھ ہے۔

نمازوں کے ساتھ اتنا بڑا وعدہ کیوں ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ بات سمجھنا اور جاننا

ضروری ہے کہ نماز کا دین کے اندر کیا مقام ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ لیکن یہ نماز جس طرح فرض ہے' اس کی اہمیت اور اس کے مقام کا اندازہ ہم میں سے سب کو نہیں ہے۔ نماز اس قدر اہم ہے کہ نبی کریمؐ نے اپنے مختلف ارشادات میں فرمایا کہ نماز تو دین کا ستون ہے۔ مَن اَقَامَهَا اَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا هَدَمَ الدِّيْنَ، ''جس نے نماز کو قائم کیا اس نے پورے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو گرا دیا اس نے پورے دین کو گرا دیا۔'' اس ستون پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے احکام، اس کی شریعت، اس کا قانون، اس کے اخلاق یہ سب کے سب نماز کے ستون پر قائم ہیں۔ نماز ہی مسلمان اور کافر، اور مسلمان اور منافق کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ یہ بات بھی حدیث میں کہی گئی ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان جو چیز فرق کرتی ہے وہ نماز ہے۔ جو لوگ کوئی اور کام نہ بھی کریں، لیکن کلمہ پڑھیں اور نماز قائم کریں تو وہ مسلمان امت کے اندر شمار ہوں گے۔ عہد نبویؐ میں تو اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ کوئی آدمی مسلمان ہو اور وہ نماز نہ پڑھے یا مسجد میں حاضر نہیں ہو۔ ایک صحابیؓ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص عشاء اور فجر کی نماز سے غیر حاضر ہوتا تھا تو ہم اس کے بارے میں بدگمان ہو جایا کرتے تھے کہ وہ مسلمان رہا یا نہیں رہا۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ منافق بھی نماز کے لیے مسجد آتے ہیں۔ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى، وہ تو ایسے آتے ہیں جیسے مارے باندھے آ رہے ہوں یا کوئی ان کو زبردستی لا رہا ہو۔ جو صحیح معنوں میں مسلمان ہوتا ہے وہ اپنی خوشی سے آتا ہے۔

دراصل نماز کی اہمیت اس لیے ہے کہ پوری شریعت، پورا دین، اور انسان کی پوری زندگی جو وہ اللہ کی اطاعت اور بندگی میں گزارنا چاہے' وہ اسی نماز کے اوپر قائم ہے۔ یہ نماز کے اوپر اس لیے قائم ہے کہ ہمارا اللہ کے ساتھ جو بندگی کا تعلق ہے' وہ دراصل یہ ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا ہے' جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ اس کا دیا ہوا ہے' اس زمین پر جو ساری نعمتیں ہیں وہ اسی کی بخشی ہوئی ہیں۔ یہ آنکھ جس سے ہم دیکھتے ہیں، یہ کان جس سے ہم سنتے ہیں، یہ ہاتھ پاؤں جس سے ہم کام کرتے ہیں' اچھے کام بھی کرتے ہیں اور برے کام بھی کرتے ہیں،

لاکھوں کروڑوں بھی کماتے ہیں اور بعض دفعہ محنت کا کچھ بھی پھل نہیں ملتا، یہ سب کی سب چیزیں اس کی عطا کی ہوئی ہیں۔ بندگی کے اصل معنی یہ ہیں کہ آدمی یہ سمجھے کہ وہ بالکل اللہ کا ہے اور ہر چیز میں اس کا محتاج ہے، پورے کا پورا وہ اسی کا ہے۔ اسے ہر چیز اسی سے مانگنی چاہیے۔ جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔ جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ بھی مجھے ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ملا ہے تو پھر اس کے اندر شکر کا اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو ہستی اتنی رحم کرنے والی ہے، اتنی بخشنے والی ہے، جس نے جان بھی دی اور جسم بھی دیا، رشتے بھی دیے اور مال بھی دیا اور زمین سے غذا بھی اگائی اور آسمان سے پانی بھی برسایا، کھانا بھی کھلاتا ہے اور پانی بھی پلاتا ہے، اور جب بیمار ہوتا ہوں تو شفا بھی وہی دیتا ہے، تو پھر آدمی لازماً اس سے محبت کرے گا اور اس کا شکر ادا کرے گا۔ جب محبت اور شکر ادا کرے گا تو اس کا اظہار بھی کرے گا۔ اس کا یہ اظہار نماز ہے۔ نماز دراصل اللہ کے ساتھ محبت اور شکر کا اظہار ہے۔ آپ سورۂ فاتحہ شروع کرتے ہیں تو الحمد سے شروع کرتے ہیں۔ یہ سورہ شکر کی سورہ ہے۔ ساری تعریف اور سارا شکر اللہ کے لیے ہے۔ اس کے بعد آپ نماز میں کبھی اس کی تسبیح کرتے ہیں، کبھی اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں، کبھی تعریف کرتے ہیں، کبھی اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اپنے آپ کو محتاج بنا کر اس کے در پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل شکر اور محبت ہی کا اظہار ہے اور یہی ایمان کی بنیاد ہے۔ شکر اور محبت کے اوپر ہی شریعت کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔

آج مسلمان شاید دین کے بارے میں وہ سب کچھ جانتے ہیں جو ان کو جاننا چاہیے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے' کیا نہ کرنا چاہیے' لیکن جو کرنا چاہیے وہ نہیں کرتے اور جو نہیں کرنا چاہیے وہی کرتے ہیں' تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علم کی کمی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کی بنیاد پر عمل کرنے کے لیے جس قوت اور طاقت کی ضرورت ہے، جو شکر اور محبت سے پیدا ہوتی ہے، اس کی کمی ہے۔ یہ قوت اس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ میری ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے۔ وہ اگر چاہے تو آناً فاناً نگاہ کو چھین کر لے جائے اور کوئی آنکھ واپس لا کر نہیں دے سکتا، کانوں کو اگر سننے سے محروم کر دے تو کوئی کانوں کی سماعت واپس

نہیں دے سکتا، ہاتھ پاؤں کو مفلوج کر دے تو کوئی ہاتھ پاؤں کو دوبارہ متحرک نہیں کر سکتا، سانس نکل جائے تو کوئی جسم میں روح کو واپس نہیں لا سکتا۔ میں تو اس طرح اس کا محتاج ہوں، اس طرح اس کے آگے ذلیل ہوں، اس طرح اس کے آگے پست ہوں، میرا کچھ اختیار نہ میرے اپنے اوپر ہے، نہ اپنے حالات کے اوپر ہے، اس کے آگے میں غلام بن کر، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہوں، ہر چیز اسی کی بخشی ہوئی ہے۔ یہ احساس جتنا مضبوط ہوگا' اس سے اتنی ہی زیادہ محبت پیدا ہوگی۔ اس کا احساس پیدا ہوگا تو ایمان مضبوط ہوگا اور جتنا ایمان مضبوط ہوگا' اتنا ہمارے اندر وہ قوت اور طاقت آئے گی جس کے بل پر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی اور اس کی شریعت کی تعمیل کر سکیں گے، اس کی اطاعت کر سکیں گے اور اس کی نافرمانی سے بچ سکیں گے۔

آپ غور کریں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو ہمارا تعلق ہے' یہ زندگی کے ہر کام کے اندر ہونا چاہیے۔ اگر ہم بندے ہیں تو ہمارے دل کو بھی اس کا بندہ ہونا چاہیے، ہماری سوچ اور دماغ کو بھی اس کا بندہ ہونا چاہیے، ہمارے ہاتھ اور پاؤں کو بھی اس کا بندہ ہونا چاہیے، ہماری جیب اور مال کو بھی اس کا بندہ ہونا چاہیے۔ ہمارے سارے رشتے اور تعلقات بھی اسی کی بندگی کے تحت ہونے چاہییں۔ نماز میں ہماری پوری شخصیت' پورا وجود اللہ تعالیٰ کی بندگی کے اندر مصروف ہو جاتا ہے۔ ذہن اور خیال کو بھی اللہ کی طرف ہونا چاہیے، اس لیے کہ نماز اللہ کی یاد کے لیے ہے۔ نماز میں جتنی اللہ کی یاد کم ہوگی، اتنی ہی نماز کی کیفیت اور اس کا اثر بھی کم ہوگا۔

کچھ شرائط ہیں جن کو پورا کرنے سے نماز اپنا اثر دکھاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ لیا ہے کہ جو ان پانچ نمازوں کو اس طرح ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔ نماز کے اندر اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ذہن، دل اور دماغ سب اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پھر زبان جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے وہ بھی اسی کی بندگی، شکر اور محبت کا برابر اظہار کرتی رہتی ہے، اللہ کی تسبیح کرتی ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرتی رہتی ہے۔ پھر ہمارے جسم کی ساری ادائیں بندگی اور غلامی کی ہوتی ہیں۔ ہم غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ محسوس کرتے ہیں کہ بندگی کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تو اس کے سامنے جھک جاتے

ہیں۔ پھر محسوس ہوتا ہے کہ اب بھی جو اس کی بندگی ہے' اس کے لحاظ سے ہماری پستی مکمل نہیں ہوئی، تو اپنے سر اور اپنی پیشانی کو اس کے آگے مٹی پر ٹیک دیتے ہیں۔ جسم کی یہ ساری ادائیں بندگی اور غلامی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ذکر صرف زبان کا ذکر نہیں ہے بلکہ دل کا بھی ذکر ہے۔ دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے اگرچہ ادھر ادھر بہک رہا ہو، اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال نماز کے اندر اللہ کی یاد کا ہونا، اس سے بات چیت کرنا اور یہ سمجھ کر کرنا کہ ہم کیا بات چیت کر رہے ہیں، یہ نماز کی کیفیت اور اس کے اثر کے لیے، نماز کے اندر قوت اور طاقت پیدا کرنے کے لیے اور نماز سے وہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے جس کو بخشنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز کو ہمارے اوپر فرض کیا ہے، ضروری ہے۔

ہم زندگی کے اندر زبان سے بہت ساری باتیں بولتے رہتے ہیں۔ نماز میں زبان کا ہر لفظ اللہ کی بندگی کا اظہار کرتا ہے اور پورا جسم بھی اسی کے اندر مشغول ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر تو نماز کے اندر کوئی ایسا فعل نہیں جس سے آدمی اپنا مال بھی اللہ کے لیے قربان کر رہا ہو لیکن وہ وقت لگاتا ہے۔ اسی وقت کو اگر وہ چاہے تو مال کمانے میں بھی لگا سکتا ہے، تو گویا وہ دنیا کو چھوڑ کر، مال کمانے میں جو وقت لگ سکتا تھا' اس وقت کو اللہ کی بندگی میں لگا دیتا ہے۔ ایک طرح سے یہ مال کی قربانی بھی ہے، اگرچہ مال کی قربانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے شریعت کا دوسرا حکم نازل فرمایا ہے اور وہ زکوٰۃ کا حکم ہے۔

نماز اللہ کی یاد کو زندگی میں جاری و ساری کرتی ہے۔ اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی غفلت سے دور رہتا ہے، چوکنا اور ہوشیار رہتا ہے، کہیں غلطی کرتا ہے تو توبہ کرتا ہے، اس کے دل کے اندر اللہ کی یاد سے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''جو آدمی اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو اپنے رب کو یاد نہیں کرتا ان دونوں کی مثال مردہ اور زندہ کی ہے''۔ آدمی زندہ یا مردہ زندگی میں نہیں ہوتا۔ یا تو زندہ ہوتا ہے یا پھر مردہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان کا وجود، اس کا دل، اس کی شخصیت، اس کی زندگی اور موت اللہ کی یاد سے وابستہ ہے۔ فرمایا: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط (الحشر:۱۹)'' ان

لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول گئے تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو اپنا آپ بھلا دیا۔" جو آدمی اپنے سے غافل ہو گیا، اپنے کو بھول گیا' مر گیا۔ یہی بات اس حدیث میں کہی گئی ہے کہ دل کی، ایمان کی، شخصیت کی اور وجود کی، سب کی زندگی اللہ کی یاد سے وابستہ ہے۔ اللہ کی یاد نہ ہو تو آدمی چلے گا، پھرے گا، سانس لے گا، کاروبار کرے گا، دنیا کے اندر سارے کام کرے گا لیکن وہ دراصل ایک مردہ آدمی ہے۔ اگر اللہ کی یاد دل میں ہو، اور آدمی کچھ بھی نہ کر سکے، آدمی پلنگ کے اوپر پڑا ہوا ہو، ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکتا ہو لیکن وہ زندہ آدمی ہے، اس لیے کہ اس کے دل میں اللہ کی یاد ہے۔ اللہ کی یاد سے ہی دل کی زندگی ہے اور نماز کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ اللہ کی یاد دل کے اندر رائج ہو۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ۝ (طٰہٰ: ١٤) "میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔" میری یاد تمھاری زندگی کے اندر قائم ہو۔ فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (العنکبوت: ٤٥) "یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے"۔

یہ اتنا بڑا کام ہے جو نماز کرتی ہے۔ اس لیے کرتی ہے کہ سب سے بڑی چیز اللہ کی یاد ہے۔ جب نماز کے ذریعے پانچ وقت اللہ کی یاد تازہ ہوگی تو آدمی لوٹ کر آئے گا۔ اللہ کے دربار میں کھڑا ہوگا تو اللہ کی یاد زندگی میں جاری و ساری ہوگی۔ نماز اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے۔ اس سے وہ زندگی بنتی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس کی مغفرت فرما دے گا۔

اس حدیث کے اندر صرف یہی بات نہیں کہی گئی کہ جس نے بھی نماز پڑھ لی اور جیسی بھی پڑھ لی' اس کے لیے اللہ نے ذمہ لے لیا ہے کہ وہ اس کو لازماً بخش دے گا، بلکہ یہ بتایا ہے کہ کس قسم کی نماز کے لیے اس نے یہ ذمہ لیا ہے اور اپنے بندوں سے یہ عہد باندھا اور وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو لازماً بخش دے گا۔ ایسی نماز کے لیے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اَحْسَنَ وُضُوْئَهُنَّ، جس نے ان کے لیے وضو کیا تو اچھی طرح خوب صورتی کے ساتھ کیا۔ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ، اور ان کو اپنے وقت کے اوپر پڑھا۔ وَاَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ، اور ان کا

رکوع اور ان کا خشوع سب کو پورا کیا۔ اس لحاظ سے نماز کے اتمام کے معنی ہوتے ہیں پورا کرنا، بہتر سے بہتر کرنا، کمال تک پہنچانا۔ لہٰذا جس نے اچھی طرح وضو کیا، اپنے وقت پر نماز کو پڑھا، اچھی طرح رکوع اور سجدہ کیا اور خشوع کے لحاظ سے جو ان کے حقوق تھے ان کو پورا ادا کیا، ان کو کمال تک پہنچایا، اس نے اتمام نماز کیا۔

اللہ کے دربار میں حاضری کے لیے سب سے پہلی چیز پاکیزگی اور طہارت ہے۔ نماز کے لیے پہلی شرط وضو ہے۔ وضو کے اندر دو باتیں ہیں۔ ایک تو وضو میں آدمی اپنے جسم کو پاک اور صاف کرتا ہے۔ وضو کے ارکان ہیں، فرائض بھی ہیں، سنتیں بھی ہیں اور مستحبات بھی ہیں۔ جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ممکن ہوسکتا ہے ان کو ادا کر کے ہم وضو کرتے ہیں۔ وضو کرتے ہوئے ان فرائض اور سنتوں کو ادا کرنے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ جل شانہٗ کے دربار میں جا رہا ہوں اور اس دربار میں جانے کے لیے کس کیفیت میں ہونا چاہیے۔ میرے جسم کو بھی پاک اور صاف ہونا چاہیے۔ کپڑے بھی پاک اور صاف ہونے چاہییں۔ جسم کے اوپر کوئی غلاظت اور گندگی نہیں ہونی چاہیے۔ ہاتھ پاؤں، چہرہ سب کو دھو کر ہی میں اللہ کے حضور میں جا سکتا ہوں۔ ایک طرف تو اعضا کی پاکیزگی ہے، اس کے لیے اہتمام ضروری ہے۔ یہاں تک اہتمام ہے کہ کوئی جگہ خشک نہیں رہنی چاہیے۔ وضو کے حسن کا ایک پہلو یہ ہے کہ ظاہری طور پر اس کے جو بھی آداب ہیں' ان کو ملحوظ رکھ کر وضو کو پورا پورا کیا جائے۔ یہ اس بات کا ذریعہ اور کنجی ہے کہ آدمی کا دل جاگ اٹھے۔ اگر لاپروائی سے وضو کیا جائے تو ظاہر ہے کہ نماز کے لیے وضو کی شرط تو پوری ہو جائے گی لیکن وضو کا وہ فائدہ نماز کے لیے حاصل نہیں ہوگا جو حاصل ہونا چاہیے۔

وضو کے صرف چند ظاہری آداب پورے کر لیے جائیں تو مکمل فائدہ نہیں ہوگا۔ وضو کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کے نام سے شروع کریں۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم۔ بعض فقہا کے نزدیک تو جو وضو اللہ کے نام سے شروع نہ ہو وہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن سب فقہا نے اتنی سختی نہیں برتی ہے۔ حضورؐ نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ وضو کے بعد اللہ سے یہ دعا

کی جائے کہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔'' اے اللہ تو مجھے ان میں سے کردے جو توبہ کرتے ہیں، اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔'' تطہر کے معنی ہیں بڑے اہتمام سے اپنے آپ کو پاک کرنا۔ وضو کرنے کے بعد اس دعا کے معنی ہیں کہ ہم اپنے آپ کو گناہوں سے بھی پاک کریں۔

ایک طرف جہاں یہ لازمی اور ضروری ہے کہ وضو ظاہری آداب وشرائط کی پابندی کے ساتھ ہو، خوب صورت اور مکمل ہو، وہاں گناہوں کا احساس اور ان سے استغفار اور توبہ بھی ضروری ہے۔ صرف یہ دعا کافی نہیں ہے کہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ بلکہ توبہ کرنا ضروری ہے۔ یہ دعا بھی کافی نہیں ہے کہ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ بلکہ اپنے اندر جو گندگیاں ہیں' ان سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ جو آدمی اس طرح وضو کرتا ہے اس کے بارے میں نبی کریمؐ نے کہیں مختصر الفاظ میں اور کہیں تفصیلی الفاظ میں بشارت دی ہے کہ وضو کے ساتھ ساتھ اس کے گناہ دھلتے جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ کے گناہ دھل جاتے ہیں، پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ بخاری اور مسلم کی ایک مختصر روایت میں یہ ہے کہ یہاں تک کہ ناخن کے نیچے جو گناہ ہوتے ہیں' وہ بھی پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ لیکن وضو کے لیے خشوع کی شرط لازمی ہے۔ اگر اس طرح کا وضو ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا احساس ہو، اس کی فکر ہو، اس کا خوف ہو، اس کی طلب ہو، اس کے لیے تیاری ہو، اس کے لیے پاکیزگی کی فکر ہو، پھر جسم کے ہاتھ پاؤں اور چہرے ہی کی پاکیزگی کافی نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی بھی ہو، تو یہ وضو ایسا وضو ہوگا جس سے ہم اللہ کے دربار میں حاضری کے لیے واقعی تیار ہوں گے اور نماز کے اندر وہ خشوع پیدا ہوگا جس کا ذکر نبی کریمؐ نے اسی حدیث میں آگے بیان فرمایا ہے۔

دوسری بات آپؐ نے فرمائی: وَصَلَّاھُنَّ لِوَقْتِھِنَّ ، اس نے ان نمازوں کو ان کے وقت کے اوپر ادا کیا۔ قرآن نے خود اس کی تاکید فرمائی ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء: ۱۰۳) '' بے شک نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔'' پانچوں نمازوں کے اوقات مقرر ہیں۔ ان

نمازوں کے اوقات کے دو سرے ہیں جن کی نبیؐ نے تعلیم دی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جبریلؑ ایک دن تشریف لائے اور صبح کے ایک سرے پر فجر' پھر ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کے اول وقت پر نماز پڑھائی اور دوسرے دن تشریف لا کر آخر وقت پر نماز پڑھائی اور فرمایا کہ ان دونوں اوقات کے درمیان نماز کا اصل وقت ہے۔ اس بارے میں بہت ساری احادیث اور روایات ہیں جس سے فقہا نے نتائج نکالے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز کا یہ وقت بہتر ہے اور کسی نے کہا ہے کہ یہ وقت بہتر ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو آدمی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہو اس کی نماز تو وقت پر ہی ہوگی۔ جماعت نماز کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ وقت کی پابندی کا ایک بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ حدیث میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ آدمی کو ہر وقت یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ وہ کل کے لیے کیا کر رہا ہے؟ موت کے بعد کے لیے کیا عمل کر رہا ہے؟ قرآن نے بھی اس کی تاکید کی ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ (الحشر:۱۸) ہر نفس کو چاہیے کہ وہ برابر نگرانی کرے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے؟"

نماز کے لیے پابندی وقت کے بہت سارے دنیوی فوائد گنوائے جا سکتے ہیں۔ زندگی منضبط ہو جاتی ہے۔ ہر کام کو وقت پر کرنے سے پوری معاشرت، معیشت، سیاست غرض ہر چیز سدھر سکتی ہے۔ لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ وہ تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ یہ دنیوی فوائد ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے آپ کا وہ دل جاگ اُٹھتا ہے جس کی اصلاح پر ساری زندگی کی اصلاح کا مدار ہے۔ اس دل میں اگر وقت کی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو جائے، اللہ کی بندگی بروقت کرنے کا احساس جاگ اٹھے' اور ہر کام کو اس وقت پر کرنے کا معمول بن جائے جو وقت اللہ تعالیٰ نے اس کام کو کرنے کے لیے مقرر کیا ہے تو اور کیا چاہیے۔ زکوٰۃ، حج، روزہ سارے ہی کام وقت کے ساتھ پابند ہیں۔

وقت گزار کر بے پروائی سے نماز پڑھنا منافق کی نشانی ہے۔ حدیث میں صرف عصر کی نماز کا ذکر ہے کہ منافق کی نماز یہ ہوتی ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے، سورج پیلا پڑ جاتا ہے، ڈوبنے کے قریب ہو جاتا ہے تو وہ مسجد میں آتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے اور مرغوں کی طرح دو

چار ٹھونگیں مار لیتا ہے۔ اٹھا، بیٹھا، کھڑا ہوا، بیٹھ گیا اور نماز پڑھ کے چلا گیا۔ یہ منافق کی نماز ہے، مومن کی نماز ایسی نہیں ہو سکتی۔ مومن تو وقت سے پہلے ہوشیار ہو گا کہ اللہ کے دربار میں جانا ہے۔ اس کے لیے اپنے آپ کو پاک کرے گا، اپنے چہرے کو ہاتھ پاؤں کو دھوئے گا۔ اس کے بعد ٹھیک وقت پر جا کر وہ اپنے آقا کے دربار میں حاضر ہو گا۔ وقت کی پابندی کوئی مشینی عمل نہیں ہے کہ آدمی نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا بلکہ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کا احساس ہو۔ جس وقت اس نے بلایا ہے اسی وقت جانا ہے، اس کے دربار میں حاضر ہونا ہے اور اس کے آگے اپنی جو بات کرنی ہے وہ اسی وقت کرنی ہے۔

تیسری شرط آپؐ نے یہ بیان فرمائی: وَاَتَمَّ رُکُوْعَھُنَّ وَخُشُوْعَھُنَّ جس نے ان نمازوں کو رکوع اور خشوع کے لحاظ سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ ہم لوگ نماز میں رکوع اور سجدہ کرتے ہیں۔ اپنی پیٹھ جھکاتے ہیں، رکوع ہو جاتا ہے۔ پیشانی اللہ کے سامنے ٹیکتے ہیں، سجدہ ہو جاتا ہے۔ ان حرکات کو بھی پورے اطمینان کے ساتھ مکمل کرنا اس حدیث کا تقاضا ہے۔ نبی کریمؐ نے اس کی بہت زیادہ تعلیم دی۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اس کے لیے اتنی سختی بھی اختیار فرمائی کہ ایک آدمی مسجد میں آیا اور اس نے نماز پڑھی۔ ہم لوگوں میں سے بھی بہت سے لوگ ایسی نماز پڑھتے ہیں۔ جلدی سے کھڑے ہوئے، اور جلدی سے جھک گئے۔ پورے جھکنے بھی نہ پائے تھے کہ کھڑے ہو گئے، اور کھڑے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سجدے میں سر رکھ دیا، اور سر بھی نہ رکھنے پائے تھے کہ اٹھ کر بیٹھے، اور پورے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے بلکہ ایڑی کے بل بیٹھے ہی تھے کہ جلدی سے پھر دوبارہ جھک گئے۔ اس شخص نے بھی اسی طرح نماز پڑھی ہو گی۔ وہ آیا اور اس نے آ کر حضورؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے کہا: وعلیکم السلام، تمھاری نماز نہیں ہوئی، دوبارہ جا کر نماز پڑھو۔ وہ واپس گیا۔ اس نے دوبارہ نماز پڑھی اور پھر اسی طرح پڑھی۔ پھر وہ آیا، پھر اس نے سلام کیا۔ آپؐ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا لَمْ تُصَلِّ، تو نے نماز نہیں پڑھی۔ واپس جاؤ اور پھر دوبارہ نماز پڑھو۔ پھر اس نے تیسری دفعہ جا کر نماز پڑھی اور پھر اسی طرح نماز پڑھی اور نماز پڑھنے کے بعد پھر اس نے سلام کیا اور پھر آپؐ نے کہا لَمْ تُصَلِّ، تو نے نماز نہیں پڑھی۔

اس نے کہا: حضورؐ، مجھے اس سے بہتر نماز پڑھنی نہیں آتی‘ آپؐ مجھے تعلیم دیجیے کہ میں نماز کیسے پڑھوں؟ آپؐ نے یہ عمل تین دفعہ اس لیے کیا کہ یہ آپؐ کی تعلیم کا طریقہ تھا۔ آپؐ پہلی دفعہ بھی اس کو بتا سکتے تھے کہ تمھاری نماز میں یہ اور یہ خامی ہے۔ لیکن تین دفعہ نماز پڑھوا کر ایک تو آپؐ نے بات قبول کرنے کے لیے اس کے دل کو تیار کر دیا اور دوسرے اس کی اہمیت اس کے دل میں بٹھا دی۔ اتنی بڑی اہمیت ہے کہ تین دفعہ آپؐ نے اسے واپس بھیجا کہ نماز دوبارہ پڑھ کر آؤ۔ حضورؐ کا یہ طریقہ تھا کہ آپؐ بات بھی تین دفعہ دہراتے تھے۔ ایک ہی بات کو تین تین دفعہ دہراتے تاکہ لوگ اچھی طرح سن لیں، سمجھ لیں اور اپنے دل و دماغ کے اندر بٹھا لیں۔ پھر آپؐ نے کہا کہ کھڑے ہو تو اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو، رکوع کرو تو اپنی پیٹھ کو سیدھا کر لو اور رکوع اطمینان کے ساتھ کرو۔ پھر جب کھڑے ہو تو سیدھے کھڑے ہو جاؤ، سجدہ کرو تو پوری پیشانی ٹیک دو، ہاتھ نیچے زمین پر رکھ دو۔ بیٹھو تو پیٹھ سیدھی ہونی چاہیے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھو۔ پھر اسی طرح سجدہ کرو۔ تو یہ نماز مکمل نماز ہے۔

جو آدمی نماز میں رکوع اور سجدے کے اندر اس طریقے سے ڈنڈی مارتا ہے کہ سجدہ آدھا کیا، رکوع آدھا کیا، حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نماز کا چور ہے۔ فرمایا کہ بدترین چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ نماز کا چور کون ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نماز کا چور وہ ہے جو رکوع اور سجدہ پورا نہ کرے۔ ایک تو اس کا یہ پہلو ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے اس وعدے کا امیدوار اور مستحق بننا چاہیے اور اس کو اپنی نماز کو اس طرح بلا ٹالنے کے انداز میں نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو آدمی اس طرح رکوع اور سجدہ کر رہا ہے‘ وہ اس بات سے غافل ہے کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے اور کس سے بات چیت کر رہا ہے۔ جو آدمی اس سے غافل ہے کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے، کس سے بات چیت کر رہا ہے، اس کو اس نماز سے سوائے اس کے کہ فرض ادا ہو جائے کیا حاصل ہوگا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ کے دربار میں‘ آقا کے دربار میں حاضری ہے۔ جس کا سب کچھ دیا ہوا ہے، سارا اختیار اس کا ہے، میں پوری طرح اس کا محتاج ہوں‘ آدمی اس ہستی

کے سامنے آئے اور اتنی لاپروائی سے آئے کہ بیٹھنے بھی نہیں پائے کہ اٹھ کر چلا جائے۔ کسی آدمی سے آپ کی کوئی دنیا کی غرض وابستہ ہو اور آپ اس کے دفتر میں جا کر بیٹھیں تو جب تک آپ کا کام نہ ہو جائے آپ کرسی پر چپک جائیں گے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہم سب پیچھے دوڑتے ہیں، ایم این اے کو پکڑتے ہیں، ایم پی اے کو پکڑتے ہیں، دفتر جاتے ہیں، گھنٹوں باہر بیٹھے رہتے ہیں، اندر جا کر بیٹھتے ہیں، اٹھنے کو دل نہیں چاہتا کہ جب تک کہ یہ افسر بات کرتا رہے ہم چاہتے ہیں کہ ہم بیٹھے رہیں اور بات کرتے رہیں۔ جو آدمی اس طرح آتا ہے کہ آدھا جھکا، آدھا بیٹھا، کھڑا ہوا اور چلا گیا' اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو کوئی پروا نہیں ہے، اس کو کوئی اندازہ نہیں ہے، کوئی احساس نہیں ہے کہ وہ کس کے پاس آیا ہے؟ کس کے دربار میں ہے؟ کہاں کھڑا ہوا ہے؟

رکوع اور سجدے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ جس طرح جسم جھکتا ہے، اسی طرح دل بھی جھکتا ہے۔ جس طرح جسم سجدہ کرتا ہے، اسی طرح دل بھی سجدہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رکوع اور سجدے کا لفظ دونوں معنی کے اندر استعمال کیا ہے۔ جو سجدہ اور رکوع آدمی نماز میں کرتا ہے' اس کے لیے بھی اور جو دل کا رکوع اور سجدہ ہوتا ہے' اس کے لیے بھی فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مال دیتے ہیں فَقُلُوْبھُمْ راکِعُوْن ان کے دل رکوع کرتے ہیں۔ سجدے کے بارے میں فرمایا کہ سورج اور چاند اور ستارے سب سجدہ کرتے ہیں۔ یہ وہ سجدہ تو نہیں کرتے جو ہم پیشانی ٹیک کر کرتے ہیں لیکن سب اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔

تیسری شرط یہ بیان فرمائی کہ وَاَتَمَّ خُشُوْعَھُنَّ اپنے خشوع کو مکمل کر لیا۔ خشوع کے معنی پستی کے ہیں۔ آواز پست ہو جائے، نیچی ہو جائے، نگاہ جھک جائے، سر جھک جائے، یہ خشوع ہے۔ نماز کی اصل روح یہی ہے کہ آدمی پوری طرح پست ہو جائے، اللہ کا فقیر اور محتاج بن جائے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ (المومنون: ۲) ''وہ مومن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز کے اندر خشوع کرتے ہیں۔'' نماز لوگوں کے لیے بڑی بھاری اور گراں ہے سوائے ان کے جن کے اندر خشوع کی صفت ہو۔ یہ خشوع

کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ میں آپ کے سامنے تین چیزیں ایسی رکھ رہا ہوں جن پر اگر آپ عمل کرنے کی کوشش کریں تو اس سے نماز بھی بہتر ہوگی اور خشوع بھی اس کے اندر پیدا ہوگا۔ تین چار منٹ وقت تو زیادہ ضرور لگے گا لیکن یہ باتیں بڑی اہم ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں، آپ کو یاد ہونا چاہیے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ یہ بہت سارے جملے نہیں ہیں۔ اللّٰہ اکبر، اللہ بڑا ہے۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ، میرا رب بڑا عظیم ہے، اس طرح سے آپ کو معنی یاد ہونے چاہییں۔ یہ ضروری ہے کہ آدمی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے اللہ سے کیا بات کر رہا ہے۔ جب شراب پوری طرح منع نہیں ہوئی تھی، قرآن مجید نے یہ کہا کہ جب تم نشے کے عالم میں ہو تو نماز مت پڑھو" تا کہ تم جانو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کو خبر بھی نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو"۔ ہم میں سے اکثر لوگ تو اب ایسے نماز پڑھتے ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہم اللہ سے کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ شاید نشے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا نماز کا مفہوم تو آپ کو معلوم ہونا ہی چاہیے لیکن جب نماز میں آپ کی توجہ بھٹکنے لگے تو آپ ایسا کریں کہ زبان سے تو آپ عربی کے الفاظ کہیں اور دل میں آپ اردو کے الفاظ یا جس زبان کے الفاظ میں بھی آپ نے یاد کیا ہو دہرائیں۔ جس کو کہتے ہیں دل میں پڑھنا، یعنی آپ اپنی زبان سے عربی میں ہی کہیں لیکن دل میں مفہوم کو دہرائیں۔ اس طریقے سے آپ کی توجہ ان الفاظ کے اوپر مرکوز رہے گی۔

نماز اتنی قیمتی چیز ہے کہ شیطان سب سے پہلے اسی پر حملہ کرتا ہے۔ آپ نے نیت باندھی نہیں کہ دنیا کے سارے خیالات آپ کے ذہن میں آنے لگتے ہیں اور توجہ ہر طرف جاتی ہے۔ شیطان وسوسوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر نماز پر حملہ آور ہوتا ہے کہ آدمی نماز سے فائدہ نہ اٹھالے۔ وسوسے کے علاج کے سلسلے میں یہ سمجھ لیں کہ جتنا اس کو نکالنے کی کوشش کریں گے اتنا ہی وہ مضبوط ہوتا جائے گا۔ وسوسے کی غذا توجہ ہے۔ جتنا آپ توجہ دیں گے، ارے میرا ذہن تو بہک رہا ہے، گھر یاد آرہا ہے، مجھے یہ چیز یاد آرہی ہے، وہ آپ کو اور یاد آئے گی۔ لیکن آپ کسی دوسری چیز کو یاد کرنا شروع کر دیں گے تو خود بخود آپ کی توجہ اس سے

ہٹ جائے گی اور اس چیز پر آ جائے گی۔ دل کے اندر الفاظ کے معنی دہرا لیں، تو یہ ایک طریقہ ہے جس سے آپ نماز کو بہتر بنا سکتے ہیں اور اس میں خشوع پیدا کر سکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سمجھیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہے ہیں۔ حدیث میں بار بار کہا گیا ہے کہ جب آدمی نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ مناجات کہتے ہیں کسی کے بہت قریب ہونا۔ اردو میں اسے کہتے ہیں کانا پھوسی کرنا یعنی جس طرح آدمی بالکل قریب ہو کر کان میں بات کرتا ہے۔ جب بندہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے۔ اللہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔

فرمایا: نماز میں تھوکو مت۔ اس لیے کہ تم اللہ کے سامنے کھڑے ہو، تمھارے سامنے وہ موجود ہے۔ تو یہ احساس رہنا چاہیے کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ فَلْيَنْظُرْ كَيْفَ يُنَاجِيْ رَبَّهُ ''آدمی سوچے کہ میں اللہ سے کیسے بات کروں۔'' میرا دل کہاں ہے، میرا دماغ کہاں ہے، میری توجہ کہاں ہے اور میں اللہ سے بات کر رہا ہوں، کیسی بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی خیال کریں کہ جو آپ حرکت کر رہے ہیں' اس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ قُوْمُوْا، کھڑے ہو جاؤ، میں نے ہاتھ باندھ لیے۔ اس نے کہا ہے وَارْكَعُوْا، میں نے رکوع کر لیا ہے۔ اس نے کہا ہے وَاسْجُدُوْا، میں نے سجدہ کر لیا ہے۔ اس نے کہا ہے قرآن پڑھو' میں نے قرآن پڑھا۔ گویا اگر آپ یہ سمجھیں کہ اللہ آپ کے سامنے ہے، وہ آپ کو حکم دیتا جا رہا ہے اور آپ وہ کام کرتے جا رہے ہیں تو یہ ایسا طریقہ ہے جس سے آپ کی بات چیت اللہ کے ساتھ پوری نماز میں رہے گی۔

سورۃ الفاتحہ بھی بندے اور رب کے درمیان تقسیم ہے۔ آپ ایک آیت پڑھتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے، دوسری آیت پڑھتے ہیں تو اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ مکالمہ برابر جاری رہتا ہے۔ آپ کی توجّہ ہٹ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی آپ کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ یہ دوسری چیز ہے۔ ایک تو نماز کے معنی یاد ہوں۔ کچھ بھی آپ نہ کر سکیں، اللہ کی یاد نہ آئے، دل متوجہ نہ ہو تو کم سے کم دل کے اندر نماز کے معنی دہراتے جائیں۔ دوسری

بات یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ اللہ کے سامنے اس کے حکم کی تعمیل میں کھڑے ہیں۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم - اس نے کہا سبّحِ اسْمَ رَبِّکَ الاعلیٰ میں نے کہا سُبْحَانَ رَبِّیَ الاعْلیٰ ۔ اس نے کہا: فَکَبِّر ، میں نے کہا: اللّٰہ اکبر ۔تو جو اس نے کہا میں اس کی تعمیل کرتا چلا گیا۔ تو اس طرح آپ کے اعضا کا، زبان کا، اللہ کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے۔

تیسری بات بھی ایک حدیث میں کہی گئی ہے۔ ایک آدمی نے آ کر نبیؐ سے پوچھا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپؐ نے بڑی مختصر نصیحت کی۔ آپؐ نے تین باتیں فرمائیں۔ اس میں سے ایک بات یہ تھی کہ جب تم نماز پڑھو تو ایسی نماز پڑھو گویا تم دنیا سے رخصت ہو رہے ہو یا دنیا کو تم نے رخصت کر دیا۔ کوئی نماز تو آپ کی آخری نماز ہوگی۔ یہ آپ جمعہ کی نماز پڑھ رہے ہیں، کس کو معلوم ہے کہ اس کے بعد آپ کو عصر پڑھنی نصیب ہوگی یا نہیں۔ موت تو کبھی ضرور آنی ہے اور کسی نہ کسی نماز کے بعد آنی ہے۔ یہ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ کس نماز کے بعد آنی ہے۔ تو آپ نماز میں اگر یہ سوچیں کہ یہ میری آخری نماز ہے' اس کے بعد نماز پڑھنا نہ ملے گا۔ یہ آخری اللہ کے دربار میں حاضری ہے، جتنا چاہوں رو دھولوں، جتنا چاہوں مانگ لوں۔ جتنا چاہوں بندگی کا اقرار کرلوں، یہ آخری موقع ہے، تو یہ بات بھی آپ کی نماز میں خشوع پیدا کرے گی۔

یہ تین باتیں ہیں اور ان میں سے ہر بات پہلی سے زیادہ مشکل ہے۔ سب سے آسان تو یہ ہے کہ آپ ترجمہ یاد کرلیں اور دل میں دہراتے جائیں۔ دوسری یہ کہ خیال رکھیں کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں' اس سے بات چیت ہو رہی ہے' اس کے حکم کی تعمیل میں ہر کام ہو رہا ہے۔ اور تیسری یہ کہ آدمی یہ سوچے کہ شاید یہ میرے آخری لمحات ہوں اور اس کے بعد کوئی دوسری نماز مجھے پڑھنا نصیب نہ ہو۔ میں اس کو اس طرح پڑھوں کہ گویا دنیا کو میں نے رخصت کر دیا ہے۔ بال بچے ، مال و دولت ، اسباب کاروبار، نوکری ان سب سے اب میں چھوٹ چکا ہوں۔ اس کے بعد اب اللہ کی طرف جانا ہے۔

نماز اللہ سے ملاقات ہے۔ اللہ کے دربار میں حاضری ہے۔ موت کے بعد جو بڑی

حاضری ہونے والی ہے' اس سے پہلے یہ حاضری ہے۔ پانچ وقت اللہ نے اپنے دربار میں بلایا ہے۔ اس کا موقع دیا ہے۔ نہ اپائنٹمنٹ کی ضرورت ہے، نہ ٹیلی فون کی ضرورت ہے، نہ سفارشوں کی ضرورت ہے۔ وہ رب العالمین ہے، ربّ کائنات ہے۔ جب چاہے آپ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں' وہ آپ کے استقبال کے لیے موجود ہے، آپ سے بات چیت کرنے کو تیار ہے۔ جو بات کہیں، وہ سنے گا۔ اس کا جواب دے گا۔ جو مانگیں وہ آپ کو دینے کو تیار ہے۔ یہ ساری نعمتیں دن میں پانچ وقت ہوتی ہیں۔ ان کو ہم اس لیے ضائع کرتے ہیں کہ ہم نے نماز کو ایک عادت اور رسم بنا لیا ہے۔ رسم کے طور پر پڑھ لیتے ہیں اور وہ فائدہ اس سے نہیں اٹھاتے جو اٹھا سکتے ہیں۔ آپ کوشش اور نیت کریں کہ اپنی نمازوں کو بہتر بنائیں گے، ان کے اندر خشوع پیدا کریں گے، رکوع و سجدہ مکمل کریں گے اور وضو کے اندر پاکیزگی کی فکر کریں گے۔

حج اور قربانی

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُالرَّحْمٰنِ قَالَ ثَنَا سُفْیَانُ عَنْ قَیْسٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ قَالَتِ الْیَهُوْدُ لِعُمَرَ اِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ اٰیَةً لَوْ نَزَلَتْ فِیْنَا لَاتَّخَذْنَاهَا عِیْدًا فَقَالَ عُمَرُ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ حَیْثُ اُنْزِلَتْ وَاَیْنَ اُنْزِلَتْ وَاَیْنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حِیْنَ اُنْزِلَتْ یَوْمُ عَرَفَةَ اِنَّا وَاللّٰهِ بِعَرَفَةَ قَالَ سُفْیَانُ وَاَشُكُّ كَانَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ اَمْ لَا اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ ۔

(بخاری، جلد ۲، کتاب التفسیر، سورۃ المائدہ، ص ۶۶۲)

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے جو یہودیوں میں سے تھا، اُن سے کہا: یا امیر المومنین! ایک آیت آپ کی کتاب میں ایسی ہے کہ اگر یہ آیت ہم یہودیوں کے اوپر نازل ہوتی تو ہم اُس دن کو اپنے لیے عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم اُس دن کو اور اس جگہ کو بھی جانتے ہیں جہاں یہ آیت نبی کریمؐ کے اوپر اتری تھی۔ آپ اُس وقت میدان عرفات میں کھڑے ہوئے تھے۔ جمعے کا دن تھا۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۵:۳)

"آج کے دن میں نے تمھارے لیے، تمھارے دین کو مکمل کر دیا، تمھارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔"

عید الاضحیٰ اور حج بیت اللہ کی مناسبت سے ایک حدیث میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے جو یہودیوں میں سے تھا،

اُن سے کہا: یا امیر المومنین! ایک آیت آپ کی کتاب میں ایسی ہے کہ اگر یہ آیت ہم یہودیوں کے اوپر نازل ہوتی تو ہم اُس دن کو اپنے لیے عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: وہ کون سی آیت ہے؟ یہودی نے کہا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدة: ۳) ''آج کے دن میں نے تمھارے لیے، تمھارے دین کو مکمل کر دیا، تمھارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم اُس دن کو اور اس جگہ کو ابھی جانتے ہیں جہاں یہ آیت نبی کریمؐ کے اوپر اتری تھی۔ آپ اُس وقت میدان عرفات میں کھڑے ہوئے تھے۔ جمعے کا دن تھا۔

اس روایت میں حضرت عمر ابن الخطابؓ اور ایک یہودی کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ آیت جو آپ کے قرآن میں نازل ہوئی ہے، جس میں دین کو کامل کرنے کا اور نعمت کے اتمام کا اور اسلام کو دین بنا دینے کے احسان کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو عید کے طور پر مناتے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ اس آیت کا نزول ہمارے لیے یومِ عید ہے۔ یہ آیت جب نازل ہوئی تو وہ عرفہ کا دن تھا۔ لوگ میدانِ عرفات میں جمع تھے، جمعے کا دن تھا اور نبیؐ لوگوں کے سامنے کھڑے تھے۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو بلکہ یہ تو ہمارے ہاں پہلے ہی سے عید کا دن ہے۔

اسے ہم عید قرباں کے طور پر مناتے ہیں۔ اس عید کے دن میں اللہ تعالیٰ کے احسان پر شکر کی ادائیگی بھی شامل ہے کہ اُس نے ہمارے اوپر ہمارے دین کو مکمل فرمایا، ہدایت کی نعمت، اپنی سب سے بڑی نعمت، ہمیں عطا فرمائی اور ہمارے لیے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند فرمایا۔ عید کا دن جشن کا اور خوشی اور مسرت کا دن ہے۔

نبی کریمؐ نے مسلمانوں کی عید کے لیے دو ہی دن پسند فرمائے ہیں۔ ایک عید الفطر کا دن اور دوسرا عید الاضحیٰ کا دن۔ ایک وہ عید جو رمضان المبارک کے اختتام پر منائی جاتی ہے،

جبکہ لوگ ایک مہینے کے روزے رکھ کر فارغ ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ عید جو حج کے اگلے دن منائی جاتی ہے جب سارے حاجی منیٰ میں قربانی کرتے ہیں اور اس سے ایک دن پہلے عرفات کے میدان میں جمع ہو کر اپنے حج کو مکمل کرتے ہیں۔ ساری مسلم دنیا جو حج کے لیے حاضر نہیں ہوتی' وہ اِسی عرفہ کے اگلے دن یومِ عید مناتی ہے۔

تہوار اور عید کا دن کسی قوم کے لیے جشن اور خوشی کا دن اس لیے ہوتا ہے کہ اُس دن ان کی زندگی یا قوم کی تاریخ میں کوئی ایسا دن آیا ہوتا ہے جس کے ساتھ اُن کی قوم کا، تاریخ کا، اللہ تعالیٰ کے احسانات کا رشتہ بندھا ہوا ہوتا ہے۔ عیسائی، ان کی دانست میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا جو دن ہے' اسے اپنے لیے یومِ عید سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی صورت میں اپنی مرضی اور خود اپنے آپ کو انسانوں کے سامنے ظاہر کیا۔ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے سے ان کی بخشش اور نجات ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ اس واقعے کے غلط ہونے کے باوجود' اُن کی قومی اور دینی زندگی اسی واقعے سے وابستہ ہے۔ اس لیے وہ کرسمس کو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا دن تصور کر کے عید کے طور پر مناتے ہیں۔

یہودی اُس دن عید مناتے ہیں جس دن اللہ تعالیٰ نے اُن کو فرعون سے نجات دی، دریائے نیل کو پھاڑ دیا اور فرعون سے نجات دے کر فتح سے ہمکنار کیا۔ اُن کی قومی زندگی میں یہ دن اللہ کی بشارت، اللہ کے انعامات اور اللہ کے احسان کے لیے یادگار دن ہے کہ اس دن اُس نے اُن کو فرعون کی غلامی سے نجات دی اور فلسطین کی حکومت ان کو عطا کی۔ دیگر قوموں نے اپنے جشن اور عید کو تہواروں اور سال کے موسموں سے باندھ رکھا ہے۔ جب موسم سرما کی سرد راتیں ختم ہو جاتی ہیں اور بہار کی پہلی کونپل پھوٹتی ہے تو کہیں نوروز کا جشن منایا جاتا ہے، کہیں بسنت کا جشن منایا جاتا ہے۔ کہیں فصل کی کٹائی کے دن کو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہوتا ہے' عید کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی قومیں طرح طرح کے جشن مناتی ہیں۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عید کے دونوں دنوں کو قرآن

مجید اور ہدایت کی نعمت کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ قرآن مجید کے نزول کا مہینہ ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرۃ:۱۸۵) ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا''۔ جس میں روشنی بھی ہے، رہنمائی بھی ہے اور سارے انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ آگے چل کر اس عظیم نعمت کے اظہار تشکر کے طور پر فرمایا: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۸۵) '' تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکرگزار بنو''۔ چنانچہ عیدالفطر کا دن نزول قرآن کی سالگرہ کا جشن ہے جو ایک مہینے کے روزوں کے بعد دنیا بھر کے مسلمان مناتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج اور قربانی کا پورا نظام بہت قدیم اور پرانا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ لوگوں کو حج کے لیے پکارو۔ لوگ حج کے لیے آئے اور عرفات کے میدان میں اللہ کے حضور میں حاضر تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس احسان کا اعلان فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل یہ دوسری عید ہدایت کے مکمل ہونے کا جشن بھی ہے۔ اس میں اسوۂ ابراہیمی کی پیروی، حج کے مناسک کی ادائیگی اور قربانی کے ساتھ ساتھ جو چیز مسلمانوں کے لیے خاص طور پر شامل ہے، وہ یہ کہ اس عید سے ایک دن پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ فرمان نازل فرمایا اور اپنے اس احسان کو مکمل کرنے کا اعلان فرمایا کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ تم کو بتا دیا گیا ہے، جس سے دنیا کے اندر کامیابی، فلاح اور ترقی تمھارے حصے میں آئے گی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام اور اجر اس کی خوشنودی اور رضا تمھیں ملے گی۔ اس بات کا اعلان اللہ تعالیٰ نے اُس عید سے، جسے ہم عید الاضحیٰ یا قربانی کی عید کہتے ہیں، ایک دن پہلے عرفات کے میدان میں فرمایا۔

آپ غور کریں کہ دونوں عیدوں کا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

رمضان کے سارے روزے تو اسی لیے ہیں کہ ہم اللہ کی ہدایت سے واقف ہوں، اُس ہدایت کو سنیں، اس کو پڑھیں، تقویٰ کی کیفیت ہمارے اندر پیدا ہو اور ہمیں اپنے اوپر اتنا ضبط اور ڈسپلن حاصل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے روکا ہے، اُس چیز سے رک جائیں۔ اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے کے لیے، اللہ کی شریعت کی جو امانت ہمارے پاس ہے، اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس کردار کی، جس انسان کی ضرورت ہے، وہی رمضان المبارک کے ۳۰ دنوں کے روزوں کے اندر بنایا جاتا ہے۔

بقرعید کی تقریب اور جشن اس ہدایت کے بالکل ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ پہلو یہ ہے کہ یہ ہدایت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے ماننے والے اپنی شخصیت کی مکمل تعمیر کے لیے اور اپنے دین پر مکمل طور پر عمل کرنے کے لیے، قربانی دینے کو تیار ہوں۔

حج کی پوری عبادت صرف دو چیزوں سے مرکب ہے: ایک قربانی، دوسرے حرکت واجتماع۔ قربانی تو آدمی یہ دیتا ہے کہ اپنے گھر بار کو، اور اعزہ واقربا کو چھوڑ کر نکلتا ہے۔ آج تو سفر آسان ہے لیکن پہلے وہ دور دراز کا سفر اختیار کرتا تھا۔ اس راہ میں خطرات بھی ہوتے تھے۔ مہینوں اُس کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ گھر پر کیا گزر رہی ہے، نہ کوئی ڈاک کا نظام تھا، نہ تار کا اور نہ کوئی اور نظام تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی آمدنی اور کمائی کے ذریعے کو بھی وہ قربان کرتا تھا۔ مال کی، وقت کی، رشتوں کی، تعلقات کی سب کی قربانی دے کر وہ حج پر جاتا تھا۔

حج کی عبادت میں سب سے بڑی چیز اور اس کا رکنِ اعظم نویں ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں پہنچ جانا اور وہاں چند سیکنڈ، چند منٹ یا چند گھنٹے قیام کرنا ہے۔ اس رکن کے بغیر حج مکمل نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ چھوٹ جائے تو اس کی کوئی تلافی نہیں ہے۔ حج میں کوئی اور خامی ہو جائے، کوئی ترتیب بدل جائے، کوئی خرابی ہو جائے، آپ پتھر نہ پھینک سکیں، قربانی نہ کر سکیں، ان سب کے لیے تو قضا ہو سکتی ہے یا دم دے کر تلافی ہو سکتی ہے لیکن اگر نویں تاریخ کو آدمی

عرفات کے میدان میں حاضر نہ ہو تو پھر سوائے اس کے کوئی تلافی نہیں ہے کہ اگلے سال پھر نویں تاریخ کو اُسی میدان میں پہنچے۔ حج میں کچھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ نماز میں قرأت ضروری ہے، تسبیح ضروری ہے، تکبیر ضروری ہے لیکن حج میں کچھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ روزے کی طرح اس میں بھوکا پیاسا رہنا ضروری نہیں ہے۔ سفر خرچ اور قربانی کے علاوہ زکوٰۃ کی طرح کچھ اور بھی جیب سے نکالنا ضروری نہیں ہے۔ زبان سے کوئی کلمات کہنا بھی ضروری نہیں ہے۔ آدمی کوئی دعا مانگے یا نہ مانگے، تسبیح و تکبیر پڑھے یا نہ پڑھے لیکن گھر سے نکل کر وہ بیت اللہ میں حاضر ہو کر طواف کرے، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے اور میدانِ عرفات کے اندر حاضر ہو جائے۔ منیٰ میں بھی تین دن ٹھہرنا ضروری نہیں ہے۔ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۗ (البقرۃ:۲۰۳) ''پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ دن اس نے تقوے کے ساتھ بسر کیے ہوں''۔ اگر آدمی بالکل خاموش رہے، طواف کر لے، سعی کر لے، عرفات کے میدان میں پہنچ جائے، اس کا حج بالکل مکمل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ضروری نہیں ہے۔ اعضا کو کسی قسم کی حرکت دینا ضروری نہیں ہے' سوائے اس کے کہ آدمی حرکت کرے، اپنی جگہ سے ہلے، سفر کرے اور ایک میدان میں پہنچ کر وہاں جمع ہو جائے۔ آپ غور کریں تو حج کا خلاصہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ آدمی قربانی کرتا ہے، اس موقع پر حاجی پتھر بھی مارتا ہے، منیٰ کے میدان میں قیام بھی کرتا ہے، بیت اللہ کا طواف بھی کرتا ہے، ان سب میں حرکت، سفر اور قیام یہ اس سارے حج کے ارکان کا خلاصہ ہے جو نکال کر پیش کیا جا سکتا ہے۔

حج دراصل اس بات کا جشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو، اپنی ہدایت کی نعمت کو، قرآن مجید کو مکمل فرما دیا۔ اپنی سب سے بڑی نعمت ہمارے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس حج کے ساتھ جو عید ہے وہ قربانی کا جذبہ پروان چڑھانے کے لیے ہے۔ رمضان کا جشن تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ تھا کہ جس کے بغیر قرآن مجید کا حق ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ عید قربانی کی عید ہے۔ ہماری زبان میں اس کا نام ہی عید قربان ہے۔

حج کی عبادت اُسی پر فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو اور عمر میں ایک دفعہ فرض ہے۔ شروع سے آخر تک یہ عبادت قربانی، حرکت، سفر، قیام اور وقوف کے اوپر مبنی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ دین اس لیے آیا ہے کہ ایک طرف تو آدمی کو اپنے اوپر کنٹرول اور ضبط نفس حاصل ہو اور وہ اپنے نفس کو اپنے قابو میں رکھ سکتا ہو۔ اگر وہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک اللہ کے حکم سے ہر اُس چیز سے اپنے آپ کو روک سکتا ہے جو حلال بھی ہے تو باقی زندگی میں وہ اُس چیز سے بھی اپنے آپ کو روک لے جو حرام ہے۔ مال حرام نہ کھائے، کسی کا حق نہ مارے۔ لیکن عید قربان جو دراصل قربانی کی عید ہے' آدمی کو اس بات کے لیے تیار کرتی ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلے، اس راہ میں اپنا وقت بھی دے، اپنا مال بھی خرچ کرے، سفر بھی کرے اور اللہ کی راہ میں نکل کے اُس سے اپنی محبت اور اپنے عشق کا اظہار بھی کرے۔ اس بات کی علامت کے طور پر کہ دنیا کو اُس نے بالکل چھوڑ دیا ہے' اپنے کپڑے اتار کر دو سفید چادریں پہن لے۔ وہ اللہ کی راہ میں نکلا ہے تو اُس نے وہ لباس پہن لیا جو اللہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے وہ موت کے وقت پہنے گا۔ اُسی لباس کو پہنے ہوئے وہ دیوانہ وار اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، اُس کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا ہے، اُس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس گھر میں قیام نہیں فرماتا اس لیے کہ وہ اس طرح کا بیت اللہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وہیں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے، یہاں بھی موجود ہے، اس وقت بھی ہے۔ جہاں بھی آپ ہیں وہاں آپ کے ساتھ ہے۔ لیکن اُس نے اُس گھر کو اپنے نام سے موسوم کر لیا ہے' اسی لیے وہ اُس کا گھر کہلایا۔ اس لیے آدمی اُس پتھروں کے گھر سے، جس کے اندر فنِ تعمیر کی کوئی حسن نہیں ہے، نہ اُس کے اندر کوئی گنبد ہے، نہ کوئی مینار بنے ہوئے ہیں، نہ اس کی دیواریں اور عمارتیں بڑی شاندار ہیں، وہ تو پتھر اور گارے کا گھر ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سے نسبت دے لی ہے، اس لیے آدمی اس کے چکر لگاتا ہے۔

ایمان کی حقیقت کا مزہ تو اس کو حاصل ہوتا ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کرے۔ جب محبت ہو جائے تو محبوب کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ

حجرِ اسود میرا دست ہے، میرا ہاتھ ہے، تو آدمی جا کر اُس کو چومتا ہے۔ اس گھر کو اُس نے کہا ہے کہ میرا گھر ہے تو آدمی اُس کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے، کچھ نہیں پڑھتا، بس اُس کے گرد دیوانہ وار چکر لگاتا رہتا ہے۔ بوڑھے ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، عورتیں ہوتی ہیں، بچے ہوتے ہیں، کالے ہوتے ہیں، گورے ہوتے ہیں، پیلے ہوتے ہیں، ہزاروں قدم ہیں جو اس گھر کے چاروں طرف گردش میں رہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ نسبت دے دی ہے۔

وہاں پر دو پہاڑیاں ہیں۔ بظاہر تو چھوٹی سی پہاڑیاں ہیں۔ اُن کے اندر بھی کوئی حسن نہیں ہے۔ اُن کا سارا حسن اس وجہ سے ہے کہ اللہ کی ایک بندی نے' ایسی حالت میں جب بظاہر کوئی سہارا اور کوئی آسرا نہیں تھا' اللہ کے اوپر بھروسا کیا اور بے چینی اور اضطراب کے ساتھ، اُس پہاڑی سے اِس پہاڑی پر اور اِس پہاڑی سے اُس پہاڑی پر چکر لگاتی رہیں۔ (رضی اللہ عنہا)۔ ان ہی کی سنت کی پیروی میں دو پہاڑیوں کے درمیان چکر ہو گیا جو اس بات کی علامت ہے کہ دین کے اندر اصل چیز تو کوشش ہے، اس کا نام سعی ہے۔ سعی کے معنی ہی کوشش کے ہیں۔ لہٰذا اصل چیز تو کوشش ہے، اللہ کی راہ میں قدم اٹھانا ہے، اللہ کی راہ میں چلنا ہے، اللہ کے اوپر بھروسا کرنا ہے۔ جو اللہ پر بھروسا کرے گا، اللہ کی راہ میں نکلے گا، اللہ کی راہ میں چلے گا تو ہوسکتا ہے جہاں کہیں دُور دُور پانی کا نشان نہ ہو' انسان کا نام و نشان نہ ہو' کوئی غذا کا بندوبست نہ ہو' ایک تنہا عورت اور ایک شیر خوار بچہ ہو تو اللہ ایک بچے کے پاؤں کی ٹھوکر سے بھی پانی کا چشمہ نکال سکتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

سعی کی پوری عبادت یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف کلمات کا دہرانا مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ مطلوب ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں قدم اُٹھائے، اس کی راہ میں نکلے، اس کی راہ میں چلے، اس پر بھروسا رکھے، اُس سے محبت کرے اور جو اُس نے مقرر کر دیا، خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے کہ ان پہاڑیوں کے درمیان چکر لگانے کا کیا فلسفہ ہے، ان کی کیا حکمت ہے، لیکن آدمی اللہ کے حکم کی خاطر چکر لگائے، اِدھر سے اُدھر جائے، اُدھر سے اِدھر آئے اور سات چکر

مکمل کرے۔ اس طرح سعی کی عبادت مکمل ہو جاتی ہے۔ پھر احرام باندھے اور تین میل کے فاصلے پر منیٰ کی طرف جائے، قیام کرے، پھر اٹھے اور عرفات میں ڈیرے ڈالے، عرفات سے واپس آئے، مزدلفہ میں ڈیرے ڈالے، وہاں سے واپس آئے، پھر منیٰ میں ڈیرے ڈالے، اور پھر جا کر ایک دفعہ طواف کر کے آ جائے، تو اس کا حج مکمل ہو گیا۔

اس ساری عبادت کے اندر سوائے کوشش کے، محبت کے، محنت کے، بھاگ دوڑ کے، سفر کے، قربانی کے کچھ نہیں ہے۔ چاہیے کہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو جائے، اس کی ایک ایک عبادت سے، ایک ایک نشان سے دیوانہ وار محبت کرے، اُس سے چمٹے، اس کو پیار کرے، چومے۔ اس کے علاوہ اس عبادت کے اندر کچھ نہیں ہے۔ اسی بات کی تربیت کے لیے عرفات کے میدان میں نبی کریمؐ پر یہ آیت نازل ہوئی جس کے بارے میں یہودی نے حضرت عمر فاروقؓ سے آ کر یہ کہا کہ تمھارے پاس تمھاری کتاب میں ایک آیت ہے جس کو تم پڑھتے ہو۔ اگر یہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو یومِ عید بنا لیتے، اس دن جشن مناتے، خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے، اچھے کپڑے پہنتے، کھانے کھاتے، یہ تو ہمارا جشن کا دن بن جاتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ آیت کس دن نازل ہوئی اور وہ دن تو ہمارے لیے پہلے ہی سے عید کا دن ہے۔ یہ آیت تو عرفات کی جگہ، جمعے کے دن جب حضور اکرمؐ اپنے آخری حج کے موقع پر وہاں کھڑے ہوئے تھے اُس وقت آپؐ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اُس دن اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا اور اس کا اگلا دن عید کا دن قرار پایا۔

یہ اسوۂ ابراہیمیؑ کی یاد میں تو ضرور ہے لیکن اصل بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے' یہ ہے کہ یہ اس آیت کے نزول کا بھی جشن ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ہزاروں معبودوں کی چوکھٹ پر سر رکھتے، اُن کے غلام ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے وہ دین پسند کیا جس میں صرف ایک ہی کے لیے سجدہ ہے، ایک ہی کے لیے بندگی ہے اور ایک ہی کے لیے غلامی ہے۔ اُس کا ہم پر یہ احسان ہے اور اس احسان کا جشن یہ عید ہے۔ اس احسان کا حق ادا کرنے کے لیے

قربانی کا جذبہ ضروری ہے۔ حاجی گھر سے نکل کر، سفر کر کے، بیت اللہ میں حاضر ہو کر، اللہ کے در پر ہاتھ پھیلا کر، منیٰ اور عرفات میں سفر کر کے، پتھر مار کر، قربانی کر کے اپنے اس قربانی کے پورے جذبے کا اظہار کرتا ہے۔ جب کہ دنیا بھر کے مسلمان' جس جگہ بھی ہوں' جس کی استطاعت ہوتی ہے ایک جانور کی قربانی دے کر اسی جذبے کا اظہار کرتا ہے جس کی استطاعت نہیں ہوتی وہ نہیں دے پاتا' لیکن سب لوگ جشن مناتے ہیں اور دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔

یہ سب سے پہلے اس بات کا جشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنا مکمل دین عنایت فرمایا۔ اس دین کے تقاضے پورا کرنے کے لیے قربانی کا یہ جذبہ ضروری ہے۔ یہ دین صرف اسی بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ہم رمضان کی راتوں میں کھڑے ہو جائیں، ہاتھ باندھ کر قرآن مجید کی تلاوت کریں، بھوکے پیاسے رہیں، رہبانیت اختیار کریں اور اپنے نفس کو اپنے قابو میں کریں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی تکمیل اس طرح ہوسکتی ہے کہ اس کے ماننے والے اللہ کی راہ میں نکلیں، اپنا وقت دیں، اپنا مال دیں، اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کو پیاری ہیں' ان سے والہانہ محبت کریں۔ پتھروں کا گھر خانہ کعبہ اس کو پیارا ہے، صفا و مروہ کی پہاڑیاں اس لیے اس کو محبوب ہیں کہ حضرت ہاجرہؓ نے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس کے گرد چکر لگائے، عرفات کا میدان اس کو اس لیے محبوب ہے کہ لاکھوں بندے اس میں جمع ہو کر اس کے حضور گڑگڑاتے اور روتے ہیں، لیکن اس کو سب سے بڑھ کر محبوب تو اس کا دین ہے جو اس نے ہم کو عنایت فرمایا ہے، اس کی کتاب ہے جو اس نے ہم کو عنایت فرمائی ہے۔ اس کتاب کا نزول بھی جشنِ عید ہے اور اس کا مکمل ہونا بھی عید ہے۔ یہ وہ جشنِ عید ہے جس کے لیے ہم کو اپنے اندر قربانی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

اس عید کو اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام کے ساتھ باندھ کے اللہ تعالیٰ نے ہم کو کئی چیزوں کی تعلیم دی ہے۔ سب سے بڑھ کر ہم کو توحید کی تعلیم دی ہے کہ اللہ کی ایسی بندگی کی جائے جس میں کوئی اس کا شریک نہ ہو۔

اللہ کی راہ میں قربانی، رشتوں کی قربانی، وطن کی قربانی، مال کی قربانی ہر چیز کی قربانی کا اسوہ اگر کوئی ہے تو وہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ ہے۔ باپ کو ترک کر دیا، وعدہ کیا کہ میں آپ کے لیے استغفار کروں گا، مغفرت مانگوں گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ مشرک کے لیے استغفار نہیں ہوسکتا' اُس سے بھی رک گئے۔ اپنے وطن میں وہاں کے سب سے بڑے پجاری کے بیٹے تھے، سب سے بڑے پیر کی گدی اُن کے لیے مخصوص تھی، اگر اُس گدی پر بیٹھتے تو اپنی قوم کے پیشوا ہوتے، مذہبی دینی سردار ہوتے، بتوں کی پوجا کرتے تو لاکھوں کا مال پوجا پاٹ کی صورت میں ان کے قدموں میں نچھاور ہوتا مگر اس سب کو چھوڑ دیا۔ آگ میں ڈالے گئے تو اُس میں کود گئے اور اس میں بھی انھوں نے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ گھر چھوڑنا پڑا تو گھر چھوڑ کر نکل گئے اور فلسطین، شام اور مصر کے صحرا میں اور جنگل میں دربدر مارے مارے پھرے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے شیر خوار بچے اور بیوی کو وہاں پر چھوڑ آؤ جہاں اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے گھر کی بنیادیں موجود ہیں۔ تو بلا چون و چرا اپنے بچے اور بیوی کو وہاں چھوڑ آئے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (اٰل عمرٰن:۹۶) ”بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔“ اس کے بعد جب آخر میں یہ حکم ہوا کہ وہ بچہ جو بارہ تیرہ سال کا ہو گیا تھا، چلنے پھرنے کے لائق ہو گیا تھا فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ اس کو ذبح کر دو۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ ”میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں' اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ o (الصّٰفّٰت:۱۰۲) اس نے کہا: ”ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“ آخر کار جب دونوں نے اللہ کے آگے اپنے آپ کو ڈال دیا، اور باپ نے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بس اب امتحان مکمل ہو گیا اور ندا آئی کہ ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (البقرۃ: ۱۲۴) "یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"۔

آپ آج دنیا کے اندر عیسائیوں کی، مسلمانوں کی اور یہودیوں کی آبادی شمار کریں، یہ دیکھیں کہ اُن کے پاس کتنے وسائل ہیں، کتنا اقتدار ہے۔ یہ سب کے سب حضرت ابراہیمؑ کو اپنا جدِّامجد مانتے ہیں۔ سب کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہیں۔ کوئی بھی ان کے نام سے انکار نہیں کرتا۔ اگر کچھ لوگوں کی یہ تحقیق تسلیم کی جائے کہ برہمن کا لفظ بھی دراصل ابراہیمؑ سے نکلا ہے، اس لیے کہ ب، ر، ہ اور م کا بھی وہی مادہ ہے جس سے یہ لفظ نکلا ہے تو یہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی شاید اپنا سلسلہ وہیں تک جا کر پہنچائیں گے۔ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے دین کو قائم فرمایا تھا اور اللہ کا یہ وعدہ کہ میں تم کو لوگوں کا قائد بناؤں گا' ان کے حق میں پورا ہوا۔ لیکن جب حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا کہ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ "کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (البقرۃ: ۱۲۴) "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے"۔ گویا وہ اعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ نسل اور نسب میں منتقل نہیں ہوگا۔ یہ کسی لیبل کے ساتھ نہیں ہے کہ ابراہیمیؑ لیبل لگا لیا، محمدیؐ کا لیبل لگا لیا، موسیٰؑ کا لیبل لگا لیا، عیسیٰؑ کا لیبل لگا لیا تو اللہ تعالیٰ کشتی پار لگا دے گا۔ جو لوگ ظلم کی روش پر چلیں گے' ان کے ساتھ میرا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ یہ تو اُن کے ساتھ ہے جو ایمان اور اسلام کی روش پر چلیں گے۔

یہ عید قرباں اللہ تعالیٰ کے دین کے مکمل ہونے کا جشن بھی ہے۔ اسوۂ ابراہیمیؑ ہی تمھارے لیے اسوہ ہونا چاہیے۔ اس اسوے کا جو پہلو ہمیشہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے وہ ایک طرف تو قربانی ہے، جان کی قربانی، مال کی قربانی، اللہ کی راہ میں نکلنا، اُس کی راہ میں کوشش کرنا، اس کی راہ میں مال دینا۔ یہ قربانی حاجی بھی کرتا ہے اور قربانی دینے والا بھی کرتا ہے۔

اگر روزہ تقویٰ پیدا کرتا ہے، اللہ کی بندگی کرواتا ہے، راتوں کو کھڑا رکھتا ہے، تو حج گھر سے نکال دیتا ہے۔ قربانی تو اس بات کی تربیت دیتی ہے کہ گھر سے نکلو، سفر کرو، جاؤ کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کا جو دین مکمل ہوا ہے، وہ نافذ نہیں ہوسکتا۔ اسوہ ابراہیمیؑ دراصل توحید کی علامت ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ گناہ تو آدمی سے ہوتے ہیں، قربانی کے اندر کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں لیکن زندگی کا رخ بس ایک ہی رہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے توحید کو پایا۔ ستارے ڈوب گئے، چاند ڈوب گیا، سورج ڈوب گیا۔ فرمایا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (الانعام ۶:۷۶) ''کہ ڈوبنے والی چیزیں میری زندگی کا مقصود نہیں بن سکتیں۔ جو چیزیں ڈوب جاتی ہیں، ختم ہو جاتی ہیں، وہ قبلہ نہیں بن سکتیں، زندگی کا مطلوب نہیں ہوسکتیں۔ ان سب چیزوں سے مبرا ہو کر انھوں نے اعلان کیا:

اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام ۶:۷۹) ''میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کرلیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''۔

شرک یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کی بندگی میں کسی کو شریک کرے۔ شرک کے بہت سارے معنی اور پہلو ہیں۔ زندگی کا ایک قبلہ ہونا چاہیے، ایک رخ ہونا چاہیے، ایک مقصود ہونا چاہیے، ایک منزل ہونی چاہیے۔ یہ رخ، یہ قبلہ، مقصود دنیا کی کوئی چیز نہیں بن سکتی کہ اس میں سے ہر چیز ہلاک ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے، کچھ دیر بعد ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص ۲۸:۸۸) ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اللہ کے چہرے کے۔'' وہی بات جو ابراہیمؑ نے کی کہ جو ڈوبنے والے ہیں، میں اُن سے محبت نہیں کرسکتا۔ یہ قربانی کا سبق ہے، یہ ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' کا سبق ہے۔

عیدِ قرباں حج کے موقع پر اُس مقام پر منائی جاتی ہے جس کی طرف ہر نمازی قبلہ کے اندر رخ کرتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ پوری زندگی کا رخ اُس کی طرف ہونا چاہیے جو بیت الحرام کا رب اور مالک ہے۔ اِسی کے بعد آدمی قربانی دے سکتا ہے۔ جب بہت

سارے مقصود ہوں، بہت سارے محبوب ہوں، بہت سارے قبلے ہوں تو پھر آدمی وہ قربانی نہیں دے سکتا جو مطلوب ہے اور جس کے بغیر دین کے مکمل ہونے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

میرے بھائیو اور دوستو! اس کا یہ سبق ہے کہ اپنے اندر زندگی کا مقصد ٹھیک کریں اور اللہ کی راہ میں نکلیں اور قربانی دیں۔ یہی سبق ہے جو ہم کو یاد رکھنا چاہیے۔

دین آسان ہے

عَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ جُرْثُومِ بْنِ نَاشِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :

"اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا ' وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا ' وَحَرَّمَ أَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا ' وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَاءَ رَحْمَةً لَّكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔" (حَدِيْثٌ حَسَنٌ رَوَاهُ الدَّارقُطْنِيُّ وَغَيْرُهٗ)

حضرت ثعلبہ خشنی جرثوم بن ناشرؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کر دیے ہیں پس تم انھیں ضائع نہ کرو اور اللہ نے کچھ حدیں متعین کر دی ہیں پس ان حدوں سے آگے نہ بڑھو' کچھ چیزیں حرام ٹھہرا دی ہیں' تم انھیں استعمال نہ کرو' بعض چیزوں کے بارے میں تم پر رحم کرتے ہوئے اس نے خاموشی اختیار کی ہے اور وہ بھول نہیں گیا۔ پس ان کی جستجو نہ کیا کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستے پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے اور پوری قوموں اور ملکوں کو چلانے کے لیے کچھ بنیادی اصولوں کی تعلیم ہم کو دی ہے۔ ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ دین میں آسانی اور سہولت ہے۔ جو حدیث میں پیش کر رہا ہوں' اس میں بھی چند بڑے بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں۔ یہ دراصل نبی کریمؐ کا ایک خطبہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ: اے لوگو! تمھارے لیے راستے کے کچھ نشانات مقرر کر دیے گئے ہیں۔ راستے کے وہ نشانات آ جائیں تو رک جاؤ۔ تمھارے لیے ہر راستے کی ایک آخری

حد ہے اور جب تمھاری وہ حد آ جائے تو اس کے اوپر بھی رک جاؤ۔ بے شک اللہ نے کچھ فرائض کو لازم کردیا ہے' ان فرائض کو ضائع مت کرو اور کچھ چیزوں کو اس نے حرام کردیا ہے' ان کی حرمت کو پامال مت کرو' ان کو حلال مت کرو۔ اس نے کچھ حدود طے کردی ہیں' ان حدود سے آگے نہ بڑھو۔ کچھ معاملات میں وہ خاموش رہا ہے' اس لیے نہیں کہ وہ بھول گیا بلکہ تمھارے اوپر رحمت کے ارادے سے۔ اس کے بارے میں سوال مت کرو۔

حاکم نے اپنی مستدرک میں پورا خطبہ نقل کیا ہے۔ امام نوویؒ نے اپنی چالیس حدیثوں میں بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ تھوڑے سے مختلف ہیں۔ اس میں پہلے دو جملے نہیں ہیں' اور آخر میں یہ نہیں ہے کہ سوال مت کرو' بلکہ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا، اس کی کھود کرید میں مت پڑو۔ جن چیزوں کے بارے میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے خاموشی اختیار کی ہے اور اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ کہنا بھول گئے تھے بلکہ اس لیے اختیار کی ہے کہ تمھارے لیے رحمت اور وسعت پیش نظر ہے' اس کے بارے میں سوال کر کے اس راستے کو تنگ نہ کرو۔

اس حدیث پر اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہر بات الگ الگ دین اسلام کے کسی ایک پہلو کو واضح کرتی ہے۔ اسلام کی تشبیہ ایک راستے سے دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ قرآن مجید کی معروف تشبیہ ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اس کو صراط مستقیم کہا گیا ہے' یعنی یہ ایک سیدھا راستہ ہے۔ نبی کریمؐ نے کئی دفعہ اسلام کی مثال کبھی گھر سے دی' کبھی راستے سے دی۔ قرآن مجید نے بھی اللہ کے دین' اللہ کی اطاعت اور اللہ کی بندگی کو ایک راستے سے تعبیر کیا ہے۔ راستہ ایک سیدھی لکیر کی طرح کی چیز نہیں ہوتا کہ آدمی اس کے ساتھ سیدھا چلتا جائے بلکہ راستے کی بہت ساری قسمیں ہوتی ہیں۔ کبھی ایک لائن میں ٹریفک ہوتی ہے' کہیں دہری ٹریفک ہوتی ہے اور کہیں بہت ساری لائنیں ہوتی ہیں۔ راستے کے دونوں طرف کہیں سے کراسنگ ہوتی ہے' راستے پہ نشانات لگے ہوتے ہیں' ٹریفک کے سگنل بھی ہوتے ہیں' کہیں آدمی کو رکنا ہوتا ہے' کہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور بعض نشانات انتباہ کے لیے ہوتے ہیں۔ بعض نشانات کا پار کرنا غیر قانونی ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں حادثہ ہوسکتا ہے۔ بعض کے نتیجے میں جرمانہ ہوتا ہے۔

راستے کی مثال اور تشبیہ جو قرآن مجید نے اختیار کی ہے اور اس حدیث میں بھی ہے'

بڑی جامع اور سمجھانے والی تشبیہ ہے۔ اس لیے کہ راستے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشادہ راستہ ہے' انسان کو اس پر اپنا سفر طے کرنا ہے: اللہ کی بندگی کا سفر' اللہ کی اطاعت کا سفر' اللہ کے انعام اور اس کی جنت کی طرف کا سفر۔

آپؐ نے فرمایا: اے لوگو! تمھارے لیے کچھ نشان ہائے راہ ہیں۔ راستہ چلنے کے لیے اللہ نے کچھ نشانات مقرر کر دیئے ہیں جن سے تم اپنا راستہ پا سکتے ہو۔ نشانات کی حیثیت خود راستے کی نہیں ہوتی لیکن وہ علامت ہوتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ ہے' اگر یہ علامتیں ہیں تو اس راستے پہ چلنا چاہیے۔ ان سے آدمی ہٹ جائے تو پھر وہ اس راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ راستے کے نشانات سے مطلب وہ اصول ہیں جن سے آدمی یہ سمجھ لے کہ میں صحیح راستے پر ہوں۔ اس طرح کے بہت سے نشانات ہمارے ذہن میں ہوتے ہیں جن سے ہم راستہ پہچانتے اور یاد رکھتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ صحیح راستے پر چلیں اور اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ جہاں یہ راستے کی علامات آ جائیں تو ان علامات کے اوپر رک جاؤ۔ اگر تم نے ان کو عبور کر لیا تو راستے سے نکل جاؤ گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک حد ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ ایک کام کو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے بلکہ ہر چیز کی اور ہر راستے کی ایک حد ہے۔ اس آخری حد سے آگے آدمی نہ بڑھے۔ جب اللہ نے یہ کہہ دیا کہ اس سے آگے نہ بڑھو تو وہاں پر رک جاؤ اور اس سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض عائد کر دیے ہیں اور فرائض کو کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ یہ فرائض ہیں۔ لوگ آتے تھے' آپؐ سے سوال کرتے تھے' پوچھتے تھے' دین کس چیز کا نام ہے اور آپؐ ان فرائض کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ یہ فرائض اللہ کی طرف سے لازمی ہیں اور یہی فرائض ہیں جن کو پورا کرنا راستے پر چلنے کا نام ہے۔ یہاں ہدایت کی جا رہی ہے کہ ان فرائض کو ضائع مت کرو' ان کو نہ چھوڑو۔ اگر پانچ وقت کی نماز فرض ہے تو پانچ وقت کی نماز پڑھو۔ اگر مال پر زکوٰۃ آتی ہے تو زکوٰۃ دو۔ اگر حج فرض ہو جائے تو حج ادا کرو۔ اسی طرح بندوں کے حقوق اگر لازم آ جائیں تو ان کے حقوق ادا کرو۔

کچھ چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے۔ وَحَرَّمَ اَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا کا یہ لفظ

ھَتکٌ سے نکلا ہے۔ ھَتکٌ کے معنی کسی کی عزت کو پامال کرنا ہے۔ گویا جو اللہ کی محرمات ہیں ان کو پامال مت کرو۔ اگر اس نے زنا کو حرام کر دیا ہے' سود کو حرام کر دیا ہے' شراب کو حرام کر دیا ہے' اور کھانے پینے میں سور کا گوشت اور مردار خون اور غیر اللہ پر ذبح کو حرام کر دیا ہے تو ان حدود کو پامال مت کرو' ان کی پابندی کرو۔ کیونکہ اللہ نے جو حرمتیں قائم کر دی ہیں' ان حرمتوں کا پورا احترام ہونا چاہیے۔

بعض معاملات میں اللہ تعالیٰ نے حد فاصل قائم کر دی۔ راستے کے اندر بڑی گنجائش ہوتی ہے کہ آدمی بہت سارے راستوں پہ چل سکتا ہے' بہت سارے کام کر سکتا ہے لیکن جو حدود قائم کر دی گئی ہیں' ان کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔ حدود کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں آیا ہے۔ ایک تو اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی پر سزا کو حد کہتے ہیں۔ زنا اور شراب کی سزا جس کی خود قرآن مجید نے تصریح کر دی ہے' اس کو حد کہتے ہیں' یا نبی کریمؐ نے جس کو نافذ کر دیا ہے' اس کو حد کہتے ہیں۔ جن معاملات میں قرآن اور حدیث نے کوئی سزا نہیں بتائی' اس میں حکومت یا معاشرہ یا سوسائٹی یا قانون ساز ادارہ کوئی سزا مقرر کر دے تو اس کو شریعت کی زبان میں تعزیر کہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تعزیر خود مسلمان اپنی مرضی سے مقرر کرتے ہیں' اس کو آپ گھٹا بڑھا سکتے ہیں' تبدیلی کر سکتے ہیں' نافذ کر سکتے ہیں' معاف کر سکتے ہیں' یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حد ہے' اس میں نہ کوئی کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی۔ اگر دس کوڑوں کی سزا ہے تو نہ نو کوڑے کیے جا سکتے ہیں اور نہ گیارہ کیے جا سکتے ہیں۔ اللہ نے جو حد مقرر کر دی ہے اس کی پابندی ضروری ہے۔

حد کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے احکام میں کچھ حدود مقرر کر دی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ یہ حدود ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو۔ رمضان میں اعتکاف کے بارے میں بہت ساری ہدایات دی گئی ہیں کہ مسجد میں آدمی رہے اور ان کی پابندی کرے۔ فرمایا کہ یہ اللہ کی حدود ہیں' ان کے قریب بھی مت جاؤ۔ بہت سارے کام آدمی اعتکاف میں کر سکتا ہے لیکن چند مقامات پر اس نے لائنیں کھینچ دی ہیں کہ یہ کام نہیں ہونے چاہییں اور ان کے قریب بھی آدمی نہ جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں۔ ان

دو معنوں میں حد کا لفظ استعمال ہوا ہے' ایک حدود' ان سزاؤں کے معنوں میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی خلاف ورزی پر خود یا اللہ کے نبیؐ نے نافذ کیں۔ دوسری وہ حدود ہیں جو اللہ نے اپنے مختلف احکامات کے چاروں طرف لائنیں کھینچ دی ہیں کہ اس کے اندر جس طرح تم چاہو کرو' جس طرح چاہو گھومو پھرو لیکن ان سے باہر مت جاؤ۔

اس کے بعد فرمایا کہ بہت سارے معاملے ایسے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے خاموشی اختیار کی ہے۔ نبی کریمؐ اس کی تصریح فرماتے ہیں۔ آپؐ کے الفاظ بڑے قابل غور ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نے نہیں بتایا کہ یہ منع کر دیا ہے' یہ نہیں بتایا کہ کرنا ضروری ہے' یہ نہیں بتایا کہ یہ میری حد ہے' یہ متعین نہیں کیا کہ یہ اس راستے کی میری آخری حد ہے' تو ایسا اس لیے نہیں کیا کہ وہ بھول گیا یا اللہ اور اس کا رسولؐ بھول گئے کہ یہ بھی بتانا چاہیے تھا' لیکن نہیں بتایا۔ بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ خاموشی اس لیے اختیار کی کہ وہ تمھارے ساتھ رحمت کا برتاؤ کرتا ہے۔ تمھاری زندگی میں تمھیں حالات کے لحاظ سے' قوموں کے لحاظ سے' افراد کے لحاظ سے اختیار دینا چاہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بہت ساری چیزوں میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کی ہے کہ تم اپنا راستہ خود بناؤ۔ اس لیے ان باتوں کے بارے میں سوال مت کرو' کھوج کرید میں مت پڑو کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ اللہ نے تو خود ہی خاموشی اختیار کی ہے۔

اس حدیث پر آپ غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اللہ کے نبیؐ نے پانچ چھ جملوں میں دین کی راہ کو بڑا کھول کر واضح طور پر بیان فرمادیا ہے۔ وہ چیزیں جو آج ہم کو بہت پریشان کرتی ہیں' ان میں سے بہت ساری چیزوں کا حل نبی کریمؐ کے اس خطبے کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ سوال کر کے کسی چیز کو منع کر لینا یا سوال کر کے کسی چیز کو جو اللہ نے منع نہیں کی اس کو حرام کر لینا' یا جو اس نے عائد نہیں کیا ہے اس کو عائد کروا لینا' اس کو فرض قرار دلوا لینا' اس کے اوپر نبی کریمؐ نے بڑی تنبیہ فرمائی ہے اور اس کو بہت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

ایک دفعہ آپؐ نے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر حج کو فرض کیا ہے۔ ایک صاحب کھڑے ہو گئے' جیسے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ فوراً

سوال کر دیتے ہیں، پوچھا: کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ حضورؐ خاموش ہو گئے۔ آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان صاحب نے پھر سوال کیا: کیا حج ہر سال فرض ہے؟ آپؐ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ پھر اس کے بعد آپؐ نے اس کا کچھ جواب دیا۔ ان کو پھر بھی صبر اور چین نہیں آیا۔ پھر سوال کیا: کیا ہمارے اوپر ہر سال حج فرض ہے؟ اس پر آپؐ نے ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اگر میں یہ کہہ دیتا کہ ہاں، تو پھر ہر سال لازم ہو جاتا اور یہ تمھارے بس سے باہر ہوتا۔ جس طرح میں نے تم پر چھوڑ دیا ہے، اسی کے اوپر چھوڑ دو اور اس کے آگے بحث اور سوال و جواب سے پابندیوں میں اضافہ مت کرو، اس لیے کہ تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں، وہ اپنی کثرت سوال کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ پوچھ پوچھ کر، سوال کر کر کے انھوں نے اپنے اوپر وہ پابندیاں عائد کر لیں جو دین کے اندر نہیں تھیں۔ لیکن جب پوچھ لیا تو اب کرنا ضروری ہو گیا حالانکہ وہ کر نہیں سکتے، اس میں اختلاف کے اندر پڑ گئے اور اس طریقے سے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اگر میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو جتنا تمھارے بس میں ہے، وہ کر لو اور کسی چیز سے روک دوں تو اس کو چھوڑ دو۔ اس کے آگے سوال مت کرو، بحث میں مت پڑو، تفرقے میں مت پڑو۔

ایک اور حدیث میں جو بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جو لوگوں کے اوپر حرام نہیں کی گئی تھی لیکن اس کے بعد اس کے سوال کی وجہ سے وہ حرام کر دی گئی۔ ایک صحابیؓ یا کسی تابعی کا قول ہے واللہ اعلم بالصواب، کہ سب سے کم سوال کرنے والے صحابہ کرامؓ تھے کہ انھوں نے پوری زندگی میں تیرہ سوال کیے تھے۔ قرآن مجید میں یسئلون (لوگ پوچھتے ہیں) کہہ کر ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مزید سوال اور جواب کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان سے صرف اتنا ہی مطالبہ کیا ہے جتنی اس کے اندر استطاعت ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن:۱۶) ''اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جتنی تمھارے اندر استطاعت ہے۔'' جس چیز سے صاف صاف روک دیا ہے، اس سے رک جاؤ۔ آپؐ نے فرمایا کہ حلال اور حرام بالکل واضح کر دیا گیا ہے۔ جو حرام ہے اس سے رک جاؤ، اس کو چھوڑ دو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جنھیں پانچویں خلیفہ راشد کہا جاتا ہے' خلیفہ بنے۔ خلیفہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو حکم دینے کا اور قانون بنانے کا اختیار حاصل ہوا۔ یہ خلافت کا وہ دور ہے جب خلیفہ بڑی حد تک مطلق العنان بن چکے تھے' جو احکام چاہتے تھے وہ جاری کرتے تھے۔ ان کے پہلے خطبے میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ دیکھو! اللہ کے آخری نبیؐ آچکے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ جو اللہ کی کتاب اتار دی گئی ہے' اس کے بعد کوئی اور کتاب اتاری جانے والی نہیں ہے۔ ذرا آپ ان الفاظ پر غور کریں' ان کی اہمیت پر غور کریں کہ اس میں کتنی بڑی بات کہی گئی ہے۔

چیزوں کو حلال اور حرام کرنے کا حق کسی انسان کو یا کسی عالم کو حاصل نہیں ہے۔ قانون سازی کا' شریعت کا حق کلیتاً اللہ اور اس کے رسولؐ کو حاصل ہے۔ اللہ کے رسول آخری رسول تھے۔ اب ان کے بعد کوئی اور رسول آنے والا نہیں ہے۔ جو کتاب قرآن مجید اتار دی گئی ہے اس کے بعد کوئی کتاب نہیں ہے۔ اب جو چیز اللہ نے حلال کر دی ہے' وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ اب قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ میرا کام صرف اللہ کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ میرا کام حرام اور حلال کا اور جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنا نہیں ہے۔ یہ چیز تو طے ہو چکی ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

جو چیز اللہ نے منع کر دی ہے' سود منع کر دیا ہے' سور کا گوشت حرام کر دیا ہے اگر کسی اور اخلاقی خرابی کو حرام کر دیا ہے تو ان کو حلال کرنا جتنا بڑا گناہ ہے' اتنا ہی بڑا گناہ یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ نے انسانوں کے لیے حلال کر دی ہیں' ان کو آدمی حرام کر دے' جن چیزوں کو اس نے جائز کر دیا ہے ان چیزوں کو آدمی ناجائز کر دے' جن سے اس نے نہیں روکا' ان سے آدمی کھڑے ہو کر روکنا شروع کر دے اور کہے کہ اللہ کی مرضی تو یہ ہے' اور رسولؐ کی مرضی تو یہ ہے۔ وہ جو کچھ خود سمجھے اس کو اللہ اور رسولؐ کی مرضی بنا کر بیان کرنا شروع کر دے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حلال کو حرام کرنے والا بھی اس آدمی کی طرح گناہ گار ہے جو حرام کو حلال کرے۔ جس چیز کو اللہ نے منع نہیں کیا' اس کو کہے کہ یہ حرام ہے' وہ بھی اتنا بڑا گناہ گار ہے جو شراب یا سور کے گوشت کو حلال کہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس بات کو قرآن مجید میں کئی جگہ کھول کھول کر بیان فرمایا ہے۔ قانون سازی کے حوالے سے نبی کریمؐ کے کارنامے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ طیبات کو آپؐ نے حلال فرمایا' اور خبائث کو حرام کیا۔ حلال کرنا بھی آپؐ کا بہت بڑا احسان ہے اور حرام کرنا بھی آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ لوگوں نے جو زنجیریں مذہب کے نام پر باندھ رکھی تھیں' جو بوجھ اپنی پیٹھوں پر مذہب کے نام پر ڈال رکھے تھے' اور جو بیڑیاں پہن لی تھیں اور زندگی کو مشکل بنالیا تھا' آپؐ نے ان سارے بوجھوں کو ہٹادیا اور بیڑیوں کو کاٹ دیا۔ لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط (المائدہ:۸۷) ''جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے حلال کر دی ہیں' ان کو حرام مت کرو اور اللہ کی حدود سے تجاوز مت کرو۔'' اللہ ان کو پسند نہیں کرتا جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں' اس کے بعد یہ بھی فرمایا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط (النحل:۱۱۶) ''ایسے ہی زبان مت چلا دیا کرو یہ حلال ہے اور یہ حرام' یہ جائز ہے اور یہ ناجائز۔ کہیں تم اللہ پر جھوٹی بات نہ کہہ دو۔'' تم کہہ دو اللہ نے حلال کیا ہے اور اس نے حلال نہ کیا ہو' تم کہو اس نے حرام کیا ہے اور اس نے حرام نہ کیا ہو۔

اس کا اثر یہ تھا کہ شروع کے دو تین سو سال تک کے علمائے سلف اپنی زبان سے یہ کہنے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام' بڑا گھبراتے تھے۔ چنانچہ بہت ساری احادیث آپ کو ملیں گی جن میں صحابہؓ نے نبی کریمؐ کا نام نہیں لیا کہ آپؐ نے فرمایا ہے۔ جس حدیث میں یہ کہا گیا ہو کہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے' حدیث کی لغت میں اسے مرفوع حدیث کہتے ہیں۔ جس کا سلسلہ حضورؐ تک گیا ہے' مرفوع حدیث ہے۔ جہاں صحابیؓ حضورؐ کا نام نہیں لیتے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضورؐ کا قول نقل کر رہے ہیں تو وہ مرسل حدیث ہوتی ہے۔ اس کو حضورؐ تک اسی ڈر کے مارے نہیں پہنچاتے تھے کہ کہیں ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو حضورؐ نے نہ فرمائی ہو اور ہم کہہ دیں کہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے تو حضورؐ کی طرف سے لازم ہو جائے۔ چنانچہ وہ اس سے احتراز اور اجتناب کرتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبر اپنی کتاب العلم والعلماء میں' جس میں انھوں نے اسلام میں

علم کے حوالے سے تمام امور بیان کیے ہیں' فرماتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے تھے کہ میری رائے یہ ہے' میں اسے اچھا سمجھتا ہوں' میں اسے غلط سمجھتا ہوں' یہ نہیں کہتے تھے کہ اسلام میں یہ نہیں ہے اور یہ ہے' مثلاً یہ لباس پہننا اور یہ کھانا اور اس قسم کی چیزیں وغیرہ۔ امام مالک بن انسؒ جیسے فاضل اور محدث فقیہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو مسئلہ بیان کر کے فرماتے تھے کہ یہ ہمارا گمان ہے' ہمارا استنباط ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی منشا یہ ہے۔ اس پر ہم یقین کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہتے تھے کہ لازماً اس کی مرضی یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے خاموشی اختیار کی ہے' اس وجہ سے نہیں کہ وہ بھول گئے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ تمھارے لیے رحمت مقصود تھی۔ تمھاری زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ راستہ بنانا مقصود تھا۔ نشانات راہ مقرر کردیے' سگنل لگا دیے' لائنیں بنا دیں اور حدود مقرر کر دیں۔ کچھ چیزیں فرض کر دیں کہ یہ ضرور کرو۔ کچھ چیزوں سے روک دیا کہ ان سے رک جاؤ۔ اس کے علاوہ وسیع دائرہ ہے جس کے اندر تمھارا اپنا کام ہے کہ یہ دیکھو کہ کیا کرنا تمھارے لیے بہتر ہے اور ویسا ہی کرو۔ جہاں اس بات کا ذرا سا بھی شبہہ ہوتا تھا کہ کوئی چیز لازم ہو جائے گی تو نبی کریمؐ اس سے فوراً اجتناب فرماتے تھے۔ رمضان میں ہم جو تراویح پڑھتے ہیں' اس کے بارے میں مشہور حدیث ہے کہ آپؐ نے ایک دفعہ مسجد میں آکر نماز پڑھی۔ لوگوں نے پیچھے صف باندھ لی۔ اگلے دن پھر آپؐ آئے تو پھر لوگوں نے صف باندھ لی اور لوگ بڑھ گئے کہ نبی کریمؐ خود امامت کر رہے ہیں۔ تیسرے دن صف اور بڑی ہوگئی۔ دو یا تین دن یہ واقعہ ہوا۔ اگلے دن آپؐ باہر نہیں آئے اور آپؐ نے نماز کی امامت نہیں کی۔ لوگ انتظار کرتے رہے۔ پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں اس خیال سے نہیں آیا کہ یہ چیز تمھارے اوپر فرض نہ ہو جائے۔ میں نے اس کام کو اس لیے نہیں کیا کہ یہ سنت ہے لیکن یہ فرض کا درجہ اختیار نہ کرے۔

علامہ ابن قیمؒ ایسی مثالیں بیان فرماتے ہیں کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز فرض نہیں کی' کسی چیز کو حرام نہیں کیا' کوئی حدود مقرر نہیں کیں اور کوئی نشان راہ مقرر نہیں کیے۔ ان میں نبی کریمؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ ہر طرح سے کام کیا کرتے تھے تا کہ لوگوں کے

لیے ہر طرح سے کام کرنے کا راستہ کھلا رہے۔ آپؐ کسی ایک ہی طریقے کو اختیار نہیں کرتے تھے کہ لوگ پابند ہو جائیں کہ اسی طرح کرنا ضروری ہے۔

لباس کا معاملہ ہمارے ہاں اکثر موضوع بحث رہتا ہے کہ لباس کیا ہے۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس کے بارے میں کچھ نشانیاں اور حدود تو مقرر کی گئی ہیں کہ لباس ستر کو چھپائے' لباس میں ریشم نہ ہو' لباس میں اسراف نہ ہو' عورتیں مردوں کا لباس نہ پہنیں' مرد عورتوں کا لباس نہ پہنیں۔ اللہ کے نبیؐ اس لیے تو تشریف نہیں لائے تھے کہ لوگوں کو لباس کا فیشن اور ڈیزائن سکھائیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ہر قسم کا لباس جو آپؐ کے سامنے آیا پہنا۔ جس میں کوئی قباحت نہیں تھی وہ آپؐ نے پہنا۔ ہر ہر رنگ کا لباس پہنا۔ گہرے ہرے رنگ کا لباس بھی پہنا' لال دھاریوں کی چادریں بھی آپؐ کو بہت پسند تھیں' وہ بھی آپؐ نے پہنیں۔ ازار بھی باندھی۔ رومیوں میں سرابیل کا نام آتا ہے' جس کو ہم شلوار کہتے ہیں۔ آپؐ مدینہ میں آئے تو آپؐ نے یہ بھی خریدی اور فرمایا کہ یہ تو ستر کو چھپانے والا بڑا پاکیزہ لباس ہے۔ لنگی کے مقابلے میں اس کو بھی آپؐ نے پسند کیا۔ لباس میں کھدر بھی پہنا' اُونی کپڑا بھی پہنا' سوت کا بھی پہنا اور قطان کا بھی پہنا۔ لباس کی وضع قطع کے لحاظ سے بھی آپؐ نے ایسا نہیں کیا کہ کوئی ایک ہی طریقہ پہننے کا رکھا ہو کہ کوئی ایک لباس لازم ہو جائے۔

آپؐ کا ایک صافہ تھا جو آپؐ پہنتے تھے' اس کے رنگ بھی مختلف ہوتے تھے۔ کبھی آپؐ صافے کے نیچے ٹوپی رکھتے تھے اور کبھی ٹوپی کے بغیر صافہ باندھ لیتے تھے اور کبھی صرف ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی صافہ نہیں پہنتے تھے تاکہ یہ نہ ہو کہ صافہ باندھنا ہی سنت ہے۔ کبھی آپؐ صافے کا پیچھے حصہ لٹکاتے تھے' کبھی بیچ میں اور کبھی ایک طرف۔ یہ نہ ہو جائے کہ ایک ہی طرف اس کا لازم ہو جائے۔ لباس کے اندر وسعت ہے' جس طرح کوئی چاہے پہن لے۔ لڑائی کا موقع آیا تو آپؐ نے نہ صافہ پہنا' نہ ٹوپی باندھی۔ لوہے کا ہیلمٹ خود ہوتا ہے' وہ آپؐ نے پہنا۔ حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موقع کی مناسبت سے جیسا لباس آپؐ کو میسر آیا اور جو پسند آیا وہ آپؐ نے پہن لیا۔ یہ نہیں کہ کسی لباس کو آپؐ نے لازم کر دیا ہو۔

شیروانی صحابہ کرامؓ کا لباس نہیں تھی۔ مسلمانوں نے ہندستان میں آکر اسے اختیار کیا۔ یہ ہندوؤں سے لیا تھا۔ ہندوؤں کے پورے کوٹ کے لباس اور شیروانی میں صرف لمبائی میں فرق ہے۔ اس کی وضع قطع تو ایک ہی ہے۔ مسلمانوں نے پہننا شروع کردیا تو مسلمانوں کا لباس بن گیا۔ اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے۔ اس نے نہیں بتایا کہ لباس کی وضع قطع ایسی ہونی چاہیے بلکہ آدمی جو لباس چاہے پہنے۔ اگر آج یورپ کے سارے لوگ مسلمان ہوجائیں تو وہ لباس بھی مسلمانوں کا لباس بن جائے گا' بس شرائط پوری ہوتی ہوں۔

اسی طرح کھانے کا معاملہ تھا۔ کھانے میں اس طرح بیان نہیں ہوتا کہ کیا کھانا جائز ہے یا ناجائز ہے' بلکہ صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ منع ہے؟ جو چیز منع نہیں ہے' وہ حلال ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقہا کا مسلک تو یہ تھا کہ چار چیزیں جو قرآن مجید نے حرام کردی ہیں اور نبی کریمؐ نے جن دو ایک چیزوں کا نام لیا ہے' ان کے علاوہ ہر چیز حلال ہے۔ غذا میں آپؐ کا یہ طریقہ تھا کہ دسترخوان پر کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس کو میں نے منع کیا ہے۔ گوہ کا گوشت آپؐ کو انتہائی سخت ناپسند تھا۔ آپؐ کے سامنے صحابہؓ بیٹھ کر کھاتے تھے' آپؐ منع نہیں فرماتے تھے کہ مت کھاؤ کہ یہ مجھے ناپسند ہے۔ کہیں یہ منع نہ ہوجائے اور جو چیز حلال ہے وہ حرام ہوجائے۔ کھجور آپؐ نے مکھن کے ساتھ بھی کھائی' ککڑی کے ساتھ بھی کھائی' خشک بھی کھائی اور تر بھی کھائی۔ جو کھانا جس طرح میسر آتا' اسے کھالیتے۔ گوشت آپؐ نے بھنا ہوا بھی کھایا اور شوربے کے ساتھ بھی کھایا' خشک بھی کھایا اور پکا ہوا بھی کھایا۔ کھانے میں اور گوشت میں آپؐ نے وسعت اختیار کی۔ یہ زندگی کے عام معاملات تھے۔

اسی طرح اجتماعی معاملات تھے۔ میں آپ کو سیاست کی مثال دوں گا۔ سیاست کے اندر بھی اصول طے کردیے گئے ہیں۔ یہ اصول بیان کردیا گیا کہ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (الشوریٰ: ۳۸) ''مسلمانوں کے معاملات ان کے مشورے سے طے ہونے چاہییں۔'' کس طرح سے ہونے چاہییں؟ کیسا نظام بننا چاہیے؟ کس طرح یہ مشورہ ہونا چاہیے؟ اللہ نے اس معاملے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ کیا یہ بات مشکل تھی کہ نبی کریمؐ اپنی وفات سے پہلے

بتادیتے کہ میرے بعد خلیفہ یہ ہوگا اور اس کا انتخاب اس طرح ہوگا؟ کوئی مشکل نہیں تھی' آپ بھول نہیں گئے تھے۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ یہ مسئلہ پیدا ہوگا لیکن آپؐ خاموش رہے۔ قرآن بھی خاموش رہا' امت پر چھوڑ دیا کہ جو طریقہ جس زمانے میں مناسب سمجھے اپنالے' لیکن اَمْرُھُمْ شُوریٰ بَیْنَھُمْ 'اس بات کا خیال رکھے۔ یہ قرآن کی نص ہے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی کہ مسلمانوں کے مسائل مسلمان خود طے کریں۔ جب اس میں کوئی تبدیلی ہوئی تو عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیقؓ' اور حسین بن علیؓ ہوں یا بعد کے فقہا مالکؒ و ابوحنیفہؒ ہوں' سفیان ثوریؒ اور فضیل بن عیاضؒ کی طرح صوفیا ہوں' ابوحاجم کی طرح درویش ہوں' تابعین ہوں سب نے یہ کہا کہ مسلمانوں کی خلافت مسلمانوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ کس طرح ہو؟ یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ خود طے کرلیں۔ اب پارٹیاں ہوتی ہیں۔ وہ اسلامی ہیں یا غیر اسلامی؟ پارلیمنٹ اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ صدارتی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ الیکشن اسلامی ہیں یا غیر اسلامی؟ یہ سارے سوالات وہ ہیں جن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ نے خاموشی اختیار کی' وہ بھول نہیں گیا کہ یہ معاملات پیش آنے والے ہیں بلکہ تمھارے لیے رحمت کی خاطر ایسا کیا ہے۔ زمانہ بدلے گا' حالات بدلیں گے' نئے نئے طریقے پیدا ہوں گے' جو مسلمان چاہیں گے کریں گے۔ پس سوال مت کرو' بحث میں مت پڑو بلکہ حالات کو دیکھ کر اپنے لیے راستہ بناؤ۔

لباس اور زندگی کے دوسرے معاملات ہوں یا ریاست کے معاملات' ہر جگہ یہی اصول کارفرما ہے کہ اللہ نے جو چیزیں فرض کردی ہیں ان کی اطاعت ہونی چاہیے' جو چیزیں اس نے حرام کردی ہیں ان سے رک جانا چاہیے' جو اس نے حدود طے کردی ہیں ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے' جو اس نے علامات مقرر کردی ہیں ان کو دیکھ کر راستہ چلنا چاہیے' اور بڑے وسیع دائرے میں جہاں اس نے خاموشی اختیار کی ہے اس میں مسلمان امت اللہ اور رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے جو طریقے اپنے لیے مناسب سمجھے اختیار کرے۔ اٹھنے بیٹھنے کے' بچھانے کے' کھانے پینے کے' میز کرسی پر بیٹھ کر کھائے یا فرش پر بیٹھ کر کھائے' ایک پلیٹ میں کھائے' یا

الگ الگ پلیٹوں میں کھائیے۔ بہت سارے لوگ ایک تھالی میں کھانے کو سمجھتے ہیں کہ یہ تو بڑا سنت کا طریقہ ہے' الگ الگ پلیٹیں لے لیں تو یہ غلط ہو جائے گا۔ چھری کانٹا لے لیں گے تو حرام ہی ہو جائے گا' ہاتھ سے ہی کھانا چاہیے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان ساری چیزوں میں نبی کریمؐ کا طریقہ وسعت کا تھا۔ لباس پہننے میں' کھانے میں دیگر امور میں اور جہاں آپؐ نے امت کو پابند نہیں کرنا چاہا وہاں آپؐ نے بھی خاموشی اختیار کی' قرآن مجید نے بھی خاموشی اختیار کی۔ اب یہ بحث نہیں ہوسکتی کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ یہ بحث ہوسکتی ہے کہ ہمارے لیے کیا مناسب ہے' اس میں ہمارا فائدہ ہے یا نقصان' اس طرح کھانا بہتر ہے یا اس طرح کھانا بہتر نہیں ہے' یہ لباس اچھا ہے یہ لباس اچھا نہیں ہے' اس طرح کا نظام اچھا ہے اور اس طرح کا نظام اچھا نہیں ہے۔ یہ بحث مسلمان کر سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری رائے میں یہ بہتر ہے۔ یہی سلف کا طریقہ تھا۔ امام مالکؒ' امام ابوحنیفہؒ بڑے بڑے فقہا کہتے تھے کہ ہماری رائے یہ ہے' یہ نہیں کہتے تھے کہ اللہ اور رسولؐ نے کہہ دیا ہے کہ ایسے ہی کرو۔ یہ نہیں کرو گے تو یہ غیر اسلامی ہو جائے گا۔

ہمارے فقہا اپنی رائے رکھتے تھے۔ اس سے انھوں نے بہت احتراز کیا کہ کسی ایک کی رائے لوگوں پر نافذ ہو۔ ہارون الرشید نے امام مالکؒ سے کہا کہ آپ کی موطا تو اتنی عمدہ کتاب ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ میں ہر جگہ یہ حکم بھیج دوں کہ اسی کتاب کے مطابق سارے معاملات طے ہوں۔ امام مالکؒ کے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہوسکتا تھا۔ خلافت بنوعباس پورے شرق و غرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی حکومت تھی کہ ہارون الرشید نے ایک دفعہ آسمان کے بادل کو دیکھ کر کہا تھا کہ تو جہاں چاہے جا کر برس جا' تیری زمین کی پیداوار کا خراج میرے خزانے میں آئے گا۔ مگر امام مالکؒ نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! ایسا مت کیجیے' اس سے لوگوں کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔ لوگ اپنے اپنے دیار کے علما سے جس سے بات پوچھیں اس پر عمل کریں۔ آپ سب کو ایک طریقے کا پابند کیوں کرتے ہیں۔ دو تین سو سال تک فقہا کا یہ انداز اور فکر تھی۔ اس دور میں اسلام کی غالب تہذیب نے دنیا کی قیادت کی۔ لیکن جب

معاملات ان کے ہاتھ میں آگئے جو کنویں کے مینڈک تھے تو تہذیب وتمدن اور معاشرے زوال پذیر ہوگئے اور آج تک وہ اسی زوال کا شکار ہیں۔

یہ حدیث دین پر اور شریعت کے احکام پر عمل کرنے کے لیے بڑی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حُبِّ دُنیا

عَنْ اَبِیْ عَبْدِالسَّلَامِ، عَنْ ثَوْبَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ. قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "یُوْشِکُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَی الْاَکَلَةُ اِلٰی قَصْعَتِهَا. فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ، قَالَ: بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ، وَلٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ، وَلَیَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَهَابَةَ مِنْکُمْ، وَلَیَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَهْنَ. فَقَالَ قَائِلٌ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ، وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاهِیَةُ الْمَوْتِ."

(ابو داؤد، ج ۴، کتاب الملاحم باب فی تداعی الامم علی الاسلام)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت قریب ہے کہ بہت ساری قومیں آپس میں ایک دوسرے کو تمھارے خلاف بلائیں گی، جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔ کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ہم تعداد میں کم ہوں گے اور اس دن ہم اس حالت کو پہنچ جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں، تم اس روز تعداد میں بہت زیادہ ہوگے لیکن تم اس جھاگ کی طرح ہوگے جو پانی کے اوپر یا دریا اور سمندر کے اوپر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے دل میں سے تمھارا خوف، ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمھارے دلوں کے اندر وہن ڈال دے گا۔ ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ وہن کیا چیز ہے؟ فرمایا: دنیا سے محبت اور موت سے نفرت۔

نبی اکرمؐ نے اپنی امت کو اللہ کی کتاب پہنچائی اور خود اس پر عمل کر کے یہ بتایا کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ کیا ہے اور اس امت سے وابستہ لوگوں کو اپنی زندگی کس طرح بسر

کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اپنے مختلف ارشادات میں اس بات کی بھی تعلیم دی ہے کہ آنے والی امت کو کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔ جو امراض پیدا ہوں گے' جو خرابیاں پیدا ہوں گی ان کا سبب اور ان کا علاج کیا ہے۔ آج جو حدیث میں آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں' وہ اسی موضوع پر ہے۔

حضرت ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: بہت قریب ہے کہ بہت ساری قومیں آپس میں ایک دوسرے کو تمھارے خلاف بلائیں گی، جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔ کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ہم تعداد میں کم ہوں گے اور اس دن ہم اس حالت کو پہنچ جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں' تم اس روز تعداد میں بہت زیادہ ہوگے لیکن تم اس جھاگ کی طرح ہوگے جو پانی کے اوپر یا دریا اور سمندر کے اوپر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے دل سے تمھارا خوف' ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمھارے دلوں کے اندر وہن ڈال دے گا۔ ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ وہن کیا چیز ہے؟ فرمایا: دنیا سے محبت اور موت سے نفرت۔ اس روایت کو ابوداؤد نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس حدیث پر آپ غور کریں۔ پہلے تو آپ نے تصویر کھینچی ہے اور فرمایا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب دنیا کی قومیں تمھارے خلاف ہوجائیں گی۔ صرف جمع ہی نہیں ہوجائیں گی بلکہ ایک دوسرے کو بلائیں گی کہ وہ تمھارے خلاف لڑائی لڑیں اور تمھیں کمزور کریں۔ اس کی مثال آپ نے اس طرح دی کہ جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔ جب کھانا لگ جاتا ہے تو دوسروں کو کہتے ہیں کہ آیئے' بیٹھیے' کھایئے۔ تمھاری حالت بھی اس دسترخوان کی سی ہوجائے گی اور تم دوسری قوموں سے ڈرنے والے بن جاؤ گے۔ جب یہ تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے تو ظاہر کی نظر تو یہی سوچ سکتی ہے کہ اس کی کوئی مادی وجہ ہوگی۔ چنانچہ ایک پوچھنے والے نے پوچھ لیا کہ کیا یہ تعداد کی کمی کی وجہ سے ہوگا کہ ہم اس دن اس حالت کو اس طرح پہنچ جائیں گے۔ اس زمانے میں تعداد ہی پر اصل قوت کا انحصار تھا۔ لڑائی میں بھی فوجوں پر انحصار ہوتا تھا۔ قوموں کے غلبے اور برتری میں بھی تعداد پر انحصار ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے مال اور بیٹے

ان دو کا ذکر قرآن مجید نے بار بار کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ تعداد سے مراد یہاں نفری نہیں ہے۔ اگر ہم تھوڑا سا سوچیں تو اس کے اندر ہر قسم کے مادی وسائل شامل ہیں۔ کیا ہمارے پاس مال کی کمی ہوگی؟ اس لیے کہ جس وقت یہ بات کہی جا رہی ہے' اس وقت تو مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور مال بھی نہیں تھا اور دنیاوی وسائل بھی نہیں تھے اور ساز و سامان بھی نہیں تھا اور اسلحہ اور قوت بھی نہیں تھی۔ پوچھا: کیا ہم کم ہو جائیں گے؟ قلت میں تعداد کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی قلت شامل ہے۔ نبی کریمؐ نے اس کی اصلاح فرمائی اور فرمایا کہ دنیا کی قومیں تمھارے اوپر اس وجہ سے نہیں ٹوٹ پڑیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ تم قوت میں' تعداد میں بہت کم ہو گے بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہوگی۔ تمھاری تعداد بھی زیادہ ہوگی' تمھاری قوت بھی زیادہ ہوگی' مال اور اسباب بھی تمھارے پاس ہوگا' کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی لیکن اتنی بڑی تعداد کے باوجود اور ساری مادی قوت کے باوجود' ہوائی جہاز بھی ہوں گے' ٹینک بھی ہوں گے' توپیں بھی ہوں گی' پٹرولیم بھی ہوگا' ان سب کے باوجود تمھارا وزن اس طرح ہوگا جس طرح پانی کے اوپر جھاگ ہوتا ہے۔ اللہ تمھارے دشمنوں کے دل سے تمھارا خوف' تمھارا رعب اور تمھاری ہیبت سب کچھ نکال دے گا۔ دشمن تم سے نہیں ڈریں گے اور جس طرح چاہیں گے تمھارے خلاف سازشیں کریں گے۔ جس طرح چاہیں گے تمھیں اپنا آلہ کار بنائیں گے۔ جس طرح چاہیں گے تمھارے مال واسباب کو کھائیں گے اور تمھارے وسائل کے اوپر قبضہ کریں گے۔ دشمن تم سے نہیں ڈرے گا۔ تمھاری تعداد اور اسلحے کے باوجود اس کے دل میں تمھارا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں میں وہن ڈال دے گا۔ نبی کریمؐ نے وہن کا لفظ استعمال کیا۔ وہن کے معنی کمزوری کے ہوتے ہیں۔ ایک صحابیؓ نے سوال کر دیا کہ وہن کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔

اس حدیث پر آپ غور کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ آج بلکہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے یہی حالت ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ اسی طرح کی حالت ہو چکی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب منگول اٹھ کر آئے تھے اور انھوں نے مسلمانوں سے مل کر اور کبھی ان کو اپنا آلہ کار بنا کر' ان کی قوت کے بل پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کے ممالک پر قبضہ کیا' ان

کی آبادیوں کو تخت و تاراج کیا، ان کی تلوار سے ان کی گردنیں کاٹیں اور سروں کے مینار تعمیر کیے۔ مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کے بڑے بڑے عالیشان مراکز تھے، کسی چیز کی کمی نہیں تھی، سب تباہ کر دیے۔ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر ہلاکو خان کے قبضے کے بعد بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئی، کتب خانے جلا دیے گئے، یونی ورسٹیاں جلادی گئیں، اتنے لوگ قتل کیے گئے کہ دریائے دجلہ کا پانی خون سے سرخ ہو گیا۔ تاتاریوں کا بغداد کے اوپر قبضہ مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ شمار ہوتا ہے۔ جب مغربی اقوام اٹھیں تو دوسرا دور آیا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، مراکش، تیونس، الجزائر، ہندستان، اردن کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو ان کے غلبے سے بچ گیا ہو، جس کے وسائل پر انھوں نے قبضہ نہ کرلیا ہو۔ انگریز اور فرانسیسی اور ولندیزی سب آپس میں مل گئے اور انھوں نے مسلمانوں کی تباہی مچائی۔ آپؐ نے جو تصویر کھینچی ہے، یہ آج کے دن کی نہیں ہے، بلکہ ایسے دور پہلے بھی آئے ہیں اور اب بھی آیا ہوا ہے۔ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مال واسباب پر قبضہ کرنے کے لیے اور انھیں ذلیل کرنے کے لیے پوری دنیا ایک ہوگئی ہے۔ اتنی بڑی تعداد کے باوجود کہ ایک ارب سے زائد مسلمان ہیں، پورے اس کرہ ارض پر جتنے لوگ بھی چل پھر رہے ہیں، اس میں ہر پانچواں آدمی مسلمان ہونے کا دعوے دار ہے، کلمہ پڑھتا ہے، اللہ کے رسول پر ایمان کا بھی مدعی ہے۔ مسلمان ممالک میں ۹۰ کروڑ ہیں اور ان کی اپنی حکومتیں ہیں اور ۴۰ کروڑ اقلیت کی حیثیت سے دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں۔ آج مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگر آپ ان کی فوجوں کو جمع کریں، ان کے ٹینکوں کو جمع کریں، ان کے ہوائی جہازوں کو جمع کریں، تو تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم تعداد میں بہت زیادہ ہو گے، اس کے باوجود دشمن کے دل پر تمھارا کوئی رعب اور ہیبت نہیں ہوگی۔ تمھارے خوف سے کوئی رکے گا نہیں، ڈرے گا نہیں کہ تمھارے اوپر حملہ نہ کرے اور تمھیں نقصان نہ پہنچائے۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم وہن کا شکار ہو گے اور وہن کی تعریف آپ نے فرمائی: دنیا کی محبت اور موت کا خوف۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ تصوف سے اور اخلاقی روحانی اصلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بات کا تعلق قوموں کی ذلت اور عزت کے ساتھ، ان کی شکست اور فتح کے ساتھ اور دنیا میں ان کے مقام سے کیا ہوسکتا ہے؟

اصل میں یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ قوموں کی زندگی اور عروج و زوال کا انحصار مادی چیزوں اور مادی عوامل پر بالکل نہیں ہے اور نہ ان کی تعداد پر ہے۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے' تو مسلمانوں نے خود دیکھا ہے کہ عرب سے نکل کر آئے تو ایک سو کے مقابلے میں دس بھاری ہوتے تھے۔ غلبے کا انحصار اسلحے پر بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا اسلحہ نہیں تھا جو رومیوں اور ایرانیوں کے پاس تھا۔ اس کے باوجود وہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد بھی تاریخ مناظر پیش کرتی رہی ہے کہ تھوڑی تعداد بڑی تعداد پر غالب آ گئی۔ اصل چیز جو قوموں کو عزت اور بلندی کی ضمانت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی مقصد ہو۔ ضروری نہیں کہ یہ مقصد حق ہو۔ کوئی مقصد ہو' اس کے ساتھ ان کو محبت ہو' اس کو وہ اپنا مقصد سمجھیں' اس کے لیے وہ جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہوں' ضرورت پڑے تو دنیا کے نفع کے اوپر ترجیح دینے کو تیار ہوں' اس کے لیے اپنی جانیں بھی دینے کے لیے تیار ہوں' موت سے نہ ڈریں۔ جس قوم کے اندر کسی مقصد کی یہ محبت پیدا ہو جائے اور وہ اس کی خاطر دنیا کے ہر نفع کو ترک کر دے اور موت کے منہ میں جانے کو تیار ہو جائے' تو وہ کوئی بھی قوم ہو' کوئی بھی مقصد ہو' اگر وہ اپنے مقصد سے محبت رکھتی ہوگی' اس کے لیے جان قربان کرنے کو تیار ہوگی' اس کے لیے دنیاوی تکالیف اٹھانے کو تیار ہوگی تو اس قوم کو اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر غالب کرے گا اور عزت دے گا۔ اور جس کے اندر سے یہ چیزیں نکل جائیں تو پھر اس کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔

انسان کے جسم میں جب تک روح ہے' اس کی سانس آتی ہے اور جاتی ہے' وہ چل پھر سکتا ہے' اپنے کام کر سکتا ہے' تجارت کرتا ہے' کاروبار کرتا ہے' ملازمت کرتا ہے اور بے شمار کام کرتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک سانس کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس سانس کا آنا جانا بند ہوا اور روح نکل گئی تو بظاہر وہ جسم تو ایسے کا ایسا ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کی ساری طاقت' صلاحیت اور استطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ وہی ہاتھ اور پاؤں' وہی دماغ' وہی زبان ہر چیز موجود ہے۔ لیکن بے حس و حرکت۔ کوئی جو چاہے اس مردہ جسم کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی اپنے مقصد سے محبت جسم میں روح کی طرح ہے۔ زندگی اور عروج اس سے وابستہ ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ: مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کا جذبہ' قوموں کی زندگی کی جڑ ہے اور یہ آرزو کے

اندر پوشیدہ ہے۔ آرزو کیا ہے؟ کچھ کر جانے کا عزم، کہیں پہنچ جانے کی تمنا اور کسی چیز کو حاصل کر لینے کا جذبہ۔ تو آرزو کے اندر زندگی کی جڑ پوشیدہ ہے اور اس آرزو کے لیے جستجو ضروری ہے۔ جستجو کے معنی جہاد اور کوشش کے ہیں، اس کے لیے دنیا کے نقصان اٹھانے اور اپنی جان قربان کرنے تک۔ دنیا کی محبت اتنی غالب نہ ہو کہ مقصد نگاہوں سے غائب ہو جائے۔ قوموں کی زندگی کی جڑ، جو اس کی روح، اس کی اصل ہے ان دو چیزوں کے اندر ہے: ایک آرزو اور ایک جستجو، ایک مقصد اور ایک اس کے لیے جہاد۔ ایک نصب العین اور اس کی محبت اور ایک اس کے لیے قربانیاں دینے کا جذبہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جن سے قومیں دنیا میں غالب ہوتی ہیں، زندہ رہتی ہیں، دوسروں پر ان کی ہیبت اور رعب بیٹھتا ہے۔

شروع میں مسلمانوں کا یہی حال تھا، ان کی تعداد زیادہ نہ تھی، ان کے پاس اسلحہ نہ تھا۔ ان کے پاس وہ ساز وسامان نہ تھا جو قیصر و کسریٰ کے پاس تھا لیکن وہ اپنے مقصد سے محبت کی خاطر قربانی دینے کو تیار تھے۔ وہ مقصد بھی حق تھا، اس لیے مزید قوتیں ان کا پورا ساتھ دے رہی تھیں۔ انھوں نے تھوڑے عرصے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنا پیغام پہنچا دیا اور ان کو اپنے دین کے تحت لے آئے۔ انھوں نے یہ سارا کارنامہ صرف اپنے ایمان اور اپنے مقصد سے محبت کے بل پر اور اس کے لیے جہاد کے جذبے سے سرانجام دیا۔ اگر مسلمانوں کا مقابلہ کافر قوموں سے ہو تو کافر قوموں کا مقصد باطل ہے لیکن انحصار اس پر ہوگا کہ اپنے مقصد کے لیے کام کرنے کا جذبہ کتنا ہے، اپنے مقصد کے لیے جانیں دینے کا جذبہ کتنا ہے، اور اپنے مقصد کے لیے دنیا کی تکالیف برداشت کرنے کا جذبہ کتنا ہے۔ اگر مقصد غلط بھی ہوگا لیکن جذبے کی یہ قوت ہوگی تو کافر ہونے کے باوجود دنیا کا انتظام اسی کے سپرد کیا جائے گا۔

آپ مسلمانوں کے حال پر غور کریں۔ آخر اس کی ضرورت کہاں پڑتی ہے کہ آدمی موت سے نفرت اور کراہت نہ کرے، موت کے منہ میں جانے سے نہ ڈرے اور دنیا کے اوپر اس چیز کو ترجیح دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اپنی کتاب سپرد فرمائی ہے۔ اس میں اس کا مقصد یہی بتایا کہ لوگ انصاف کے اوپر قائم ہو جائیں: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ؕ (الحدید: ۲۵) ”ہم نے رسول

بھیجے اور ان کے ساتھ واضح کھلی آیات‘ نشانیاں اور زندگی بسر کرنے کا راستہ بھیجا اور کتاب اتاری‘ ایسی کتاب جو میزان یعنی ترازو کا کام کرتی ہے اور تول کر بتاتی ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے‘ کس عمل کا کتنا وزن ہے‘ کس نیت کا کتنا وزن ہے۔ دنیا کے اندر ان اعمال کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے‘ اور آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔ یہ کتاب ہم نے اس لیے اتاری ہے کہ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ لوگ انصاف کے اوپر قائم ہو جائیں۔ پھر آگے فرمایا وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ اور ہم نے لوہا بھی اتارا۔ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ، اس لوہے میں لڑائی کا بھی سامان ہے‘ قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے نفع ہیں۔ اس سے پُل بنتے تھے‘ اس سے کھیتی ہوتی تھی‘ اسی سے کارخانے بنتے تھے‘ اس سے بہت کچھ بنتا رہا ہے‘ اب بھی بنتا ہے۔ فرمایا: وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو آزمائے‘ اس بات کو جانچے‘ اس بات کو ظاہر کردے کہ کون ہے جو اللہ کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اس امت کا جو مقصد اور نصب العین ہے‘ جس کے لیے اس کو جینا اور مرنا چاہیے‘ جس کی محبت غالب ہونی چاہیے وہ تو اللہ اور اس کے رسول کی نصرت اور مدد ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کہہ کر اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا پرکشش انداز بیان اختیار کیا‘ ورنہ اصل مدد تو انسان خود اپنی کرتا ہے تاکہ لوگ انصاف کے اوپر قائم ہوں۔ اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی اس کی مدد کرے‘ نہ اس کے رسول کو اس کی ضرورت ہے کہ کوئی اس کی مدد کرے۔ اسی لیے اس آیت کے آخر میں کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ اللہ تعالیٰ تو خود ساری طاقتیں رکھتا ہے اور ہر چیز پر غلبہ رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو چشم زدن میں دنیا کے اندر اس کا دین غالب ہو جائے۔ صرف ایک کُن کہنے کی دیر ہے کہ سارے لوگ درست ہو جائیں اور انصاف کے اوپر قائم ہو جائیں۔ لیکن آزمائش تو زندگی کا مقصود ہے۔ اسی سے گزر کر لوگ زندگی کے اندر جنت کا راستہ بناتے ہیں۔ اور اللہ سے قرب کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ اسی جہاد کے ذریعے وہ اللہ کی نعمتوں کے مستحق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں دنیا کے مال و اسباب سے اور دنیا کے اندر حکومت اور غلبے اور عزت سے سرفراز فرماتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو آزمائے سب کو دیکھ اور جانچ پرکھ لے‘ کون سی قوم اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرنے والی ہے۔ اور اگر

آپ اپنی مدد کریں' اللہ کے دین کے لیے اسے غالب کرنے کے لیے کام کریں تاکہ لوگ انصاف کے اوپر قائم ہوجائیں تو اللہ نے اس کو اپنی مدد قرار دیا ہے۔ ایک اور جگہ قرآن نے کہا ہے کہ کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہِ اللہ کے مددگار بن جاؤ' یعنی اللہ کی راہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کرو۔ جو قوتیں اللہ نے دی ہیں' وہ اس راہ میں لگادو اور جان کو بھی لگا دو۔ یہ ترقی اور عزت کا راستہ ہے۔ اس امت کا مقصد یہ تھا کہ وہ انصاف کے اوپر اللہ کے واسطے گواہ بن کر کھڑی ہو' یہ گواہی کسی کے بھی خلاف جائے' اپنے خلاف جائے' رشتہ داروں کے خلاف جائے' امیر کے خلاف جائے' غریب کے خلاف جائے۔ انصاف کے اوپر قائم رہو۔ دوست کا معاملہ ہو' دشمن کا معاملہ ہو ہر معاملے میں انصاف کے اوپر قائم رہو۔ سارے انسانوں کے معاملات قسط یعنی انصاف کے ساتھ کرو۔ یہی وہ طریقہ ہے جس پر چل کر یہ امت دنیا میں غلبہ اور آخرت میں کامیابی حاصل کرسکتی ہے۔

اسی آیت کے پہلے حصے میں اللہ نے دعوت دی ہے کہ دوڑو' ایک دوسرے سے مسابقت کرو' آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے پاس دنیا کا مال و اسباب زیادہ ہوجائے' زینت زیادہ ہوجائے۔ یہ سب تو فنا ہونے والا ہے۔ سَابِقُوْا ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اور سَارِعُوْا تیزی کے ساتھ بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف' جس کی وسعت زمین اور آسمان کے برابر ہے۔ یہ بالکل اس آیت سے متصل ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب اس لیے اتاری' رسول اس لیے بھیجے' میزان اس لیے اتاری کہ لوگ انصاف پر قائم ہوسکیں۔ اور لوہے کی قوت اس لیے دی کہ جب قوت کی ضرورت ہو تو لوگ قوت کو استعمال کریں۔

جب بھی یہ مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور امت بھول گئی کہ یہ امت کس لیے بنی ہے اور جب بھی اس مقصد کی محبت دلوں سے اتر گئی' اس پر دنیا کی محبت غالب ہوگئی اور لوہے کی قوت کو استعمال کر کے قربانی کی جو ضرورت تھی اسے ترک کردیا تو دنیا میں ذلت و مسکنت حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ مال کا' کھیتی باڑی کا ان سب کا نقصان ہوگا' بھوک سے اور خوف سے اور ڈر سے ضرور آزمایا جائے گا۔ یہ آزمائش اللہ تعالیٰ

نے ایمان کے ساتھ رکھ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: اگر تمھارے باپ اور بیٹے اور بیویاں اور تجارتیں اور مکانات' ان میں سے کوئی چیز تمھیں اللہ سے زیادہ محبوب اور پیاری ہے تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو جو شکست اور مغلوبیت کی صورت میں تمھارے اوپر آئے گا۔ جب بھی ایسا ہوا' تاریخ میں مسلمانوں کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اگر ڈیڑھ سو سال پہلے مغرب کی قومیں اٹھیں اور بھوکوں کی طرح مسلمانوں کے دستر خوان پر گر گئیں اور ان کے وسائل و ذرائع' لوٹ کے غلام بنایا' ذلیل کیا' تعلیم کو بدلا' قوموں کو اپنے مقصد سے غافل کر دیا اور سب کو تقسیم کر کے' لڑا کے یہاں سے وہ چلے گئے۔ بظاہر تو چلے گئے لیکن ان کے پنجے اب بھی گڑے ہوئے ہیں۔ ہندستان میں انگریز' انڈونیشیا میں ولندیزی اور الجزائر میں فرانس نے یہی کیا۔ یہ سب اسی لیے ہوا کہ یہ امت اپنے مقصد سے غافل ہوگئی' اور اس کو بھول گئی۔ اس امت کا جواز صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کے لیے جدوجہد کرنے کو تیار ہو' اس کے لیے قربانیاں دینے کو تیار ہو اور اس کے لیے موت کے منہ میں جانے کو تیار ہو' زندگی کو اس مقصد سے زیادہ محبوب اور عزیز نہ رکھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے لیے بیان فرمایا ہے اور جو فی الحقیقت اس پوری امت کا مقصد ہے اور جس کے ساتھ اس امت کی زندگی وابستہ ہے۔

اس حدیث کا اصل مطلب تو یہ ہے کہ یہ امت اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرنے میں مقصد سے زیادہ دنیا سے محبت کرنے لگے گی تو اس امت کا یہ حال ہو جائے گا کہ دنیا کی ساری قومیں ایک دوسرے کو بلائیں گی کہ آؤ' دستر خوان بچھا ہوا ہے' اور بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گی۔ سوا ارب کی تعداد کے باوجود' اسلحے کے ذخائر ہونے کے باوجود' ہزاروں ہوائی جہاز اور ٹینک رکھنے کے باوجود وہی حال ہوگا جیسا نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ جس طرح پانی کے اوپر جھاگ ہوتا ہے۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں تمھارا رعب ہوگا' نہ ہیبت ہوگی' نہ خوف ہوگا اور وجہ تمھارے دل کی یہی بیماری ہوگی۔ اس کی وجہ سے تم اپنے مقصد کے لیے کوئی بھی قربانی دینے سے عاجز ہوگے' دنیا کی محبت غالب ہوگی اور موت کا خوف بھی ہوگا۔ موت سے کراہت اور دنیا کی محبت وہ چیز ہے جس سے ملت اور قوم اپنے مقصد پر چلنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو بیان فرمایا ہے اور کہا ہے کہ بنی اسرائیل

نے کہا کہ ہم کو من اور سلویٰ نہیں چاہیے' ہم کو تو کھیتی باڑی چاہیے' گیہوں چاہیے' دال' پیاز' لہسن چاہیے۔ دراصل جب من اور سلویٰ کھا رہے تھے تو زندگی جہاد کی زندگی تھی۔ اپنے گھر بار سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کی یہ درخواست کہ من اور سلویٰ نہیں چاہیے بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ بیٹھیں کھیتی باڑی کریں اپنا گھر بسائیں اور اپنے دنیا کے کام کرتے رہیں تو یہ دراصل سخت کوشی کی زندگی سے' جو دنیا پر جہاد کو ترجیح دینے کی زندگی تھی' فراغت اور جہاد سے فرار کی خواہش کا اظہار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا تم بس جاؤ' شہر بساؤ' تہذیب بناؤ اور پھر فرمایا: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُ وا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی ہے اور اللہ کا عذاب ان کے حصے میں آیا۔''

آج امت مسلمہ کا بھی یہی حال ہے کہ ہم آرام و سہولت کی زندگی چاہتے ہیں۔ اگر ہم دنیا میں عزت' سربلندی اور غلبہ و اقتدار چاہتے ہیں تو ہم کو سعی و جہد اور قربانی کی زندگی اختیار کرنی ہوگی۔ ہم دنیا سے محبت نہ کریں' اس کے پیچھے نہ دوڑیں' یہ خود ہمارے قدموں میں آئے گی اور آخرت کی فلاح بھی ملے گی۔

نیت اور عمل

عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِيْنَ أَبِيْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا ۔ فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ۔"

(بخاری، مسلم)

امیرالمومنین حضرت ابوحفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

اعمال کی جزاوسزا کا دارومدار انسان کی نیت پر مبنی ہے اور ہر انسان کے لیے اس کے عمل میں وہ کچھ ہے جس کی اُس نے نیت کی ہے۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اُس کے رسولؐ کے لیے ہے تو واقعتاً اس کو اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کا ثواب میسر آئے گا اور جس کی ہجرت حصولِ دنیا یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہے تو اس کے حصے میں وہی آئے گا جس کے لیے اُس نے وطن چھوڑا۔

نیک اعمال کرنا ہم سب چاہتے بھی ہیں اور جتنا بن پڑے کرتے بھی ہیں۔ یہ نیک اعمال طرح طرح کے ہوتے ہیں اور طرح طرح کے لوگ یہ اعمال کرتے ہیں۔ ایک بڑا اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہر عمل جو دیکھنے میں نیک دکھائی دیتا ہو وہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا؟ یا کوئی ایسی شرائط ہیں کہ جن کا ظاہری شکل صورت کے علاوہ بھی عمل کے ساتھ ہونا ضروری ہے اور جن کے بغیر عمل قبول نہیں ہوگا۔

اس اہم سوال کا جواب اس حدیث میں دیا گیا ہے جو میں اس وقت آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس حدیث کو حضرت عمر بن الخطابؓ نے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود حضورؐ کو ارشاد فرماتے سنا کہ آپؐ نے فرمایا: بے شک سارے اعمال اپنی نیتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہے جس کی کہ وہ نیت کرے۔ مثلاً جس نے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہوئی اور جس نے اس لیے ہجرت کی کہ کچھ دنیا حاصل کرے' یا کسی عورت سے نکاح کرے' تو اس کی ہجرت اسی طرف شمار ہو گی جس طرف اس نے ہجرت کی۔

یہ حدیث بخاری' مسلم اور دیگر کتابوں میں روایت کی گئی ہے۔ تھوڑا بہت الفاظ کا اختلاف ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔ گویا انھوں نے ہزاروں احادیث کے مجموعے میں اس کو سب سے اول رکھا اور احادیث کے پورے مجموعے کا عنوان بنایا۔ اگرچہ انھوں نے جس باب کے تحت درج کیا ہے' وہ یہ ہے کہ وحی کس طرح شروع ہوئی لیکن وحی کے بیان سے پہلے وہ اس حدیث کو نفس مضمون اور تعلیم کے لحاظ سے درج کرتے ہیں۔

محدثین اور علما نے اسے بہت عظیم الشان احادیث میں شمار کیا ہے۔ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق اس حدیث میں ایک تہائی دین موجود ہے۔ اس لیے کہ ایک تہائی دین تو یہی ہے کہ جو عمل بھی ہو اللہ کے لیے ہو۔ وہ حدیث جس کے مطابق سارے جسم کی بھلائی اور برائی دل کے لوتھڑے پر منحصر ہے' وہ بھی ان تین احادیث میں سے ہے جن پر سارا دین قائم ہے۔ انھی تین میں سے یہ حدیث بھی ہے جس میں نبی کریمؐ نے نیت کے بارے میں بیان فرمایا ہے: اعمال تو نیت کے مطابق ہوتے ہیں۔

عمل کس چیز کو کہتے ہیں؟ عمل کے معنی ہیں کام کرنا۔ مثلاً نماز ایک عمل ہے' روزہ ایک عمل ہے' غریبوں کے اوپر خرچ کرنا ایک عمل ہے' جہاد میں شریک ہونا اور شہید ہونا بھی عمل ہے۔ اس طرح کے بے شمار اعمال ہیں جو ہر آدمی اپنے ہاتھ' پاؤں اور جسم کے دوسرے اعضا سے کرتا ہے۔ یہ سارے کے سارے اعمال اس حدیث کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان کی اصل قیمت اور حیثیت کا تعین عمل کی ظاہری شکل وصورت سے نہیں ہوتا' بلکہ اس کا تعین اس نیت سے ہوتا ہے جو اس عمل کے پیچھے ہو۔ کام جس غرض کے لیے جس مقصد کے لیے کیا گیا

ہے' اس سے یہ بات طے ہوگی کہ عمل کا درجہ کیا ہے؟ یہ قبول ہوگا یا نہیں؟ اس پر اجر ملے گا یا نہیں؟ اور اگر ملے گا تو کتنا؟

نیت کے معنی کیا ہیں؟ نیت کے معنی ہیں: کسی کام کا ارادہ کرنا اور پھر یہ طے کرنا کہ میں یہ کام کس لیے کر رہا ہوں۔ خواہ یہ بات آدمی زبان سے کہے یا نہ کہے' اس بات کے لیے کوئی مخصوص الفاظ استعمال کرے کہ میں نیت کرتا ہوں واسطے اللہ تعالیٰ کے' یا نہ کرے۔ لیکن دل میں جس چیز کا بھی مقصد ہے' جو مطلوب ہے' جو دل نے طے کیا ہے کہ میں اس عمل سے کیا چاہتا ہوں' وہ دراصل نیت ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں عمل تو انسان کے جسم کا کام ہے' اور جسم کے اندر ہاتھ پاؤں سب شامل ہیں' اور نیت اس کے دل کا کام ہے۔ اس طرح اسی بات کی مزید تشریح ہوگئی کہ دل سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے اور اگر دل بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔

دل کے اندر جو سب سے پہلی چیز سدھرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں' یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ کام ہم کس لیے کرتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی بات کہی گئی ہے' اسی بات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ جو حضورؐ نے فرمایا کہ اعمال نیت کے مطابق ہوتے ہیں' اس کو مختلف انداز میں لوگوں نے سمجھا ہے یا سمجھا جاسکتا ہے۔ جو فقہا تھے انھوں نے کہا کہ جس عمل کی نیت صحیح نہ ہو وہ عمل ہی صحیح نہیں ہوگا۔ شافعی اس مسلک کے قائل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عمل کے صحیح ہونے کا مدار نیت کے صحیح ہونے پر ہے۔ حنفی اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ عمل کا ثواب نیت پر منحصر ہے' عمل تو صحیح ہو جائے گا۔ اگر نیت غلط ہوگی تو نماز تو ہو جائے گی' وضو ہو جائے گا' روزہ ہو جائے گا لیکن ثواب نیت کے مطابق ملے گا۔

لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں تو حدیث کا مطلب ان دونوں سے زیادہ وسیع ہے۔ حدیث کے الفاظ میں صرف اس بات سے بحث نہیں ہے کہ عمل صحیح ہوگا یا غلط ہوگا۔ اگر کسی نے ہجرت کی' وطن چھوڑا' مدینے گیا' یا کسی دوسرے ملک میں گیا تو ہجرت تو ہو جائے گی' اور نہ صرف اتنی بات ہے کہ اس کا ثواب اس کو کتنا ملے گا' بلکہ جو بات کہی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ عمل تو دراصل ایسی چیز ہے جو قبول ہونا چاہیے اور اس میں برکت بھی ہونی چاہیے اور اس کے اثرات دل پر ہونے چاہییں' اور ساری زندگی پر پڑنے چاہییں۔ عمل کو ایک پودے کی طرح پھلنا اور پھولنا چاہیے۔ نیت کی حیثیت ایک بیج کی ہے۔ اگر بیج میں خرابی ہوگی تو اس میں نہ

برکت ہوگی نہ نشو ونما ہوگی۔ نہ وہ پھلے گا پھولے گا اور نہ اس کے اندر ترقی ہوگی۔ اور اگر بیج صحیح ہوگا، نیت صحیح ہوگی تو نہ صرف یہ کہ وہ عمل قبول ہوگا، بلکہ اس میں برکت ہوگی۔ نہ صرف اس عمل کا ثواب ملے گا بلکہ وہ عمل پھلے پھولے گا۔ اس کی شاخیں، اس کے پتے اور اس کے پھول انسان کی زندگی، اس کے کردار اور اعمال میں پھلیں گے اور اس کو حسن اور خوب صورتی عطا کریں گے۔ گویا دوسرے الفاظ میں جس عمل کی نیت صحیح ہوگی وہ اللہ کے یہاں قبول ہوگا۔ جس کی نیت صحیح نہیں ہوگی وہ قبول نہیں ہوگا، بلکہ اٹھا کر اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔ یہ بات ہے جو اس حدیث میں کہی گئی ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کام تو پورا وہی کر رہا ہے جو کیا جانا چاہیے۔ وہ نماز پڑھتا ہے، وضو کرتا ہے، کھڑا ہوتا ہے۔ قیام، سجدہ، رکوع، تلاوت ساری چیزیں بجا لاتا ہے۔ دوسرا آدمی بھی وہی کام کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بظاہر کوئی فرق نہیں۔ ایک آدمی تلوار بندوق لے کر نکلتا ہے، میدان جنگ میں جاتا ہے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے۔ دوسرا آدمی بھی یہی سب کچھ کرتا ہے۔ کوئی شکل صورت میں فرق نہیں۔ اسی طرح ایک آدمی اپنا گھر چھوڑتا ہے، ترک وطن کرتا ہے، سفر کرتا ہے، دوسری جگہ جا کر بستا ہے۔ دوسرا بھی یہی کرتا ہے۔ دونوں نے شکل صورت کے لحاظ سے ہجرت کی ہے۔ پہلے نے نماز پڑھی، دوسرے نے جہاد کیا، شہادت پائی، تیسرے نے ہجرت کی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کے اعمال کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا انحصار نیت پر ہے۔

اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اصل چیز تو ہمارا اپنا ارادہ ہے۔ اللہ نے جس چیز پر ہمیں اختیار بخشا ہے وہ ہمارا ارادہ ہے۔ جس بات کے لیے وہ ہم کو آزما رہا ہے وہ بھی یہی ہے کہ ہم ارادہ کیا کرتے ہیں۔ کام کا ہونا نہ ہونا، یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ممکن ہے ہم نماز پڑھنے نکلیں، اور راستے میں روک دیے جائیں۔ کوئی حج کے لیے نکلے اور راستہ بند ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعمال اس کے اختیار سے باہر ہو جائیں۔ لیکن ایک چیز ایسی ہے جو آدمی کے بالکل اختیار میں ہے اور وہ اس کے دل کی نیت اور ارادہ ہے۔ اس ارادے اور نیت کی طاقت اور اختیار اللہ نے ہمیں اور آپ کو سب کو بخشا ہے۔ انسان کی آزمائش یہی ہے کہ ہم میں سے کون اپنے اختیار اور ارادے کو اپنی مرضی سے اللہ کی راہ پر چلنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور

کون نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے بھی عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم نیک اعمال اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوں' اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا اجر وثواب ہمیں عطا فرمائے' تو جو کام ہم اللہ کے ثواب کی نیت سے نہ کریں' اس کا ثواب آخر اس سے کیوں پائیں؟ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اعلان فرمائے گا کہ تم نے جن لوگوں کو بھی اپنی نیتوں میں شامل کیا' جن لوگوں کے بارے میں تم نے سوچا کہ ہم ان سے اپنا اجر حاصل کریں گے' ان کے پاس جاؤ اور ان سے اپنا اجر وثواب طلب کرو۔ اگر تم نے اس لیے کیا کہ لوگ مجھے اچھا مسلمان سمجھیں تو لوگوں سے جا کر ثواب طلب کرو۔ اگر تم شہید اس لیے ہوئے کہ لوگ کہیں کہ یہ تو بڑا بہادر تھا یا اس لیے ہوئے کہ قوم کی بلندی اور حمیت پیش نظر تھی تو قوم سے ہی اجر لو۔ اگر خرچ اس لیے کیا کہ لوگ کہیں یہ تو بڑا سخی ہے' غریبوں کا ہمدرد ہے تو ثواب اور اجر بھی ان سے ہی حاصل کرو۔

ظاہر ہے کہ دنیا کے اندر تو یہ ہوسکتا ہے کہ غرض کچھ اور ہو نتیجہ کچھ اور نکلے' لیکن آخرت میں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا اور وہی نتیجہ نکلے گا جو کرنے والے کے سامنے اور پیش نظر ہے۔ اگر کرنے والے کے پیش نظر اللہ اور رسول تھے تو پھر اس کے سب کاموں کا وہ نماز ہو' روزہ ہو' زکوٰۃ ہو' حج ہو' ہجرت ہو' غریبوں کی ہمدردی ہو' اپنے فرائض کی ادائیگی ہو' دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہو' ان سب کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ اگر یہ مقصود ہی نہ ہو' یہ نیت ہی نہ ہو' یہ غرض ہی نہ ہو کہ ہمیں اس کا اجر اور ثواب اللہ سے حاصل کرنا ہے' تو پھر اس کا ثواب اور اجر اس سے نہیں ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اعمال کا سارا دارومدار نیت پر ہے۔

یہ حدیث براہ راست واضح طور پر تو نہیں کہتی کہ نیت کیا ہونی چاہیے' اور کون سی نیت اللہ کے یہاں قبول ہے اور اس کے علاوہ کوئی نیت قبول نہیں ہے' لیکن بالواسطہ یہ بات بالکل کھل کر بیان کی گئی ہے۔ ہجرت کی جو مثال نبیؐ نے بیان کی ہے اس سے یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے' یعنی جس نے اللہ اور رسول کی طرف یا اللہ اور رسول کے لیے ہجرت کی' اس کی ہجرت تو اللہ اور رسول کے حساب میں جائے گی۔ ان کی ہجرت قبول ہوگی اور ان کے حساب میں لکھی جائے گی۔ لیکن اگر وہ ہجرت کسی اور نیت سے ہوئی' دنیا کے لیے ہوئی' کسی تجارت کے لیے ہوئی' مالی نفع کے لیے ہوئی' کسی عورت سے نکاح کے لیے ہوئی تو وہ ہجرت اس کے حساب میں

لکھ دی جائے گی جس کے لیے وہ ہجرت کی گئی۔

دوسرے الفاظ میں اس حدیث کا بالکل بنیادی اور بڑا اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو کام بھی ہم کریں وہ صرف اس لیے کریں کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو۔ جو کام کریں اللہ کے لیے کریں' اس کی رضا کے لیے کریں۔ مال خرچ کریں تو اس کے لیے کریں' نماز پڑھیں تو اس کے لیے پڑھیں' سیاست کریں تو اس کے لیے کریں' تجارت کریں تو اس کے لیے کریں۔ کام کی ظاہری شکل صورت سے یہ طے نہیں ہوتا کہ اس کا اجر کیا ملے گا۔ اگر ایک آدمی دنیا کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس نماز کا کوئی اجر نہیں۔ اگر ایک آدمی اس لیے روزی کماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے کہ اپنے بچوں کا پیٹ بھرے' غریبوں کی مدد اس لیے کرتا ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے تو اس کا روزی کمانا اللہ کے نزدیک بڑا محبوب اور بڑا مقبول عمل ہے۔ تلوار چلانا' خون بہانا بظاہر ایک بڑا خراب کام ہے لیکن یہی کام اگر اس لیے ہو کہ اللہ کا دین غالب ہو' زمین پر اسلام قائم ہو اور خدا کی مرضی یہاں چلے تو یہ اللہ کے نزدیک اعلیٰ درجے کا محبوب کام ہے۔ ہم جو عام طور سے یہ تقسیم کرتے ہیں کہ یہ کام دینی کام ہے اور یہ دنیاوی کام ہے اور یہ کام سیاسی کام ہے' اس طرح کی کوئی تفریق اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام میں ہر وہ کام جو اللہ کی مرضی کے مطابق اس کو خوش کرنے کے لیے' اس کے حکم کے مطابق ہو وہ بظاہر کتنا ہی دنیوی کیوں نہ ہو' وہ دینی کام ہے۔ ہر وہ کام جو اللہ کی مرضی کے مطابق نہ ہو' اس کو خوش کرنے کے لیے نہ ہو' اللہ کے حکم کے مطابق نہ ہو' وہ بظاہر کتنا ہی دینی کام کیوں نہ ہو' وہ دنیاوی کام ہوتا ہے۔

ایک اور بڑی لرزہ انگیز حدیث ہے' جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور تین آدمی لائے جائیں گے۔ ایک قرآن کا عالم اور اس کا درس دینے والا ہوگا۔ دوسرا اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا ہوگا۔ اور تیسرا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہوگا۔ تینوں کو اللہ تعالیٰ اپنے احسانات جتائے گا۔ قرآن والے سے کہے گا: میں نے تجھے قرآن کا علم دیا' تو نے اس سے کیا حاصل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے قرآن کو بھی پڑھا' سمجھا اور بیان بھی کیا۔ اللہ فرمائے گا کہ نہیں' تو نے تو یہ کام اس لیے کیا کہ لوگ کہیں کہ یہ شخص تو قرآن کا بڑا اچھا عالم اور بڑا اچھا درس دینے والا ہے۔ شہید سے پوچھے گا: میں نے تجھے جسم دیا' لڑنے کی صلاحیت دی' جوانی دی' تو نے انھیں کس کام میں صرف کیا؟ اس سے کیا فائدہ اٹھایا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری

راہ میں لڑا' میں نے جان قربان کی۔ اللہ کہے گا: نہیں تو نے یہ اس لیے نہیں کیا کہ تو مجھے خوش کرے۔ جس کو مال دیا تھا' اس سے پوچھے گا: میں نے تجھے اتنا سارا مال دیا۔ تو نے اس کا کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ اس مال کو میں نے دن رات تیری راہ میں خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا کہ تو نے یہ اس لیے کیا کہ لوگ کہیں کہ یہ تو بڑا سخی ہے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے۔ حدیث میں پھر یہ الفاظ آتے ہیں کہ تینوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ تو گویا یہ دینی اعمال' تعلیم قرآن' شہادت اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا' ان کی بھی قبولیت کا دارومدار ان کی نیت پر ہے۔ جو اللہ کے حکم کے مطابق ہوا' وہ قبول ہوا اور جو نہیں ہوا' وہ قبول نہیں ہوا۔

اس بات کو قرآن مجید میں بہت ہی واضح الفاظ میں بار بار کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۵ۙ (البینۃ :۵) ''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں تو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرلیں۔'' اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ (الزمر:۳) ''ساری اطاعت' ساری بندگی' سارا نظام اللہ کے لیے خالص ہونا چاہیے''۔ اس کے لیے قرآن مجید نے دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ایک اللہ کی رضا کی تلاش' یعنی جو کام اس لیے کیا جائے کہ اس کام کے ذریعے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو' وہ ہم سے خوش ہوجائے اور دوسرے یہ کہ کام لوجہ اللہ کیا جائے ۔ وجہ کہتے ہیں' چہرے کو۔ جب آپ کسی کی طرف چہرہ کرتے ہیں تو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چہرہ پوری شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کی طرف چہرہ کیا' اس کی طرف پوری شخصیت کا رخ ہوگیا۔ اس کے بالکل لفظی معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کے چہرے کے لیے کام کرتے ہیں۔ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وہ اس کا چہرہ تلاش کرتے ہیں' اس کا ارادہ کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا مقصود اللہ کی توجہ' اس کی خوشنودی اور اس کی رضامندی ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے یہ دو الفاظ اور استعمال کیے ہیں اور جہاں بھی مال دینے کا ذکر کیا ہے وہاں فرمایا ہے: وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ (لیل:۲۰،۲۱) اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب اعلیٰ کے چہرے یعنی اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کام کرتا ہے۔ جو لوگ غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں' قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں' غریبوں کی خدمت کرتے ہیں' قرآن کہتا ہے یہ نیکی

کے کام صرف ان لوگوں سے قبول ہوں گے جو یہ کام کرتے ہوئے کہتے ہیں: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ (الدہر:۹) ہم تو جو کچھ بھی تم کو کھلا رہے ہیں لوجہ اللہ صرف اللہ کی خوشنودی اور توجہ کے لیے کھلا رہے ہیں۔ نہ ہمیں تم سے کوئی بدلہ چاہیے اور نہ کوئی شکرگزاری چاہیے۔ لوگ تو اتنا سا دے کر کہتے ہیں کہ ہم نے اتنا دیا اور یہ احسان بھی نہیں مانتے۔ اس طرح اجر ضائع ہوجاتا ہے۔ قرآن نے اسے بہت کھول کر بیان کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے: جو لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے' اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی چٹان پر مٹی ہو۔ اس پر بارش ہو تو پانی سب مٹی بہا لے جائے گا۔ زمین کے حصے میں کوئی نمی نہیں آتی ہے۔ جیسے بارش ساری مٹی کو بہا لے جاتی ہے' اسی طرح ان کے سارے اعمال بہہ جاتے ہیں۔ اور جو اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں تو ان کی مثال ایسی ہے کہ کوئی باغ ہو جہاں مٹی نم ہو' زرخیز ہو۔ ذرا سا بھی پانی گرے تو تُؤْتِیْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ کھیتی کئی گنا پھلتی اور پھولتی ہے۔ اور اگر وہاں پر مٹی نہ ہو اور بارش نہ بھی ہو تو ذرا سی نمی بھی اس کے لیے کافی ہوتی ہے اور فوراً پھل پھول نکلنے لگتے ہیں۔

اللہ کی رضا کی تلاش سامنے ہونا چاہیے۔ ہر چیز اسی سے وابستہ ہے۔ ایک مسلمان کے لیے زندگی میں سب سے اہم سوال یہ ہونا چاہیے کہ میں یہ کام کس لیے کر رہا ہوں؟ اور اگر وہ کام اللہ کے لیے ہے اور اللہ کو ناپسند نہیں ہے تو کرنا چاہیے۔ جو کام اللہ نے منع کیے ہیں' وہ اللہ کے لیے کرنے سے نیک نہیں ہوجاتے۔ کوئی آدمی کہے: میں چوری کروں گا' ڈاکہ ڈالوں گا' کسی کا حق ماروں گا' لیکن غریبوں کی مدد کروں گا۔ بہت سے لوگوں کا یہ فلسفہ بھی ہوتا ہے کہ ہم چوری کر کے' ڈاکہ ڈال کر لوگوں کی مدد کریں۔ جو کام اللہ تعالیٰ نے منع کردیا ہے اور حرام کردیا ہے' اس کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جارہی ہے۔ یہ بات تو کہی ہی ان اعمال کے بارے میں جارہی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے اور ان کا حکم دیا ہے کہ یہ کام اگر اچھی نیت سے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا اور بری نیت سے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا۔

اس کے بعد ایک اور بات کہی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ لِكُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰى "ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔" اس کے ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ یہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کی تاکید ہے۔ وہ تو ایک اصول تھا جو حضورؐ نے بیان فرمادیا۔ پھر اس کی تاکید

کے لیے ہماری آپ کی زندگی سے متعلق کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ محض اصول نہیں ہے' بلکہ تمھارے لیے وہی کچھ ہے جس کی تم نیت کرو۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ پھر آدمی کے ثواب کی مقدار اس کی نیت کے مطابق ہو۔ نیت میں جتنا اخلاص ہوگا' نیت میں جتنی اللہ کی طرف توجہ ہوگی اتنا ہی ثواب ہوگا۔ ایک اور معنی اس کے یہ ہوسکتے ہیں کہ ہر آدمی کے لیے اپنی ہی نیت کا ثواب ہو۔ دوسرے کی نیت اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاسکتی کہ دوسرا کوئی نیت کرے تو اس سے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہر آدمی کو جو اجر و ثواب ملے گا' کوئی اس کو فائدہ پہنچے گا' تو یہ ثواب اور اجر صرف اس کی اپنی نیت کے نتیجے میں ملے گا' اس لیے کہ اعمال کا سارا دارومدار نیت پر ہے۔ اور جس کام کی آدمی نیت کرے اسی کا اجر اس کے لیے ہے۔ میں یہاں پر ان فقہی بحثوں میں نہیں جارہا کہ نیت کا زبان سے کہنا ضروری ہے یا نہیں ہے اور نیت نہ ہو تو اعمال صحیح ہیں یا غلط ہیں' اس لیے کہ یہ فقہی مسائل میری گفتگو کا موضوع نہیں ہیں۔ میرا تو موضوع ہے کہ ہم اپنی اصلاح کریں' اپنے دل کو پاکیزہ بنائیں' اپنے اعمال کو اللہ کے لیے خالص کریں۔

نیت کا مقام دل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اعمال کو صحیح کرنے کے ساتھ' اپنے دل کو بھی پاک کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم میں سے بے شمار لوگ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں' زکوٰۃ نکالتے ہیں اور بھی کوئی کار خیر آئے تو کھڑے ہوجاتے ہیں' اس کی راہ میں مال دیتے ہیں' کوئی غریب آجائے تو اس کے ہاتھ میں خیرات بھی تھما دیتے ہیں' رشتہ داروں کے حقوق بھی ادا کرتے ہیں۔ اگر ان کاموں میں غلط نیت نہ ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اجر ضائع نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ غلط نیت نہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اجر ضائع نہیں کرے گا۔ لیکن ان اعمال کی جو تاثیر ہے' ان کا زندگی پر جو اثر پڑنا چاہیے' ان سے جو برکت زندگی کے اندر پیدا ہونی چاہیے' وہ نہیں ہوگی۔ میں نے آپ کو بیج اور درخت کی مثال دی تھی۔ اس کے مطابق یہ تو پھر ایسا ہے کہ آپ نے بیج ڈال دیا' اس بیج میں جو کچھ ہے وہ تو آپ کو مل جائے گا' لیکن اس سے زیادہ کچھ ملنا مشکل ہے۔ لیکن اگر آپ نے خلوص کے ساتھ سوچ سمجھ کر یہ ارادہ کیا کہ کام اللہ ہی کے لیے ہے تو پھر تاثیر بھی ہوگی اور برکت بھی۔ اسی لیے ہمارے فقہا نے نیت کے الفاظ مقرر کیے ہیں۔ اس کو بعض لوگ ضروری سمجھتے ہیں اور بعض لوگ نہیں سمجھتے۔ اس کی جو تعلیم دی گئی ہے کہ میں نیت کرتا ہوں واسطے اللہ تعالیٰ کے' روزہ کے لیے بھی' نماز کے لیے بھی' وہ اسی

لیے ہے تا کہ ہر قدم پر آدمی زبان سے بھی کہے اور دل کے اندر بھی یاد کرے کہ یہ کام اللہ کے لیے ہے۔ جب یہ کام اللہ کے لیے ہوگا تو وہ محض قبول ہی نہیں ہوگا' بلکہ اس کی برکت زندگی کے اندر نظر آئے گی۔ اس کے اثرات زندگی پر پڑیں گے۔ یہ پھلے پھولے گا اور اس کے اثرات پوری زندگی میں انسان جگہ جگہ محسوس کر سکے گا۔

اس حدیث کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جو ہمیں اپنے سامنے رکھنے چاہییں۔ ایک بہت اہم پہلو اس کے اندر یہ ہے کہ اس حدیث نے ہم کو جس بات کی تعلیم دی ہے' اس میں اس نے ہجرت کا مقصد سامنے رکھا کہ جس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے ہوئی' اللہ اور رسول کی طرف ہوئی' تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے مانی جائے گی اور جس نے دنیا کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے کی' تو اس کی ہجرت اسی حساب میں جائے گی۔ آپ غور کریں تو ہجرت کا فعل اپنی جگہ بہت دینی اور نیک فعل ہے۔ ہجرت کئی قسم کی ہو سکتی ہے۔ ہجرت صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا جائے۔ یہ ہجرت اب ختم ہو گئی۔ احادیث کے اندر ہے کہ یہ ہجرت اب نہیں رہی۔ لیکن یہ ہجرت کہ جو چیزیں اللہ کو ناپسند ہیں' ان کو چھوڑ کر آدمی ان چیزوں کی طرف جائے جو اللہ کو پسند ہیں' یہ ہجرت تو ہر وقت ہر لمحے ہو سکتی ہے' زندگی کے ہر کام میں ہو سکتی ہے' ہر شعبے اور دائرے کے اندر ہو سکتی ہے۔ ہم یہ دیکھیں کہ وہ کون سے کام ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں اور وہ کون سے کام ہیں جو اس کو پسند ہیں۔ ناپسندیدہ کاموں کو چھوڑ کر' ان کاموں کی طرف جانا جو اس کو پسند ہیں' یہ بھی ایک حدیث کی رو سے ایک قسم کی ہجرت ہے۔ لیکن یہ کام بھی اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر اللہ کے لیے ہوگا تو اللہ کی طرف سے اس کا اجر اور ثواب ملے گا۔ اور اگر اللہ کے لیے نہیں ہوگا تو اللہ کے پاس اس کا اجر اور ثواب نہیں ہوگا۔

اس حدیث کا ایک اور بڑا عجیب اور بڑا لطف انگیز پہلو یہ ہے کہ اگر نیت موجود ہو' اور عمل نہ ہو سکے تو عمل کا پورا ثواب آدمی کو ملتا ہے۔ یہ بات ایک دوسری حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا جو قانون بنایا ہے' وہ یہ ہے کہ جب کوئی آدمی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو ایک نیکی اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ عمل کر لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو دس گنا کر دیتا ہے۔ اور اگر برائی کا ارادہ کرتا ہے اور

پھر اس سے رک جاتا ہے اور برائی نہیں کرتا تو برائی اس کے کھاتے میں نہیں لکھی جاتی۔ اگر برائی کر لیتا ہے تو پھر ایک برائی اس کے کھاتے میں لکھی جاتی ہے۔ یہ بات بہت ساری احادیث سے ثابت ہے کہ اگر آدمی نیکی کی نیت اور ارادہ کر لے اور کسی وجہ سے نہ کر سکے' تو اس کا ثواب پورے کا پورا اس کو ملتا ہے۔

غزوہ تبوک کے بارے میں ایک حدیث ہے۔ غزوہ تبوک میں لوگوں نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ سخت گرمی میں گئے تھے' فصل پکی ہوئی تھی۔ مدینے کے مٹھی بھر لوگ تھے جن کا رومن ایمپائر کی بہت بڑی فوج سے مقابلہ تھا۔ لوگ کانپ رہے تھے' ڈر رہے تھے۔ منافقین نے تو جانے سے انکار کر دیا تھا اور بہانے بنا رہے تھے۔ حضورؐ اس حالت میں مسلمانوں کی فوج لے کر رومیوں کے مقابلے پر گئے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ مدینے میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو اس جہاد پر نہیں نکلے' وہ تمھارے ساتھ راستہ بھی نہیں چلے' کسی وادی میں نہیں اترے' کسی گھاٹی پر نہیں چڑھے' لیکن وہ تمھارے پورے ثواب میں شریک ہیں۔ صحابہؓ کو بڑا تعجب ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ نہ انھوں نے ہمارے ساتھ سفر کیا' نہ اسلحہ لیا' نہ کوئی گھاٹی اور وادی طے کی' نہ پہاڑی پر چڑھے' نہ سفر کیا' نہ اونٹ کی پیٹھ پہ بیٹھے۔ ان کو ثواب کیسے ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: حَبَسَهُمُ الْمَرَضُ اَوِ الْعُذْرُ۔ ''ان کو یا تو مرض نے روک دیا' یا کوئی ایسا عذر تھا کہ وہ نہیں نکل سکے۔''

آدمی کو ہمیشہ نیکی کی نیت رکھنی چاہیے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ مجھے ایسا نسخہ بتائیں' کہ میں ہر وقت نیک کام کرتا رہوں اور میرا کوئی لمحہ ایسا نہ ہو کہ میں نیک کام نہ کروں۔ تو انھوں نے فرمایا: جو نیک کام تم کر سکتے ہو وہ تو کرو لیکن جب تم تھک جاؤ تو پھر نیکی کی نیت کرو کہ میں یہ نیک کام کروں گا۔ جو کام بھی کرو' وہ نیکی کی نیت سے کرو۔ اگر سونا چاہو تو اس لیے سوو کہ اللہ تعالیٰ جسم کے اندر اتنی قوت بھر دے کہ میں اس کی بندگی کر سکوں۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے۔ اگر بچوں کو کھانا کھلاؤ' ان کے لیے کماؤ تو یہ اس لیے کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ فرض عائد کیا ہے۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے۔ ان میں سے کچھ نہ کر سکو تو کم از کم یہ نیت رکھو کہ مجھے یہ نیک کام کرنا ہے۔ مشہور واقعہ ہے' سید احمد شہیدؒ کے ساتھیوں میں سے ایک حضرت یحییٰ تھے جنھیں انگریزوں نے بغاوت کے مقدمے میں گرفتار کیا اور پھانسی کی سزا دی۔

پھانسی کی سزا پر وہ بہت خوش ہوئے تو انگریزوں نے کہا کہ اچھا یہ تو ایسی سزا ہے جس سے یہ خوش ہے' اس لیے یہ سزا نہیں دیں گے۔ ان کو جیل میں بند کروا دیا۔ ان کی داڑھی مونڈی گئی تو ان کا حال یہ تھا کہ وہ داڑھی کے بال اٹھا اٹھا کر کہتے کہ اے داڑھی! تو اللہ کی راہ میں مونڈی گئی۔ جیل میں نماز جمعہ کی اجازت نہ تھی' ان کا طریقہ یہ تھا کہ جمعہ کے دن وہ غسل کرتے تھے' اچھے کپڑے پہنتے تھے' عطر لگاتے تھے اور جیل کے دروازے تک جاتے تھے۔ جیلر ان کو روک دیتا تھا کہ اب آپ نہیں نکل سکتے' تو واپس آجاتے تھے۔ اس عمل سے ان کی نماز جمعہ کے پورے ثواب کی نیت تھی کہ جتنا میں کر سکتا تھا' میں نے کیا۔ غسل کیا' کپڑے پہنے' خوشبو لگائی' چل کر دروازے تک گیا۔ وہاں پر روکنے والے نے روک دیا۔ آگے تو میں نہیں جا سکتا۔

یہ نیکی کی نیت رکھنا' اور جتنا کام کر سکے اس کو کرنا' یہ خود اس کے اندر شامل ہے۔ اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ بہت سارے نیک اعمال ہوتے ہیں جن میں نیکی کے بہت سارے پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں شمار کرایا ہے کہ آدمی اگر مسجد نماز پڑھنے کے لیے جائے تو وہ تقریباً نو دس اعمال کی نیت کر سکتا ہے۔ وہ نماز پڑھنے کی نیت بھی کر سکتا ہے' وہ اللہ کی راہ میں نکلنے کی نیت بھی کر سکتا ہے' وہ چند لمحات اللہ کے لیے معتکف ہونے کی نیت بھی کر سکتا ہے' وہ وہاں اللہ کے بندوں سے ملاقات کی نیت بھی کر سکتا ہے' وہ اللہ کے بندوں کی خدمت کی نیت بھی کر سکتا ہے۔ انھوں نے تقریباً نو دس باتیں شمار کروائی ہیں۔ آدمی اگر ان سب کی نیت کر لے تو ان سب کا ثواب اسے مل سکتا ہے۔ اس طرح آدمی ایک ہی عمل میں نیت کے ذریعے بے شمار اعمال کا ثواب جمع کر سکتا ہے۔

اس ایک حدیث کے اور بھی بہت سارے پہلو ہیں جو ہمیں سامنے رکھنا چاہییں۔ لیکن اصل بات جو اس میں ہمارے لیے ہے' وہ یہ ہے کہ ہم اعمال کی قدر و قیمت بنانے اور ان کو وزنی کرنے کی فکر کریں۔ قیامت کے روز عمل تو سب لے جائیں گے۔ سب کے ساتھ ترازو قائم کر دی جائے گی۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (الانبیاء: ۴۷) "قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے' پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا"۔ لیکن اعمال کی کیا قیمت ہے' یہ تو ہم اور آپ طے نہیں کر سکتے۔ اسے ناپنے کے پیمانے تو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ ہم گیہوں ناپ سکتے ہیں' تول سکتے ہیں' چاول تول

سکتے ہیں، سونے کو تول سکتے ہیں، چاندی کو تول سکتے ہیں، لیکن نماز کو، روزے کو، سچ بولنے کو، وعدہ پورا کرنے کو، بندوں کے حقوق ادا کرنے کو ناپ تول نہیں سکتے۔ ان کا وزن تو اللہ تعالیٰ دوسری ہی دنیا میں کرے گا۔ یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ زمین بھی بدل جائے گی، آسمان بھی بدل دیا جائے گا۔ اُس دنیا میں پتھر کا وزن نہیں ہوگا، سونے کا نہیں ہوگا، ڈالر کی قیمت نہیں ہوگی، پاؤنڈ کی قیمت نہیں ہوگی۔ وہاں کی کرنسی نیک اعمال ہوں گے۔ جو چیز ان اعمال کو اللہ تعالیٰ کے ترازو میں وزنی بنائے گی، وہ یہ ہے کہ یہ کس نیت سے کیے گئے ہیں۔ اگر غلط نیت سے کیے گئے تھے تو اٹھا کر منہ پر مار دیے جائیں گے جیسا کہ حدیث میں بہت واضح اور صاف ہے۔

ہم بہت سارے نیک کام کرتے ہیں۔ کوئی جمعہ کی نماز کے لیے آئے، یہ بھی ایک نیک کام ہے۔ پانچوں وقت کی نماز بھی ایک نیک کام ہے۔ غریبوں کی خدمت، بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی یہ سب نیک کام ہیں۔ اگر آپ اس حدیث سے اپنی زندگی کے لیے کوئی رہنمائی یا روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ یہ طے کر لیں کہ آپ جو کام بھی کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہوگا۔ مال خرچ کریں، نماز پڑھیں، سوائے اس کے کوئی اور نیت آپ کی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو۔ یہ چیز آپ کے اعمال کو صحیح بھی رکھے گی، اور ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول بھی بنائے گی۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بظاہر ایک چھوٹی سی بات ہے، ایک معمولی سا مطالبہ ہے لیکن نیت میں خرابی آجاتی ہے۔ بہت ساری چیزیں اس کے اندر آکر مل جاتی ہیں۔ آدمی ان کا علاج کر سکتا ہے۔ اپنی توجہ کو اللہ کی طرف کر سکتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ یہ کہ آپ اللہ سے ملاقات کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھیں۔ اور یہ یاد رکھیں کہ یہاں کا اجر تو عارضی ہے، اصل اجر تو وہاں کا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو دراصل بنیادی بات ہے۔ اس کو یاد رکھنے سے آپ کی نیت خالص رہے گی۔ آپ کوئی کام اس لیے نہیں کرتے کہ صبح وہ آپ کا مقام بنائے اور شام کو ڈھے جائے اور کچھ اس کا باقی نہ رہے۔ یہ تو آپ نہیں کریں گے۔ آپ یہ نہیں کرتے کہ یہ جانتے ہوئے تجارت کا محل تعمیر کریں کہ رات تک سارا نفع نقصان میں چلا جائے گا، بلکہ آپ تو وہ کام کرتے ہیں جس کا نفع باقی رہنے والا ہو۔ مکان آپ اچھی جگہ بناتے ہیں، سنگ مرمر لگاتے ہیں، اچھا فرنیچر بنواتے ہیں کہ زندگی بھر تو مکان رہے گا۔ آپ ایسی چیزوں

کے لیے کام کرتے ہیں جو فنا ہونے والی ہیں۔ تو جب وہ چیز فنا ہوگی تو کام بھی فنا ہوگا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے کہی ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ○ (الرحمٰن:۲۶، ۲۷) ہر چیز فنا ہو جائے گی' دنیا کی شہرت عزت جس کے لیے بھی آپ کام کریں گے' ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا' باقی صرف بزرگی اور شان والے تیرے رب کا چہرہ رہے گا۔ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے' اللہ کا چہرہ' اس کی خوشنودی' اس کی رضا باقی رہنے والی چیز ہے۔ اگر آپ نے اپنے اعمال کو اس باقی رہنے والی چیز کے ساتھ باندھ دیا' تو اعمال بھی باقی رہیں گے اور اگر آپ نے اپنے اعمال کو فنا ہونے والی چیز کے ساتھ باندھ دیا تو وہ چیزیں تو فنا ہو جائیں گی۔

حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے ستاروں کو دیکھا اور کہا کہ یہ رب ہیں۔ ستارے ڈوب گئے۔ چاند کو دیکھا اور کہا: یہ میرا رب ہے۔ چاند بھی ڈوب گیا' پھر سورج کو دیکھا تو کہا: نہیں' یہ میرا رب ہے۔ پھر سورج بھی غروب ہو گیا تو فرمایا: اِنِّیْ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ جو چیزیں ڈوبنے والی ہیں میں ان کے پیچھے کیوں دوڑوں؟ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام:۷۹) انھوں نے تو اپنی پوری شخصیت اور پوری زندگی کا رخ اللہ کی طرف کر دیا۔ میں نے اپنے چہرے کا رخ اس کی طرف کر دیا جو زمین اور آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ ایک ایک عمل کی نیت نہیں بلکہ پوری زندگی کا رخ' جس طرح نماز میں رخ قبلے کی طرف ہوتا ہے اسی طرح سے پوری زندگی کا رخ اللہ کی طرف' اللہ کے چہرے کی طرف' اس کی ذات کی طرف' اس کی خوشنودی کی طرف اور اس کی رضا کی طرف کر دیا۔ اس طرح پھر ہر عمل ٹھیک ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں یہی بنیادی تعلیم دی گئی ہے۔ اس لیے اس حدیث کو ثلث دین یعنی ایک تہائی دین کہا جاتا ہے۔ اس پر پورے دین کا مدار ہے۔ ہم اتنے سارے کام کرتے ہیں' ان کے مقبول ہونے یا نہ ہونے کا پورا انحصار اس پر ہے کہ ان کے پیچھے نیت کیا ہے؟ ہم اعمال کی نیت درست کریں اور ابراہیمؑ کی طرح جو چیزیں ڈوبنے والی' ختم ہونے والی' ہلاک ہونے والی' فنا ہونے والی ہیں ان کی خاطر کام کرنے کے بجائے اس کے لیے کام کریں جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

نیکی اور بدی

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرْوِيْهِ عَنْ رَّبِّهٖ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ:

"اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ: فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ، وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً." (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ فِي صَحِيْحَيْهِمَا بِهٰذِهِ الْحُرُوْفِ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اپنے پروردگار سے یوں روایت کی کہ اللہ نے (فرشتوں سے) تمام نیکیاں اور برائیاں لکھوا دی ہیں۔ پھر ان کی وضاحت یوں فرمائی:

جس نے کسی نیکی کا دل میں ارادہ کرلیا مگر اس پر عمل نہ کرسکا تو اس کے (نامہ اعمال میں) کامل نیکی کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے اور اگر دل میں نیکی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل پیرا بھی ہوا تو اس کے (نامۂ اعمال میں) دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہے بلکہ سات سو سے بھی کہیں زیادہ نیکیوں (کا ثواب لکھ دیتا ہے)۔ اور اگر کسی نے ایک برائی کا دل سے ارادہ کرلیا مگر اس پر عمل نہیں کیا (کرسکا) اللہ اسے بھی ایک کامل نیکی جتنا ثواب عطا کرتا ہے اور اگر برائی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر گزرے تو اس کے نامۂ اعمال میں محض ایک برائی کا (بدلہ) لکھا جاتا ہے۔

زندگی میں ہم جتنے بھی کام کرتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں: نیکی یا برائی۔ نیکی ہم اس لیے کرتے ہیں کہ اس پر ہم اپنے اللہ سے اجر کی امید رکھتے ہیں اور برائی سے ہم اس لیے بچنا چاہتے ہیں کہ اس پر ہم کو اللہ کے عذاب کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ دین آسان ہے' اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے بدلے کا قانون بھی بڑا آسان اور سراسر رحمت کا قانون رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث بخاری' مسلم اور حدیث کی دیگر ساری کتابوں میں ہے۔ اسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے روایت کیا ہے۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں اور انھی الفاظ میں یہ بخاری میں ہے۔ یہ ان احادیث میں سے ہے جن میں رسول اللہؐ اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہیں' یعنی حدیث کا سلسلہ حضورؐ پر ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کی بات ہے جس کو رسول اللہؐ نے روایت کیا ہے۔ حدیث کی یہ قسم جس میں نبی کریمؐ اللہ کی کسی بات یا اللہ تعالیٰ کے کسی کام کا ذکر کریں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا' یا وہ یہ کہتا ہے' یا اس نے یہ کیا اور یہ وہ کرتا ہے' حدیث قدسی کہلاتی ہے۔ ایسی احادیث قدسی کو محدثین نے الگ سے بیان بھی کیا ہے اور مجموعے بھی تیار کیے ہیں۔ امام نوویؒ نے بھی چالیس احادیث قدسی جمع کی ہیں۔ یہ حدیث بھی حدیث قدسی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ یہ ان باتوں میں سے ہے جو رسول اللہؐ اپنے رب سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ نے نیکیوں اور برائیوں کو لکھ لیا۔ پھر اس لکھنے کے عمل کی وضاحت یوں فرمائی کہ جس نے نیکی کرنے کا ارادہ کیا اور پھر اس کو نہیں کیا تو اللہ نے اس کو اپنے پاس سے مکمل نیکی کے برابر لکھ لیا۔ اگر کسی نے نیکی کا ارادہ کیا اور پھر اس کو کر لیا تو اللہ عزوجل نے اس کو اپنے پاس دس نیکیوں کے برابر لکھا' دس سے سات سو گنا تک لکھا بلکہ اس سے بھی اور بہت زیادہ بڑھایا۔ اور اگر اس نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور پھر اس کو نہیں کیا تو اللہ نے اس کو اپنے پاس ایک نیکی کے برابر لکھ لیا' اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا اور وہ کر بھی بیٹھا تو اللہ نے اس کو ایک برائی کے برابر لکھ لیا۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم کے علاوہ سارے ہی محدثین نے روایت کی ہے۔ یہ دین کی بڑی بنیادی تعلیمات پر مبنی ہے۔ دوسری روایت میں یہی الفاظ ہیں لیکن تھوڑا بہت فرق

ہے' مثلاً اس میں هَــمَّ کا لفظ ہے۔ یہ عربی زبان میں کسی کام کا پکا ارادہ کر لینا اور پھر اس کے کرنے کی فکر میں لگے رہنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض روایات میں تَـحَـدَّث کا لفظ ہے کہ خیال آ گیا' اس کو کر لیا۔ بعض احادیث میں ایسے الفاظ ہیں جن سے بہت سارے معنوں پر روشنی پڑتی ہے' مثلاً ایک حدیث میں جسے کئی محدثین نے روایت کیا ہے' یہ ہے کہ بندہ جب ارادہ کرتا ہے کہ وہ کوئی نیکی کرے تو اللہ فرماتا ہے کہ جب تک وہ اس کو نہ کرے میں اس کو نیکی کے طور پر لکھ لیتا ہوں۔ کر لے تو دس گنا یا اس سے بھی زیادہ دیتا ہوں۔ جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے' تو جب تک وہ نہ کرے تو میں اس ارادے کو معاف کرتا رہتا ہوں۔ جب وہ اس کو کر لیتا ہے تو اس کو برابر لکھتا ہوں۔ فرشتے کسی بندے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ یہ تو برائی کا ارادہ کیے ہوئے ہے' برائی کرنا چاہ رہا ہے۔ اس پر حدیث کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے زیادہ جانتا ہے' وہ دیکھ رہا ہے' اس کو معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس پر نگاہ رکھو اور اگر یہ کر لے تو اس کے بعد لکھ لو اور اگر یہ اس کو میری جزا کی امید میں اور میرے خوف سے چھوڑ دے تو پھر اس کو نہ لکھو' بلکہ نیکی کے طور پر لکھو۔ آپ دیکھیں کہ جس نے اللہ کے خوف سے یا اللہ سے اجر کی امید میں اس برائی کو جس کا خیال اس کے دل میں آیا اور اس کا اس نے ارادہ کر لیا' پھر اللہ کی خاطر ترک کر دیا تو وہ ایک نیکی بن جاتی ہے۔ اللہ کی خاطر کسی برائی کو چھوڑ دینا خود اپنی جگہ پر نیکی ہوتی ہے۔

احادیث بالعموم قرآن مجید کی تشریح ہوتی ہیں' اس کی تفسیر کرتی ہیں اور اس کی باتوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں' یا قرآن مجید کے احکام میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس حدیث کا مضمون بھی قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی آدمی نیکی کر کے آئے گا تو اس کو اس کا دس گنا اجر دیا جائے گا۔ یہ بات سورۃ الانعام میں کہی گئی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو آدمی ایک دانہ بھی خرچ کرے گا' اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانے میں سات بالیں نکلیں اور ہر ایک میں سو دانے ہوں۔ لہٰذا سات سو گنا جو اس حدیث میں آیا ہے' وہ قرآن مجید کی کہی ہوئی بات ہے۔ وَاللّٰـهُ يُضٰعِفُ لِـمَنْ يَّشَـآءُ اور پھر وہ جس کے لیے چاہے سات سو سے بھی زیادہ گنا بڑھاتا ہے۔ جو بات

حدیث میں کہی گئی ہے وہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور قرآن مجید کی تشریح ہے جو نبی کریمؐ فرما رہے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید نے بہت واضح کردی ہے کہ کسی کا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہوسکتا۔ کسی محنت کرنے والے کی محنت، کسی مزدوری کرنے والے کی مزدوری، کسی نیک عمل کرنے والے کا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہوسکتا، الا یہ کہ وہ اس کو اپنے ہاتھوں خود برباد کردے، خود ہی کنواں کھودے اور اس میں گر جائے اور خود ہی ایسے برے اعمال کرے جو نیکیوں پر غالب آجائیں۔ وہ اس کا اپنا کام ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کو لازماً لکھا جائے گا، وہ ضائع نہیں ہوتی۔ برائی کو اگر وہ چاہے تو لکھے اور اگر چاہے تو معاف کردے۔ اللہ کے دین کے اندر جو آسانی اور وسعت ہے وہ یہ ہے کہ ہم نیکی کا راستہ اختیار کریں، نیکیاں کریں، برائیوں کے راستے سے رک جائیں اور لازماً ترک کردیں۔

اس معاملے میں اللہ کا یہ قانون جو نبی کریمؐ نے حدیث قدسی کے طور پر بیان کیا ہے، بڑا دل کش، دل آویز اور بڑا اہم قانون ہے۔ اس کا ہر جز اپنی جگہ پر قابل غور ہے۔ پہلی بات جو اس کے اندر واضح طور پر نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اصل چیز کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہے۔ انسان کو جو طاقت دی گئی ہے، اختیار دیا گیا ہے، وہی اس کا امتحان ہے اور وہ اپنی شخصیت، اپنی ہستی، اپنے قلب، اپنے دماغ جو لفظ بھی آپ استعمال کریں ــــ قرآن مجید نے انسان کے اندر کی جو شخصیت کام کرنے کے فیصلے کرتی ہے اور کام کرتی ہے، اس کے لیے قلب کا لفظ استعمال کیا ہے ــــ اس کے ذریعے وہ اس اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ قرآن نے یہی کہا ہے کہ اصل زندگی قلب کی زندگی ہے، اصل موت قلب کی موت ہے۔ اصل بینائی قلب کی بینائی ہے، اصل اندھا پن قلب کا اندھا پن ہے۔ قیامت کے روز وہی آدمی نجات پائے گا جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا۔ اصل چیز آدمی کا ارادہ اور اختیار ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب سے پہلے یہی مقصود ہے کہ آدمی ارادہ کرے۔ یہاں اس کے لیے هَمَّ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ہمت سے زندگی سدھر سکتی ہے۔ یہ قرآن مجید کے ارشادات کی توضیح ہے۔ اللہ نے یوں فرمایا ہے کہ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (بنی اسرائیل:۱۹) جس نے آخرت کا ارادہ اور ہمت کرلی کہ مجھے آخرت کمانا ہے اور یہ عزم کرلیا اور پختہ ارادہ ہوگیا اور پھر اس کے لیے کوشش کی، جیسی کوشش کرسکتا ہے، جتنی

اس کی استطاعت ہے' جیسا کہ اس کا حق ہے اور ایمان کے ساتھ کی اور اللہ پر بھروسا رکھا' اسی کی خاطر کی' اس کی ساری کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی۔ اگر ہم اردو زبان میں لفظی ترجمہ کریں تو یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان نعمتوں کا شکرادا کرے گا۔ عربی زبان میں شکر قدردانی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے ہم مشکور ہوئے کہ سعی و کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی' ان کو قبول کیا جائے گا اور ان کا بدلہ دیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی نظر میں اصل قوت ارادے کی ہے۔ ہمارے ہاں ارادے کے لیے ایک دوسرا لفظ نیت استعمال ہوتا ہے۔ شریعت میں نیت کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ سب جانتے ہیں' ہم کو باقاعدہ الفاظ سکھائے جاتے ہیں کہ نیت کرتا ہوں اس چیز کی' واسطے اللہ تعالیٰ کے' پیچھے اس امام کے۔ لیکن بہت سارے فقہا کے نزدیک یہ زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے' لیکن دل میں نیت ہونی چاہیے۔ نیت میں ارادے سے زیادہ ایک اور چیز بھی شامل ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کس لیے کر رہا ہوں؟ ایک تو یہ ہے کہ میں اس کام کو کروں گا' یہ تو ارادہ ہے' عزم ہے' ہمت ہے' کوشش کرنے کا فیصلہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ کس لیے کروں گا؟ تو اس میں یہ تاکید ہے کہ آدمی اخلاص سے کرے۔ عمل کی ظاہر شکل وصورت نہیں' اس کے پیچھے جو نیت ہے وہ اصل بات ہے۔ آدمی اللہ کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہے۔ وہ اپنے ارادے اور نیت کو دیکھے۔ اصل جواب دہی اسی بات کی ہے کہ ارادہ کس چیز کا کیا اور کس چیز کا نہیں۔ جہاں بھی اس نے نیکی کا پختہ ارادہ کرلیا' پھر کرے یا نہ کرے' تو اس پر ایک نیکی اس کے نامۂ اعمال میں لکھی گئی۔ اس لیے کہ یہی تو اصل کام ہے کہ اس نے نیکی کا ارادہ کرلیا۔ نیکی کا ارادہ کرے گا تو نیک اعمال بھی ہوں گے' اگر کرے گا تو وہ اور آگے بڑھے گا۔ کس طرح بڑھے گا؟ اس کا قانون بھی بیان ہوگیا ہے لیکن یہ ارادہ کرنا خود ایک نیکی ہے اور اس لیے نیکی کی نیت اور ارادہ آدمی کو کرتے رہنا چاہیے۔ نیک کاموں کا حوصلہ کرنا چاہیے' نیکی کی ہمت کرنا چاہیے' سوچتے رہنا چاہیے کہ میں یہ نیک کام کرلوں' کسی بندے کا کوئی کام کردوں' اس کا قصور معاف کردوں یا پھر نرم بات منہ سے بول دوں۔

زندگی کے جو بھی دائرے ہیں' معاش کمانے کے ہیں' برتاؤ کے ہیں' اپنے نفس کے ہیں' اللہ کی عبادت کے ہیں' اس کی اطاعت کے ہیں' نماز' روزہ' زکوٰۃ' وغیرہ ان سب کے اندر

یہی اصول ہے کہ آدمی اپنا ارادہ ہمیشہ کیا کرے کہ جتنی بھی نیکیاں کر سکتے ہیں' کریں گے۔ ھَمَّ سے نکلا ہوا لفظ اردو زبان میں ہمت استعمال ہوتا ہے۔ ہمت کے معنی ارادے اور حوصلے کے ہوتے ہیں۔ ہمت کے معنی ہوتے ہیں کہ ہم اس کے لیے کوشش کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی ہمت والا آدمی ہے' اس کا بڑا حوصلہ ہے اور یہ بڑے ارادے کرتا ہے اور کاموں کو کر سکتا ہے۔ لہٰذا ھَمَّ یہ ارادہ' یہ فیصلہ اور عزم اپنی جگہ ایک بڑی نیکی ہے۔ ہماری اصل دولت تو اللہ کا دیا ہوا اختیار ہی ہے اور جواب دہی اسی کے استعمال کی ہے۔ اللہ کے ہاں مسئولیت اسی کی ہے کہ ہم کیا ارادے کرتے ہیں' کیا نہیں کرتے ہیں' کیا کام کرنے کے حوصلے کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاں یہی اصل چیز ہے۔

جو چیزیں اختیار سے باہر ہیں' ہمارے ارادے کے اندر نہیں آسکتیں' ارادے سے ہمیں حاصل نہیں ہو سکتیں' وہ دین کے لحاظ سے کتنی ہی اچھی ہوں' آدمی ان کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔ یہ بڑا اہم اصول ہے۔ جو لوگ اس کو نہیں جانتے' مایوسی کا شکار اور غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جو چیز آدمی کے اپنے ارادے اور کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتی' اس چیز کے لیے وہ جواب دہ نہیں ہے' اس کے لیے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اس کے لیے اللہ کے ہاں کوئی پکڑ نہیں ہوگی' مثلاً آپ نماز کا معاملہ لے لیں۔ وضو کرنا' نماز کے لیے کھڑے ہونا' نماز کی نیت باندھنا' نماز کے ارکان ادا کرنا یہ سب ہمارے اختیار میں ہے۔ یہ ہم نہ کریں تو ہم اس کے لیے جواب دہ ہیں۔ لیکن نماز میں دل کی توجہ' ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ دل کے اندر تو وسوسے آئیں گے' طرح طرح کے خیالات آسکتے ہیں' ان کے لیے کوئی جواب دہی نہیں ہے۔ دل کو خیالات سے پاک رکھنے کی کوشش نہ کی تو جواب دہی ہو سکتی ہے کہ تم نے کوشش کتنی کی لیکن دل میں خیالات آئیں' اس کی پکڑ نہیں ہے۔ نماز میں خشوع کی کمی ہے تو اضافہ مطلوب ہے لیکن لازمی نہیں۔ دل کی کیفیات ہیں' رونا آ گیا' گڑ گڑانا ہو گیا' یہ اس لیے مطلوب نہیں کہ اللہ کے ہاں جواب دہی نہیں ہوگی۔ ہاں' حاصل ہو جائے تو اللہ کا لاکھ شکر ہے' نہ حاصل ہو تو کوئی پکڑ اس پر نہیں ہوگی۔

دین کا بڑا بنیادی اصول ہے کہ جو اللہ نے کرنے کو کہا ہے آدمی اس کو کرنے کی نیت کرے، حوصلہ کرے اور اس کو حاصل کرے تو اس طرح اس کو ایک نیکی مل جائے گی۔ پھر وہ اس نیکی کو کر بھی دے تو پھر جتنی اس کی نیت اچھی ہے، جتنا خشوع ہے، جتنا خلوص ہے اس کے لحاظ سے کم از کم دس گنا اجر تو ہے، اس سے کم تو کسی کا بھی نہیں ہے لیکن سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ، اَضْعَافًا کَثِیْرًا کئی گنا زیادہ بڑھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اصول سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ آدمی نیکی کی ہمت کرے، پھر نیکی کا ارادہ کرے، ارادہ ہوگا تو کر بھی دے گا۔ یہ پہلا بڑا اہم اصول اس حدیث کے اندر بیان ہوا ہے۔ یہ بڑی اہم تعلیم ہے اور اس کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جو چیز بس سے باہر ہے، جیسے بھول جائے، خطا ہو، نسیان ہو، وسوسے دل کے اندر آ جائیں، ان کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی ایک حدیث میں بہت صاف کہہ دی گئی ہے کہ میری امت سے بھول چوک، نسیان اور جو کام زبردستی کرائے جائیں، ان کا کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ لوگ آ کر بیان کرتے تھے کہ ہم کو یہ وسوسہ آیا، یہ خیال دل میں آیا، ہم کو ایسے خراب خیالات آتے ہیں کہ اگر ہم ان کو زبان پر لائیں تو ہم خیال کرتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو ایمان کی روشنی ہے، اس لیے کہ چور تو اسی جگہ جاتا ہے جہاں مال ہوتا ہے۔ جہاں پر جتنا زیادہ مال ہوتا ہے وہاں پر ڈاکو اتنا زیادہ حملہ کرتا ہے۔ وسوسہ ہی تو شیطان کا ایک اختیار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اختیار اس کو نہیں دیا گیا ہے۔ وہ ہم سے ہاتھ پکڑ کر کام نہیں کرا سکتا، نہ پاؤں پکڑ کر کسی راستے پر چلا سکتا ہے۔ ایک ہی تو اختیار اس بے چارے کو دیا گیا ہے کہ دل میں یہ خیال ڈال دے یا وہ خیال ڈال دے۔ اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ آدمی کے بس میں نہیں ہے۔

کسی شخص نے مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سوال کیا کہ دل میں تو بے شمار خیالات آتے ہیں، کیا کیا جائے؟ فرمایا کہ دل تو ایک سڑک کی طرح ہے، جس پر اچھی گاڑیاں بھی چلیں گی، بری گاڑیاں بھی چلیں گی، گدھے بھی چلیں گے، کتے بھی چلیں گے، یہ تمھارے بس کی بات

نہیں۔تم یہ کوشش کرو کہ اچھے خیالات لاؤ' نیکی کے کام کا حوصلہ لاؤ' نیکی کی بات سوچو' نیکی کے عزائم کرو' بری باتوں کو ذہن سے نکالنے کی طرف توجہ بھی مت دو' اس لیے کہ وسوسہ کوئی محسوس چیز نہیں ہے' مکان کی طرح نہیں ہے۔ یہ تو دل میں خیال ہوتا ہے اور خیال توجہ سے موٹا ہوتا ہے۔ جتنا آدمی اس کو نکالنے پر توجہ دے گا' اتنا ہی وہ خیال مضبوط ہوتا جائے گا۔توجہ ہی مت کرو' بلکہ نیکی اور بھلائی کی طرف توجہ کرو۔

دین کے آسان ہونے کے تصور کا یہ پہلا بہت ہی اہم حصہ ہے۔ پھر اس کی رحمت کا ذکر ہے کہ وہ اس کو دس گنا سے سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھاتا ہے۔ اس امت کے ساتھ اس کا یہ خاص معاملہ ہے کہ تھوڑے عمل پر اس نے بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مالک نے ایک شخص کو ملازم رکھا۔ صبح سے ظہر تک اس نے کام کیا۔ مزدوری طے کر دی' وہ مزدوری دے دی گئی' وہ لوگ چلے گئے۔ ایک دوسرے گروہ کو ملازم رکھا۔ ظہر سے عصر تک انھوں نے بھی اپنا کام پورا کیا۔ جو مزدوری ان سے طے ہوئی تھی' وہ مزدوری ان کو دے دی گئی۔ تیسرے گروہ سے عصر سے مغرب تک کے کام کا معاہدہ کیا۔ ان کی مزدوری پہلے والوں سے زیادہ تھی۔ پھر کہا کہ پہلی مثال عیسائیوں کی' دوسری یہودیوں کی اور تیسری میری امت کی ہے۔ پہلے دونوں مزدور آ گئے کہ آپ نے ان کو تھوڑے کام پر زیادہ دیا ہے اور ہم کو زیادہ کام پر ان سے کم۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تم سے جو معاہدہ کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ انھوں نے کہا کہ جتنی بھی مزدوری آپ نے طے کی تھی پوری ادا کر دی۔ فرمایا: تو پھر شکایت کا کیا موقع ہے۔ ہمارے ساتھ تو معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات میں ہزار مہینوں کی برکت رکھ دی ہے اور جو مہینے میں تین دن روزے رکھ لے تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے ساری عمر روزے رکھے۔ سارے کے سارے اجر اس نے بڑھا کر دیے ہیں۔ آدمی باقاعدہ کرے تو یہ تھوڑے عمل میں اس کی رحمت کا ظہور ہے جو اس امت کے ساتھ خاص ہے۔

دوسرا حصہ برائی کے متعلق ہے۔ برائی کے لیے کہا ہے کہ جو برائی کا ارادہ کرے اور

پھر نہ کرے تو حدیث کے الفاظ ہیں کہ میں اس کو تو معاف کرتا ہی ہوں، لیکن جب وہ یہ برائی نہیں کرتا تو میں اس کے نامۂ اعمال میں پوری ایک نیکی لکھ لیتا ہوں۔

اعمال دو قسم کے ہیں۔ ایک اعمال بدن کے اعمال ہیں، اور دوسرے اعمال دل کے اعمال ہیں، مثلاً حسد، کینہ، دل کے عمل ہیں۔ جو اعمال دل سے سرزد ہو گئے وہ تو ہو گئے۔ اس میں نیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حدیث ان اعمال کے بارے میں ہے جو بدن سے کیے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں لوگوں کی رائے مختلف ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ نے سفیان ثوریؒ سے پوچھا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ انھوں نے کہا کہ جب پختہ ارادہ ہو جائے تو وہ گناہ ہو گیا۔ امام شافعیؒ کا یہ کہنا ہے کہ اگر پختہ ارادہ بھی ہو جائے لیکن جب تک آدمی نہ کرے، تب تک وہ گناہ نہیں لکھا جائے گا۔ چھوڑنے کے بارے میں لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اگر آدمی نے ویسے ہی چھوڑ دیا، بھول چوک ہو گئی، ایک برائی کا ارادہ کیا اور نہیں کر سکا، حالات سازگار نہیں ہوئے اس لیے نہیں کیا، یا بھول گیا تو اس پر کوئی اجر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک دوسری حدیث میں وضاحت ہو گئی ہے کہ جس نے میری خاطر، میرے اجر کی توقع میں اور میرے عذاب کے خوف سے اس برائی کو نہیں کیا تو اس کے لیے ایک کامل نیکی لکھی جائے گی۔

جو کام جائز اور زندگی کی ضروریات ہیں، ان کو بھی اللہ کے لیے کرنے سے ثواب ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں رات سوتا ہوں اور کچھ حصہ نماز پڑھتا ہوں۔ جتنی رات میں نماز پڑھتا ہوں اس کا جتنا مجھے اجر ملتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سونے پر بھی اتنا ہی اجر ملے گا۔ ایک اور حدیث ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو، وہ بھی اللہ کے ہاں نیکی لکھی جاتی ہے۔ صحابہؓ کو بڑا تعجب ہوا اور کہا کہ یہ کام بھی نیکی کا کام ہے! آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی خواہش غلط طریقے سے پوری کرتے تو گناہ لکھا جاتا؟ ہم نے کہا کہ ہاں گناہ لکھا جاتا۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تم نے اللہ کی ناراضی کے راستے کو چھوڑ دیا تو نیکی لکھی جائے گی۔

آدمی کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے یہ سب جائز اور مباح کام ہیں۔ یہ سارے کام بھی

اگر نیک نیتی سے ہوں تو یہ بھی نیکی لکھے جاتے ہیں۔ لیکن برائی کا خیال آ گیا' برائی کا قصد کرلیا' برائی کا ارادہ بھی کرلیا' پھر اللہ کے خوف سے اس کو چھوڑ دیا تو جس نے اللہ کے خوف سے' اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کے ڈر سے اپنے نفس کو برائی سے روک لیا' اس کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ یہ بات سورۂ رحمٰن میں بھی ہے کہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ (الرحمٰن ۴۶:) ''جو اپنے رب کے سامنے ہونے سے ڈرا' اس کے لیے دو جنتوں کا وعدہ ہے۔ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى o (النازعٰت ۴۰:) اور جس نے اپنے نفس کو بری خواہشات سے روک لیا کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا' برائی کا ارادہ بھی کرلیا' پھر نیت بھی ہوگئی' خیال بھی آ گیا' ہمت بھی کر لی لیکن پھر رک گیا' تو اللہ کے حساب میں یہ ایک نیکی ہوگئی' اور جس نے کرلیا تو پھر اس کی ایک ہی برائی لکھی جائے گی۔ اس سے زیادہ بار کسی پر نہیں ڈالا جائے گا۔

آپ یہ دیکھیں کہ دین کے آسان ہونے کا اور عام لوگوں کے لیے دین پر عمل کرنے کا کتنا سہل اور آسان راستہ ہے' جو مختلف احادیث سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ ایسے مطالبات لوگوں سے نہیں کیے گئے ہیں جو وہ پورے نہ کرسکیں۔ اللہ نے اپنی رحمت کا دروازہ وسیع کر دیا ہے۔ حدیث میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق کے بعد اپنے عرش کے پاس رحمت کو لکھ کر لگا لیا ہے کہ میں نے اس کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے کہ میں رحمت کا برتاؤ کروں گا اور میری رحمت میرے عذاب کے اوپر غالب آئے گی۔ یہ سارے کے سارے اس کی رحمت کے مظاہر ہیں جو اس نے کام کرنے کے لیے' اپنی طرف بلانے کے لیے راستے کھول دیے ہیں' حوصلے دیے ہیں' ترغیب دی ہے اور آسان بنا دیا ہے۔ آدمی کی اپنی بدبختی اور بدنصیبی ہوسکتی ہے کہ اس کے بعد بھی وہ اللہ کی نافرمانی کے راستے پر جائے۔

نیکی اور بدی کا یہ قانون جو احادیث میں اور اس حدیث قدسی کے اندر بیان کیا گیا ہے' اتنا اہم قانون ہے کہ امام نوویؒ نے اس کو اپنی چالیس حدیث میں بھی نقل کیا ہے۔ بخاری' مسلم اور سارے محدثین نے اس کو روایت کیا ہے اور بہت سارے صحابہؓ سے روایت کیا ہے۔ ایک حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے۔ دیگر بہت سے صحابہؓ نے روایت کیا ہے اور

تھوڑے بہت الفاظ کے فرق سے بھی کیا ہے لیکن سب کا مضمون واحد ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کی جزا اور سزا کے قانون میں بڑی آسانی رکھی ہے' اور سارا راستہ کھول دیا ہے۔ اب اپنے حوصلے اور ہمت کی اور اپنے ارادے کی بات ہے۔ کسی ایسی بات کی باز پرس اور مواخذہ اللہ کے ہاں نہیں ہے جو آدمی کے اختیار سے باہر ہو۔ جو ارادے سے نہ کرسکتا ہو' اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ جو ارادے سے کرسکتا ہو' صرف اسی کا مواخذہ ہے۔ صرف ارادے پر بھی کوئی مواخذہ نہیں ہے بلکہ یہ فرمایا کہ نیکی کا ارادہ کیا' نہیں کی تو ایک نیکی لکھی گئی اور اگر کرلی تو اجر دس نیکیوں سے لے کر سات سو تک لکھا گیا اور اس سے بھی زیادہ کئی گنا بڑھا دیا گیا۔ ایک حدیث میں برائی کے حوالے سے ان الفاظ کا اضافہ ضرور ہے کہ جب تک اس کو منہ سے نہیں نکالا' نہیں کیا تو کوئی برائی نہیں لکھی گئی' میں معاف کرتا رہوں گا اور اگر برائی کا ارادہ کرنے کے باوجود اللہ کے خوف سے برائی سے رک گیا تو وہ ایک نیکی لکھی گئی۔ اور کرلیا تو ایک برائی کی ایک سزا سے زیادہ سزا اللہ کے قانون میں نہیں ہے۔

نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا یہ پورا قانون اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہے کہ یہ میرا قانون ہے جس کے مطابق میں بندوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ اصل چیز نیت اور ارادہ ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی آدمی ایک ہی کام میں دس کاموں کا ارادہ کرے تو دس ثواب اس کو ملتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس کی ایک مثال دی ہے کہ اگر آدمی اعتکاف کرے تو اعتکاف میں نیت کرے کہ میں مسجد میں جارہا ہوں' اس لیے کہ اللہ کے گھر میں جانا بھی ثواب کا کام ہے۔ اعتکاف کی نیت کرے' وہ بھی ثواب کا کام ہے۔ پھر وہ یہ نیت کرے کہ وہاں پر میں بندوں کی خدمت کروں گا' یہ ایک اور نیت ہوگئی۔ ان کو دین کی تعلیم دوں گا' یہ ایک اور نیت ہوگئی۔ میں یہاں جو برائیاں کرتا ہوں' ان سے اپنے آپ کو بچاؤں گا' یہ ایک اور نیت ہوگئی۔ لوگ میرے شر سے بچیں گے' یہ ایک اور نیت ہوگئی۔ ایک ہی کام میں وہ فہرست بنالے اور دس نیکیوں کی نیت کرے تو یہ نیت اور ارادے ہی اصل چیز ہیں۔ یہی انسان کے دل کا سرچشمہ ہے جس کی صلاح پر پوری زندگی کی صلاح اور

جس کے فساد پر پوری زندگی کے فساد کا مدار ہے۔ نیت اور ارادے کا محل و مقام اور مرکز دل ہے۔ دل کے اندر اگر نیکی کی نیت رہے، نیکی کے حوصلے رہیں، نیکی کے عزائم رہیں، ان کی فکر میں آدمی لگا رہے، جتنا بھی کر سکے وہ کرلے اس کا نامۂ اعمال خالی نہیں جائے گا۔ برائی کا خیال آجائے تو اس سے نہ گھبرائے لیکن اس کے پیچھے نہ لگے اور اس کو کرنے سے بچے، اپنے آپ کو بچائے تو پھر بھی نیکی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اللہ کی رحمت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، بڑا وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس دروازے سے داخل ہوں اور اس کی رحمت سے فائدہ اٹھائیں۔

امانت داری

وَعَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَدِيْثَيْنِ قَدْ رَاَيْتُ اَحَدَهُمَا وَاَنْتَظِرُ الْاٰخَرَ : حَدَّثَنَا اَنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ ثُمَّ نَزَلَ الْقُرْآنُ فَعَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ وَعَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ ثُمَّ حَدَّثَنَا عَنْ رَّفْعِ الْاَمَانَةِ فَقَالَ : يَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْاَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَيَظَلُّ اَثَرُهَا مِثْلَ الْوَكْتِ ثُمَّ يَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْاَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَيَظَلُّ اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْمَجْلِ كَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهٗ عَلٰى رِجْلِكَ فَنَفِطَ فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا وَّلَيْسَ فِيْهِ شَيْءٌ ثُمَّ اَخَذَ حَصَاةً فَدَحْرَجَهَا عَلٰى رِجْلِهٖ "فَيُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ فَلَا يَكَادُ اَحَدٌ يُّؤَدِّي الْاَمَانَةَ حَتّٰى يُقَالَ اِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا اَمِيْنًا ' حَتّٰى يُقَالَ لِلرَّجُلِ مَا اَجْلَدَهٗ مَا اَظْرَفَهٗ مَا اَعْقَلَهٗ وَمَا فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ وَلَقَدْ اَتٰى عَلَيَّ زَمَانٌ وَّمَا اُبَالِيْ اَيُّكُمْ بَايَعْتُ : لَئِنْ كَانَ مُسْلِمًا لَيَرُدَّنَّهٗ عَلٰى دِيْنِهٖ، وَلَئِنْ كَانَ نَصْرَانِيًّا اَوْيَهُوْدِيًّا لَيَرُدَّنَّهٗ عَلٰى سَاعِيْهِ وَاَمَّا الْيَوْمَ فَمَا كُنْتُ اُبَايِعُ مِنْكُمْ اِلَّا فُلَانًا وَفُلَانًا۔"

(متفق علیه)

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں بیان فرمائیں ان میں سے ایک کو دیکھ چکا ہوں اور دوسری کا منتظر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا:

''امانت لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری۔ پھر قرآن مجید نازل ہوا۔ پس لوگوں نے امانت کو قرآن مجید اور سنت سے پہچان لیا''۔ پھر آپؐ نے ہمیں امانت کے اٹھ جانے کے متعلق بیان فرمایا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے قبض کر لی جائے گی۔ پھر اس کا اثر ایک معمولی نشان کی طرح باقی رہ جائے گا۔ پھر وہ سوئے گا اور امانت اس کے دل سے اٹھالی جائے گی۔ پس اس کا اثر آبلے کی طرح باقی رہ جائے گا۔ جیسے تم ایک انگارے کو اپنے پاؤں پر لڑھکاؤ تو اس پر آبلہ نمودار ہو جائے۔ پس تم اسے ابھرا ہوا تو دیکھتے ہو مگر اس میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ پھر آپؐ نے ایک کنکری لی اور اسے پاؤں پر لڑھکایا۔ پس لوگ اس طرح ہو جائیں گے کہ آپس میں خرید و فروخت کرتے ہوں گے مگر ان میں کوئی امانت ادا کرنے کے قریب بھی نہ بھٹکے گا۔ یہاں تک کہا جائے گا کہ فلاں لوگوں میں ایک امانت دار آدمی ہے۔ یہاں تک آدمی کو کہا جائے گا کہ یہ کتنا مضبوط، ہوشیار اور عقل مند ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا کہ میں پرواہ نہ کرتا تھا کہ مجھ سے کس نے خرید و فروخت کی بشرطیکہ وہ مسلمان ہوتا۔ اس لیے کہ اس کا دین مجھ پر میری چیز کو ضرور واپس کر دے گا اور اگر وہ یہودی یا عیسائی ہوتا تو اس کا کارندہ مجھ پر میری چیز کو ضرور واپس کر دے گا۔ مگر آج کل تو میں صرف فلاں فلاں سے ہی خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں بعض بری صفات سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ ان میں سے بعض کو ایسے حرام قرار دیا ہے جیسے کھانے پینے اور معاملات میں بعض چیزیں حرام ہیں، مثلاً تکبر (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا)، تحقیر (دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھنا)۔ اس سے آپؐ نے منع فرمایا اور اس کے مقابلے میں تواضع اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ اسی طرح دشمنی اور غصہ سے آپؐ نے روکا ہے اور لوگوں کے ساتھ خوش دلی اور فراخ دلی کے ساتھ معاملہ کرنے، معاف کرنے اور ان کے ساتھ محبت کرنے جیسی باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔ پھر آپؐ نے زبان کے حوالے سے، جو بے شمار برائیوں کی جڑ ہے اور بے شمار بھلائیوں کی طرف بھی لے جاتی ہے، تاکید فرمائی ہے کہ اپنی زبان کی حفاظت کرو۔ فرمایا کہ جہنم میں زیادہ تر لوگ اُسی فصل کے ذریعے جائیں گے جو انھوں نے زبان کے ذریعے بوئی ہے۔ غیبت، دوسروں کا مذاق اڑانا، ذلیل کرنا، برا بھلا کہنا اور جھوٹ بولنا، ان سب سے آپؐ نے منع فرمایا ہے اور سچائی کا راستہ

اختیار کرنے، مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرنے اور جہاں مسلمانوں کی بے عزتی ہو رہی ہو، وہاں ان کی حفاظت کرنے اور زبان کو بھلائی کی باتوں کے لیے کھولنے کی تلقین فرمائی ہے۔

مسلمانوں (انسانوں) کے درمیان بلکہ مسلمانوں (انسانوں) اور خدا کے درمیان بھی معاملات کو صحیح رخ پر رکھنا بہت اہم ہے۔ اس میں ایک صفت امانت ہے۔ امانت کا لفظ ہماری زبان میں معروف ہے اور ہم اس کا ترجمہ امانت داری بھی کرتے ہیں اور ایمان داری بھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لین دین ہو، جو ذمہ داری سونپی جائے، جو دوسروں سے معاہدے کیے ہوں، جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہوں' ان سب میں ہم خیانت کے بجائے، امانت کی اور ایمان داری کی روش اختیار کریں۔ اسی بارے میں یہ حدیث ہے جو حضرت حذیفہؓ بن الیمانؓ سے مروی ہے۔ حضرت حذیفہؓ نبی کریمؐ کے بڑے اعلیٰ پائے کے صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ حضورؐ نے ان منافقین کے نام حضرت حذیفہؓ کو بتائے تھے جو مدینہ میں رہتے تھے اور لوگوں پر ظاہر نہیں تھے۔ فرماتے ہیں کہ: اللہ کے رسول نے ہم سے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک بات کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دوسری بات کا میں انتظار کر رہا ہوں۔ پہلی بات یہ تھی: امانت لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں اتاری گئی۔ پھر انھوں نے قرآن سے سیکھا' انھوں نے سنت سے سیکھا۔

پھر فرمایا: یہ امانت کس طرح اٹھالی جاتی ہے۔ آدمی پھر نیند لیتا ہے اور امانت اس کے دل سے قبض کر لی جاتی ہے اور اس کا اتنا سا اثر رہ جاتا ہے جیسے کوئی بہت ہلکا سا دھبہ ہو۔ پھر وہ ایک نیند لیتا ہے۔ پھر اس سے امانت قبض کر لی جاتی ہے تو پھر وہ اتنی ہی باقی رہ جاتی ہے جتنا کوئی چھالا۔ جیسے آدمی کو کوئی چنگاری لگے اور چھالا پڑ جائے' امانت اس چھالے کی طرح ایک داغ کی صورت میں رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انگارہ آدمی کے پاؤں کو چھولے اور اس سے چھالا پڑ جائے۔ تم بظاہر اس چھالے کو ابھرا ہوا دیکھتے ہو لیکن اس چھالے کے اندر سوائے پانی کے کچھ نہیں ہوتا۔

پھر لوگ آپس میں لین دین کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہوتا جو امانت داری برت رہا ہو اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جاتا ہے فلاں قوم میں ایک

امانت دار آدمی ہے، یعنی امانت داری کا چلن عام نہیں ہوتا بلکہ وہ اتنی نایاب ہو جاتی ہے کہ لوگ اس آدمی کا ذکر کرتے ہیں کہ فلاں شخص امانت دار ہے۔ گویا امانت دار ہونا ایک قابل تعجب اور قابل ذکر چیز بن جاتی ہے۔

ایک آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا عقل مند آدمی ہے اور بڑا خوش گوار آدمی ہے۔ اخلاق کا بڑا اچھا اور بڑا بہادر آدمی ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں ایک دانے کے وزن کے برابر بھی ایمان داری نہیں ہوتی۔

نبی کریمؐ کے ارشاد کے بعد حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں: ایک زمانہ مجھ پر ایسا بھی رہا ہے کہ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ میں تم میں سے کس کے ساتھ لین دین کروں۔ اگر مسلمان ہوتا تھا تو اس کا اسلام اس بات کے لیے کافی ضمانت ہوتا تھا کہ اس پر آدمی انحصار کرلے کہ یہ آدمی امانت دار ہے، اس سے بلا کھٹکے معاملہ طے کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ غیر مسلم، یعنی عیسائی ہوتا تھا تو پھر بھروسا حکومت پر کیا جا سکتا تھا کہ وہ انصاف کا معاملہ کریں گے۔ آج تو معاملہ یہ ہے کہ میں اس آدمی کے ساتھ نامزد کر کے کہہ سکتا ہوں کہ میرا ان سے لین دین کا معاملہ ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کے ساتھ میں لین دین کا معاملہ نہیں کرسکتا۔ حضرت حذیفہؓ کا زمانہ عہد نبوت سے ۳۰، ۳۵ سال بعد کا زمانہ ہے۔

یہ حدیث امانت کے موضوع پر ہے اور امانت کے موضوع پر قرآن و حدیث میں بے شمار تعلیمات آئی ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ۔ ”کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ نبی کریمؐ نے کوئی خطبہ دیا ہو اور آپؐ نے خطبے کے اندر یہ نہ فرمایا ہو کہ جس آدمی کے پاس امانت داری نہیں ہے اس کے پاس ایمان نہیں ہے اور جس آدمی کو اپنے وعدے کا پاس نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں۔“ جو آدمی اپنی زبان کا لحاظ نہ رکھتا ہو، وعدے کر کے پورے نہ کرتا ہو وہ ایمان سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

حضورؐ کے تقریباً ہر خطبے میں ایمان اور امانت، لازم و ملزوم ہیں۔ امانت داری نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ پابندی عہد نہیں تو دین نہیں ہے۔ امانت داری کے بارے میں اس

حدیث سے ایک آگاہی ملتی ہے۔قرآن مجید نے بھی ان دونوں چیزوں کا ذکر بار بار کیا ہے۔ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ (المومنون:۸) یہ وہ مومن ہیں جو اپنی امانتوں پر اور اپنے عہد اور وعدے پر نگرانی کرتے ہیں۔ اپنی امانت کا لحاظ رکھتے ہیں' اس کو پورا کرتے ہیں۔ اپنی زبان کا پاس کرتے ہیں۔ یہی فلاح پانے والے ہیں۔ سورۂ مومنون میں بھی اس کا ذکر ہے اور سورۃ المعارج میں بھی انہی آیات کو دہرایا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امانت دراصل دین کی بنیاد ہے۔

عربی زبان میں الفاظ کچھ حروف سے بنتے ہیں۔ عربی زبان میں تین یا چار حروف کا ایک مادہ ہوتا ہے اور الفاظ ان ہی تین حروف سے بنتے ہیں۔ ان کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں، مثلاً علم کا لفظ ہے۔ اسی سے معلوم، علم، معلم، تعلیم وغیرہ بنتے جائیں گے۔ ایمان، امانت اور امن تینوں دراصل ایک ہی مادے سے بنے ہیں۔ ا،م،ن ایمان اور امانت کا مادہ ہیں، یعنی ان کی جڑ ایک ہی ہے۔ اس کے معنی کسی چیز پر آدمی کا مطمئن ہو جانا ہے۔ اسی سے لفظ ایمان نکلا ہے۔ ایمان کے ساتھ اگر 'با' بہ آئے جیسے اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ، میں اللہ پر ایمان لایا ہوں تو اس کے معنی ہیں کہ میں اس معاہدے پر مطمئن ہوں۔ اگر ایمان کا لفظ ل کے ساتھ آئے تو پھر اس کے معنی ہوتے ہیں، کسی کی بات کو سچا جاننا۔ نبی کی بات کو سچا جان کے اس پر ایمان، اعتماد اور بھروسا کرنے کے بعد ہی ایمان کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ امانت کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے۔ یہ انہی معنوں میں استعمال ہونے لگا کہ ذمہ داری کو آپ نے قبول کرلیا، اطمینان نفس کے ساتھ اس کو ادا کیا، تو یہ امانت داری ہے۔ ایمان اور امانت کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جب امانت اٹھائی جاتی ہے تو پھر ایمان بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔ امانت کے غائب ہونے کا طریقہ کیا ہے اور اس کے آنے کا طریقہ کیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ ایک بار تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کس طرح امانت دلوں میں اتاری گئی اور دوسری بات، جس کا مجھے انتظار ہے وہ یہ ہے کہ امانت کس طرح غائب ہو جائے گی۔ لوگوں کی تعریف ان کے ظاہری اعمال پر کی جائے گی کہ یہ لباس کیسا پہنتے ہیں، ان کا

مکان کیسا ہے، ان کے پاس مال کتنا ہے، عقل مند کیسے ہیں، دنیا کیسے کماتے ہیں، سیاست کیسے کرتے ہیں وغیرہ لیکن یہ کہ ان کے دلوں کے اندر امانت داری تو کیا ایمان کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں ہوگا۔ ایک دانے کے برابر بھی یہ چیز نہیں پائی جائے گی۔ ان کا یہ قول ہے کہ میں دوسری چیز کا منتظر ہوں، یعنی ابھی میں نے امانت داری کے رخصت ہو جانے کی یہ کیفیت نہیں دیکھی کہ خال خال ایسے لوگ نظر آئیں جن کے ساتھ آدمی امانت داری کے ساتھ معاملہ کر سکتا ہو۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: امانت اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ احساس کہ ذمہ داری کو ادا کرنا ہے، جو حق دینا ہے وہ دیا جانا چاہیے اور دوسرے کی چیز پر قبضہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ لباس نہیں ہے جو اوپر سے اوڑھ لے۔ جذر کسی چیز کی جڑ کو کہتے ہیں۔ دلوں کی جڑ میں امانت اتاری گئی۔ اس میں کافر اور مومن کی بھی کوئی شرط نہیں۔ عام انسانی صفت ہے۔ جس انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے فطرتِ انسانی سے نوازا ہے' اس کے اندر امانت داری کا احساس پیدا کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ دنیا کا مشترک ورثہ ہے۔ آدمی کافر ہو یا مومن یا مشرک، یہ سب انسانوں کی مسلمہ چیز ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چیز آدمی کے دل اور اس کی فطرت میں اتری ہوئی ہے۔ اسلام کی پوری تعلیم اس بات پر مبنی ہے کہ اسلام کی جو بھی تعلیمات ہیں وہ کوئی باہر سے سکھائی ہوئی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی پہلے سے جانتا اور پہچانتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے نیکی کے لیے معروف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معروف کے معنی ہیں وہ چیز جو آدمی جانتا، پہچانتا ہو، اس کے لیے اجنبی نہ ہو۔ برائی کے لیے دین نے منکر کا لفظ استعمال کیا اور منکر کے معنی وہ افعال ہیں جو آدمی کے لیے اجنبی ہوں۔ آدمی کی فطرت خود جانتی ہے کہ وعدہ پورا کرنا، سچ بولنا، امانت داری، یہ نیکیاں معاشرے کے اندر اچھی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ اچھی صفات ہیں۔ آدمی کے دل کے اندر یہ تمام اچھائیاں ہونی چاہییں۔ یہ آدمی کے دل کے اندر پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔

پھر انھوں نے قرآن سے یہ سیکھا کہ امانت کیا ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کی تفسیر و تشریح بیان کی۔ اس کو کھول کے بیان کر دیا۔ قرآن ہی نہیں، نبی کریمؐ کی سنت سے بھی لوگوں نے سیکھا۔ اس طرح امانت کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ امانت کے ساتھ مکمل شناسائی ہو گئی۔ لوگوں نے

پہچان لیا کہ امانت کے معنی کیا ہیں اور امانت کی تعلیم کیا ہے؟ امانت کے معنی ہیں کہ جو حق آدمی پر آتا ہے، اس حق کو وہ ادا کرے اور جو چیز دوسرے کی ہو، اس کو دوسرے ہی کی سمجھے، اپنی نہ سمجھ لے۔ جو چیزیں بھی اس کے استعمال میں آئیں، ان کو ان کی حدود کے اندر استعمال کرے۔

قرآن وحدیث نے اس مضمون کو کھول کے بیان کیا ہے۔ قرآن مجید نے امانت کو سب سے پہلے اس مفہوم میں استعمال کیا ہے کہ اللہ نے جو شریعت دی ہے وہ ایک امانت ہے۔ شریعت دراصل اس بات پر قائم ہے کہ اللہ نے انسان کو عمل کی آزادی دی ہے۔ وہ چاہے تو بُرائی کرے، چاہے تو بھلائی کرے۔ یہ اختیار اور آزادی صرف انسان کے لیے ہے۔ چاند، سورج، درخت، پہاڑ، فرشتے، ان سب کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ نیکی کے معنی یہ ہیں کہ بدی کرنے کا بھی امکان ہے۔ ساری شریعت اختیار پر ہی قائم ہے۔ شریعت انسان سے صرف وہی مطالبہ کرتی ہے جس کے کرنے کا اسے اختیار ہو۔ جس کا اختیار نہیں اس کے لیے وہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ اگر آدمی منہ سے مجبوراً کفر کا کلمہ نکالے تو کوئی گناہ نہیں۔ آدمی جبراً کروائے جانے والے کاموں کا جواب دہ نہیں ہے۔

انسان کو عمل کی جو ذمہ داری دی گئی ہے اس کے لیے امانت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا o لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا o (الاحزاب: ۷۲، ۷۳) ”بے شک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اُٹھالی۔ بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے تا کہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اور اللہ توبہ قبول فرمائے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے“۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی اپنے اعمال اور شریعت کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہرا، یہ سب فطرت کے لگے

بندھے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ کوئی پتا بھی اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کرسکتا۔ البتہ انسان نیک اور بد دونوں عمل کرسکتا ہے۔ اس لیے وہ بہت بڑے اجر، یعنی جنت کا اور بہت بڑی سزا، یعنی جہنم کا مستحق ٹھہرا جو کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔

ایمان دراصل ایک خرید وفروخت کا معاہدہ ہے۔ عموماً امانت داری کا لفظ بولتے ہیں تو دنیا میں لین دین کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے کہ آدمی خرید وفروخت کرے۔ اللہ نے کہا کہ ایمان تو خود خرید وفروخت کا معاملہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (التوبۃ:۱۱۱) ”بے شک اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔“ اللہ کے بندے نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں اس کے ہاتھ بیچ دیا۔ جو آدمی امانت دار نہیں، وہ ایمان کو پورا نہیں کرسکتا۔

یہاں نبیؐ کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو شخص اپنی امانت کا احساس نہیں رکھتا وہ ایمان کے تقاضے بھی پورے نہیں کرسکتا۔ ایمان لانے کے بعد جان، مال، مرضی سب اللہ کا ہو چکا۔ امانت داری کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو صفات‘ صلاحیتیں‘ استعداد‘ عقل‘ جسم ملے ہیں یہ سب کی سب اللہ کی طرف سے امانت ہیں۔ امانت اور ایمان یہ ہے کہ آدمی اس امانت کا حق ادا کرے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن سے اور رسولؐ نے اپنی سنت سے سکھائی ہے۔

اس بات کو جاننا ہر انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ نبی کریمؐ نے ہر طرح لین دین کو، انسانوں کے درمیان جو بھی معاملہ ہو، مثلاً گفتگو، شادی بیاہ، گھریلو معاملات، تجارت وغیرہ سب کو امانت کی بنیاد پر قائم فرمایا ہے۔

دو آدمیوں کی مجلس میں جو بات ہوتی ہے تو وہ مجلس میں امانت ہے۔ گفتگو بھی امانت ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کو بے وجہ نقل کرتا ہے تو وہ گناہ بھی کرتا ہے۔ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ۔ سب مجلسیں امانت ہیں۔ کسی نے کان میں جو بات بتائی، وہ امانت ہے۔ اس کو کسی سے کہہ دینا، بد دیانتی ہے۔ جس سے مشورہ لیا جائے تو وہ بھی امانت اس کے سپرد کی

گئی۔ بہت بڑے بڑے معاملات جو طے ہوں وہ سب امانت ہیں۔ امانت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو کچھ کہتا نہ پھرے۔ اپنی دانست میں صحیح مشورہ دے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے عورتوں کے بارے میں خاص طور پر نصیحت فرمائی کہ عورتوں کا خیال رکھنا۔ تم نے ان کو اللہ سے عہد کر کے اور امانت کے طور پر اپنے گھروں کے اندر اپنی بیوی بنایا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے سونپی ہوئی امانت ہے۔ جن کو زیر دست کر دیا ہے' ان کے حقوق کو ادا کرنا بھی اللہ کی طرف سے امانت ہے۔ نوکری کے اندر نوکری کا حق ادا کرنا امانت ہے۔ کسی سے معاہدہ کر کے ملازم رکھ کر اس سے وقت یا کام کے لحاظ سے زیادہ کام لینا بھی اس کے منافی ہے۔

یہ ساری باتیں فقہا اور علما نے کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ کوئی آدمی کسی چیز کو آپ کی ذمہ داری میں دے جاتا ہے' یہ بھی امانت ہے۔ کوئی بات' شخص یا انسان ہو' اس کا حق ادا کرنا بھی امانت داری ہے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: کہ امانت دل کی جڑوں کے اندر ہے۔ اور قرآن نے کہا کہ: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (النساء:۵۸) "اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل افراد کے سپرد کر دو۔"

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ امانت دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتی ہے۔ احساس بھی اٹھ جاتا ہے۔ ایمان داری کا عمل بھی غائب ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ، آدمی نیند لیتا ہے اور امانت غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ سوتے ہوئے غائب ہو جاتی ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ جس طرح آدمی پلک جھپکتے بے ایمانی کرتا ہے، وہی بے ایمانی طبیعت پر غالب آ جاتی ہے۔ سونے کی صرف تشبیہ ہے یعنی سونے میں اسے پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ ایسے کام کر جاتا ہے جس سے امانت ختم ہو جاتی ہے۔ بظاہر تو امانت کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، حلف اور قسمیں اٹھائی جاتی ہیں لیکن جب امانت اٹھائی جاتی ہے تو اس کی مثال ایک چھالے اور آبلے کی طرح ہو جاتی

ہے۔ ہاتھ پر جس طرح انگارے سے چھالہ پڑتا ہے کہ اوپر کھال ہوتی ہے، ذرا انگلی لگے تو پھوٹ جاتا ہے، اندر پانی ہوتا ہے، کوئی اس کی حقیقت نہیں ہوتی۔ گویا امانت داری اتنی مفقود ہوجاتی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بس دو چار آدمی ایمان دار رہ گئے ہیں۔ ان لوگوں کی خوب تعریف ہوتی ہے جن کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہوتا۔ فلاں آدمی بڑا ہوشیار ہے، بڑا کامیاب بزنس مین ہے، بڑا چالاک سیاست دان ہے، بڑا عقل مند ہے، اچھے اخلاق والا ہے، مسکرا کے ملتا ہے لیکن اس آدمی کا حال یہ ہے کہ اس کے اندر امانت داری نہیں ہے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ تو ایسا تھا جس سے چاہا بلا دھڑک معاملہ کرلیا کہ یہ آدمی مسلمان ہے تو اس کا اسلام پر اعتماد ہے۔ غیر مسلم ہے تو نظام پر اعتماد ہے۔ اگر یہ بے ایمانی کرے گا تو قانون اس کا مداوا کرے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اب میں دیکھ کر ہی معاملہ کرسکتا ہوں، آنکھیں بند کیے ہوئے معاملہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ امانت اٹھنا شروع ہوگئی ہے۔ اگر آدمی پرکھا ہوا نہ ہو اور اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ہو تو یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنی بات پر پورا نہیں اترے گا۔ کوئی قرض مانگنے آتا ہے تو مجھے بھی پہلا شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ واپس نہیں کرے گا۔ ہر کسی کے بارے میں یہی شبہ دل میں آتا ہے۔

حدیث میں جو بات کہی گئی ہے' یہ ہماری زندگی کے معاملات کی بنیاد ہے۔ حضورؐ نے اس کی دوسری جگہ بڑی تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا: ''جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان نہیں۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے آکر آپؐ سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔ حضورؐ اس وقت کوئی بات کر رہے تھے۔ آپؐ نے سوال سن لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ کچھ لوگوں نے کھسر پھسر شروع کی۔ انھوں نے سمجھا کہ شاید آپؐ نے بات سنی نہیں۔ کسی نے کہا کہ شاید آپؐ نے اس کو اس لائق نہیں سمجھا کہ اس کا جواب دیں۔ پھر اس کے بعد آپؐ نے اپنی بات ختم کی تو کہا کہ وہ آدمی کہاں ہے جس نے یہ سوال کیا۔ وہ آدمی کھڑا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت اس وقت آئے گی جب امانتیں ضائع کردی جائیں گی''۔

اُس زمانے میں لوگ سب باتیں پوچھا کرتے تھے۔ سوال کرنے سے ہچکچاتے نہیں تھے۔ اس آدمی نے پوچھا، حضورؐ امانت ضائع ہونے کے کیا معنی ہیں؟' آپؐ نے فرمایا: امانت کا ضائع ہونا یہ ہے کہ معاملات کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جائے جو اس کے اہل نہیں۔ دولت ان کے پاس ہو، جو اس کے برتنے کے اہل نہیں۔ علم ان کے پاس ہو، جو علم کے مطابق کام کرنے کے اہل نہیں۔ سیاست ان کے پاس ہو' جو اس کے مطابق حکومت کرنے کے اہل نہ ہوں۔ معاملات ان کے ہاتھ میں ہوں' جو معاملات کو چلانے کے اہل نہیں۔ تعلیم کا معاملہ ان کے ہاتھ میں ہو' جو تعلیم کا حق ادا کرنے کے اہل نہ ہوں۔ جب معاملاتِ دین اور دنیا ان کے سپرد کیے جائیں جو اس کے اہل نہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امانت ضائع ہو گئی۔ جب امانت ضائع ہو جائے تو سمجھو کہ قیامت قریب ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب قیامت کے روز سب لوگ جمع ہو جائیں گے تو مختلف پیغمبروں کے پاس جا کر شفاعت کی درخواست کریں گے۔ پھر رسول اللہؐ کے پاس آئیں گے۔ حضور اکرمؐ کو اجازت دی جائے گی کہ آپؐ کھڑے ہو کر بات کریں۔ جب حضورؐ کھڑے ہو جائیں گے تو جنت کے راستے پر دو چیزیں کھڑی ہو جائیں گی۔ ایک رحم اور دوسری امانت داری۔ رحم کے معنی قرابت داری کو نبھانا ہے۔ اس کے بعد کوئی بجلی کی تیزی سے اور کوئی ہوا کی تیزی سے گزر جائے گا، کوئی چلتا ہوا جائے گا اور کوئی لڑکھڑاتا ہوا جائے گا۔ ان سب کو جو چیزیں روکنے والی ہوں گی' وہ امانت اور صلہ رحمی ہو گی۔ بعض لوگوں کو ان کے اعمال عاجز کر دیں گے، وہ چل نہیں سکیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز جنت کے راستے پر سب سے زیادہ معاون بھی ہو گی اور رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔

آپؐ نے فرمایا: ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ صرف نماز رہ جائے گی، امانت رخصت ہو جائے گی۔ یہ میری امت کی گراوٹ اور زوال کا وقت ہو گا۔ اصل چیز تو امانت داری ہے۔ اللہ نے جو جسم دیا ہے' جو صلاحیت دی ہے، اس کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرنا، حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کرنا۔

حضورؐ کی نبوت کی ایک ہی سب سے بڑی سند ہے اور وہ یہ کہ آپؐ امین تھے۔ جبرئیلؑ نے قرآن کو بالکل ویسا ہی اللہ کے حکم کے مطابق اتارا تو اللہ نے امین کا لفظ استعمال کیا۔ رسول امین (امانت دار لانے والے تھے، امانت دار پہنچانے والے تھے)۔ امانت کے بغیر تو قومی زندگی، خاندانی زندگی کوئی بھی صحیح طور پر قائم نہیں ہوسکتی۔

رزقِ حلال

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :
"اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا ، وَاِنَّ اللّٰهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِیْنَ ، فَقَالَ تَعَالٰی: ﴿ یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾ وَقَالَ تَعَالٰی: ﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَا کُمْ ﴾ ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ ، اَشْعَثَ اَغْبَرَ ، یَمُدُّ یَدَیْهِ اِلَی السَّمَاءِ : یَارَبِّ یَارَبِّ ، وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ ، فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهُ"۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
بے شک اللہ پاک ہے اور وہ پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ نے مومنین کو بھی اس چیز کا حکم دیا جس کا اپنے رسولوں کو حکم فرمایا: "اے میرے انبیاءؑ پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔" اور مومنین کے بارے میں فرمایا: "اے ایمان والو! اس پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں دیا"۔ پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے آدمی کی مثال بیان کی جس نے لمبا سفر کیا۔ اس کے بال پراگندہ ہیں، چہرہ غبار آلودہ ہے۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا اور کہتا ہے: اے رب! اے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور حرام طریقے سے پرورش ہوئی۔ پس ایسے شخص کی دعا اللہ کے ہاں کیوں کر قبول ہوگی؟

اچھے اخلاق میں ایک بڑی اعلیٰ صفت رزقِ حلال ہے۔ اس کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے۔ زندگی بھی متاثر ہوتی ہے اور آخرت کا انجام بھی۔ جب حلال رزق کی بجائے حرام رزق پہنچنا شروع ہو جائے تو زندگی کے اندر فساد پیدا ہوتا ہے، معاشرہ بگڑتا ہے، دعائیں قبول

نہیں ہوتیں اور نیک اعمال بھی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد جس کو مسلم، ترمذی اور دیگر احادیث کی کتابوں میں روایت کیا گیا ہے، اسی رزق حلال کے موضوع پر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا جو پاک نہ ہو''۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کو ہر اس بات کی ہدایت کی ہے اور ہر اس بات کا حکم دیا ہے جس بات کی ہدایت اور حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (المومنون:۵۱) ''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ میں جانتا ہوں''۔ پھر نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ اے ایمان لانے والو! جو کچھ بھی ہم نے تم کو رزق دیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ۔ آپؐ نے ایک آدمی کا ذکر کیا کہ وہ لمبا سفر کرتا ہے، اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گرد آلود ہیں، گرد میں بری طرح اٹا ہوا ہے، وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور دعا کرتا ہے، کہ اے میرے رب، اے میرے رب، حالانکہ اس کا کھانا بھی حرام ہے، اس کا پینا بھی حرام ہے، اس کا لباس بھی حرام ہے اور اس کی پرورش بھی حرام سے کی گئی ہے۔ اس آدمی کی پکار کیسے سنی جائے گی؟

یہ طویل حدیث اپنے اندر بہت سارے سبق رکھتی ہے۔

پہلی بات تو خود نبی کریمؐ کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ خود طیب ہے اور وہ اسی چیز کو پسند کرتا ہے جو طیب ہو۔ کیونکہ اللہ کی صفت کا یہ تقاضا ہے کہ کوئی ایسی چیز جو حلال سے دور ہو، حرام سے قریب ہو، وہ صدقہ ہو، عمل ہو، خرچ ہو، وہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ صدقہ صرف وہی نہیں ہوتا کہ جو آدمی کسی غریب اور فقیر کو دے دے بلکہ نبی کریمؐ نے صدقے کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ ہر وہ مال جو آدمی حق کی ادائیگی میں خرچ کرتا ہے صدقہ ہے۔ اپنے آپ پر خرچ کرتا ہے، جسم کو کھلاتا ہے، پلاتا ہے تاکہ اس کی صحت برقرار رہے، وہ دنیا کے کام کر سکے اور آخرت کما سکے تو وہ بھی صدقہ ہے۔ اپنے رشتہ داروں کو، اپنے اہل وعیال کو اگر وہ مال دیتا ہے اور ان پر خرچ کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ وہی عمل قبول کرتا ہے جو پاک ہو اور وہی مال قبول کرتا ہے جو پاکیزہ ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تشریح بہت جگہ فرمائی گئی ہے۔

اس لیے نبی کریمؐ نے واضح طور پر ہدایت فرمائی کہ اللہ کے حضور ناپاک مال پیش مت کرو' اور وہ مال بھی اللہ کی راہ میں نہ دو جو ناکارہ ہو اور کسی کام کا نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ خود طیب ہے' اسی لیے وہ اعمال میں سے اور مال میں سے اسی چیز کو قبول فرماتا ہے جو پاکیزہ ہو۔ چنانچہ اگر حرام کی کمائی ہے اور حرام مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور بندوں کے حقوق ادا کیے جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔

دوسری بات آپؐ نے یہ فرمائی کہ جس بات کا اللہ نے اپنے رسولوں کو حکم دیا ہے اسی بات کا اس نے ایمان لانے والوں کو حکم دیا ہے۔ کچھ اعمال تو ضرور ایسے ہیں کہ جو اللہ کے رسولوں کے لیے خاص ہیں لیکن اللہ نے اپنے رسولوں کو ان ساری ہدایات اور احکام کا پابند کیا ہے جن کا مطالبہ وہ رسولوں پر ایمان لانے والوں سے کرتا ہے۔ "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ (البقرۃ ۲:۲۸۴)" "رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے"۔ اللہ کا رسول بھی اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح ایمان لانے والے ایمان لاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اگر اللہ کے رسول خود ایمان رکھتے ہیں تو اسی بات کی ہدایت اور حکم ایمان لانے والوں کو بھی ہے کہ صحیح اور سچا' پکا ایمان رکھیں۔ اگر ان سے عمل صالح کا مطالبہ ہے تو سارے مومنین سے بھی عمل صالح کا مطالبہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے رسولوں سے یہ چاہا ہے کہ جو حق ان کو دیا گیا ہے' وہ اس کو پہنچائیں اور اس کی تبلیغ کریں تو سارے ایمان لانے والوں سے بھی یہی مطالبہ ہے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: اللہ نے مومنین کو ان ساری باتوں کا حکم دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے جس کا حکم اس نے ان کو دیا ہے جن کو اس نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد نبی کریمؐ نے دو آیات کی تلاوت فرمائی۔ پہلی آیت میں تو یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو کس بات کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیت ہے: یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ ،یعنی جو پاکیزہ چیزیں ہیں وہی کھاؤ۔ جو آدمی کھاتا ہے اس کے تین معنی ہوتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ جو غذا اس کے جسم میں جا رہی ہے' اس میں شراب' سور کا گوشت' مردار یا کوئی اور شے جسے اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے' شامل نہ ہو۔ یہ تو ظاہراً بھی ناپاک ہیں اور بالعموم شاید ہی کوئی مسلمان جو اللہ سے ذرا بھی تعلق رکھتا ہو' اور اس کی اطاعت

کرنا چاہتا ہو‘ وہ جانتے بوجھتے کوئی ایسی حرام چیز کھائے گا جس کو اللہ نے کھلم کھلا واضح طور پر حرام قرار دے دیا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض چیزیں اس لیے حرام نہیں ہوتیں کہ وہ فی نفسہ اپنی ذات میں حرام ہیں بلکہ وہ اس لیے حرام ہو جاتی ہیں کہ وہ حرام ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ غصب کا مال ہے‘ ناجائز مال ہے‘ کسی کا حق مار لیا ہے‘ رشوت ہے‘ سود کا مال ہے‘ یہ سب حرام ہے۔ کسی روپے پیسے پر تو نہیں لکھا ہوا ہوتا کہ یہ حرام ہے۔ اس سے جو کھانا پکتا ہے اور آدمی کھاتا ہے‘ اس پر بھی کہیں نہیں لکھا ہوا ہوتا کہ یہ کھانا حرام ہے۔ اس طرح وہ لذیذ کھانا جو دستر خوان پر موجود ہے حرام ہوتا ہے۔ اللہ نے جو فرمایا ہے کہ طیبات کھاؤ تو اس سے وہ غذا مراد ہے جو پاکیزہ ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ کھانے کا لفظ ہم ہر قسم کے مال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کھاؤ پیو کے معنی ہوتے ہیں کہ مال کو آدمی جس طرح بھی چاہے استعمال کرے اور اپنے مصرف میں لائے۔ مال کھانا اور استعمال کرنا اسی کی تعریف میں آتا ہے۔ اللہ نے اپنے رسولوں کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ طیبات‘ یعنی پاکیزہ چیزیں کھائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے‘ پاکیزہ چیزوں کو پسند فرماتا ہے‘ پاکیزہ چیزوں کو قبول کرتا ہے‘ اس لیے وہی چیزیں کھاؤ جو اللہ نے پاک کی ہیں اور نیک عمل کرو۔

اس کے بعد آپؐ نے دوسری آیت تلاوت فرمائی جو آپ کی اسی بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اللہ نے جن باتوں کی ہدایت اپنے رسولوں کو دی ہے اس کے اندر ان کے سارے ماننے والے شریک ہیں۔ جس بات کا مطالبہ اس نے اپنے رسولوں سے کیا ہے اس کا مطالبہ سارے ماننے والوں سے کیا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت آپؐ نے تلاوت فرمائی کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ”کہ ایمان لانے والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق میں عطا کی ہیں۔“ یہاں پر بھی کھانے کا لفظ ان تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ چیز فی نفسہ بھی حلال ہو‘ وہ حلال ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔ بالعموم دستر خوان پر آنے والا کھانا ہی نہیں بلکہ ہر وہ مال جو آدمی استعمال کرتا ہو‘ وہ پاک مال ہو جو اللہ نے دیا ہے۔

آپؐ نے ایک آدمی کا ذکر کیا اور اس آدمی کا ذکر آپؐ نے جس انداز میں کیا وہ سننے اور دل میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آدمی لمبا سفر کرتا ہے' بال بکھرے ہوئے ہیں' گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے۔ یہ کس آدمی کا ذکر ہے۔ یہ اس آدمی کا ذکر بھی ہوسکتا ہے جو مال کمانے کے لیے دن رات اپنے آپ کو لگائے رکھتا ہے' اس کے لیے سفر بھی کرتا ہے' محنت بھی کرتا ہے' اپنا وقت بھی لگاتا ہے' حلیہ بھی خراب رہتا ہے' گرد و غبار کے اندر اٹ جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں مال کمانے کے لیے سفر کرنے پڑتے تھے اور سفر بھی کاروں اور ہوائی جہازوں میں نہیں ہوتے تھے بلکہ دھوپ اور گرد میں اٹ کر ہوتے تھے' یعنی اتنا سفر مال کمانے کے لیے کرتا ہے۔ اتنی محنت کر کے جو مال کماتا ہے تو مال حرام ہوتا ہے۔

آگے چل کر ایک دوسرے معنی بھی ہیں اور وہ معنی یہ ہیں کہ آدمی نیکی اور عبادت کے لیے سفر کرتا ہے۔ اس سفر میں وہ پریشانیاں اور تکالیف اٹھاتا ہے۔ اس کا حلیہ خراب ہوتا ہے' بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہیں۔ پورا جسم گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے۔ یہ مثال اس سفر پر صادق آتی ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت' طواف اور حج و عمرہ کے لیے کرتا ہے' یا کوئی بھی سفر جو آدمی کہیں بھی' کسی مقدس مقام پر کسی نیکی کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور گڑگڑا کے عاجزی کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ یارب' یارب' میرے رب' میرے رب میری سن لے۔ پھر حضورؐ فرماتے ہیں اس کا کھانا بھی حرام ہے' اور پینا بھی حرام ہے' اور لباس بھی حرام ہے۔ جس سے جسم کا گوشت بنا ہے' رگ اور پٹھے بنے ہیں' جس غذا سے اس کی پرورش ہوئی ہے وہ بھی حرام ہے' تو ایسے آدمی کی دعا کہاں سے سنی جائے گی' کہاں سے قبول ہوگی۔

یہ بڑا ہی عبرت ناک منظر ہے کہ آدمی نیکی کی خاطر اور اللہ کی رضا کی خاطر سفر کرتا ہے۔ وہاں جا کر روتا دھوتا ہے' مال بھی خرچ کرتا ہے' سفر کی تکالیف بھی اٹھاتا ہے اور اللہ سے مانگتا بھی ہے' گڑگڑاتا بھی ہے' عاجزی بھی کرتا ہے' لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے لیکن دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اور دعائیں اس لیے قبول نہیں ہوتیں کہ جو مانگنے والا ہے اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہے' جو لقمہ جسم کے اندر جا رہا ہے وہ حرام سے کمایا ہوا ہے' جو کچھ آدمی کو مل رہا ہے وہ حرام کا ہے اور جو کچھ پہنتا ہے وہ بھی حرام کا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلی بات جو اس حدیث سے

معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی ایسی نافرمانی ہو تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس آدمی کی دعا نہیں سنی جاتی۔ ایسے آدمی کی دعا کیسے سنی جائے گی جو اللہ کی اتنی نافرمانیاں کر کے اس کے حضور میں حاضر ہوا ہے۔

دعاؤں کی قبولیت کا رزقِ حلال کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ دوسری احادیث میں اس بات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے اسی آیت سے ملتی جلتی آیت تلاوت فرمائی: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ''لوگو! زمین میں سے وہی چیزیں کھاؤ جو حلال اور پاکیزہ ہیں۔'' نبی کریمؐ کے ایک بڑے قریبی صحابی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور فاتح ایران کہلاتے ہیں اور قادسیہ کی جنگ جس میں ایران فتح ہوا تھا، کمانڈر تھے۔ وہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ دعا کیجیے کہ میں مستجاب الدعوات ہو جاؤں، یعنی میں ایسا آدمی ہو جاؤں کہ جس کی دعا سنی جائے اور قبول ہو جائے۔ انھوں نے نبی کریمؐ سے درخواست کی کہ مجھے یہ مقام حاصل ہو کہ میں جو بھی مانگوں اور جو بھی طلب کروں، اللہ تعالیٰ کے سامنے جو دعا پیش کروں، وہ قبول کی جائے۔ آپؐ نے فرمایا: اے سعدؓ، اپنے کھانے کو پاکیزہ رکھو، جو کماؤ، اپنے اوپر جو خرچ کرو، جو کھاؤ اور پیو، پاکیزہ ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم اس کے بعد ایسے ہو جاؤ گے کہ تمھاری دعائیں قبول ہوں گی۔ یہ بھی فرمایا کہ ایک حرام لقمہ پیٹ کے اندر ڈالا جاتا ہے تو چالیس دن تک کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔

یہ طبرانی کی حدیث ہے جس میں یہ وعید سنائی گئی ہے کہ اگر ایک لقمہ بھی پیٹ میں ایسا جائے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو تو چالیس دن تک کوئی عمل، نمازیں، روزے اور دوسری نیکیاں قبول نہیں ہوتیں۔ حدیث میں سُحت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور سُحت کے لغوی معنی کسی چیز کی جڑ کاٹ دینا ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ یہودیوں کے ذکر میں کئی جگہ آیا ہے، وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ، یَاْکُلُوْنَ السُّحْتَ، یعنی خوب بڑھ بڑھ کر حرام کھاتے ہیں اور ان کے لیڈروں اور علما کو انھیں حرام کھانے سے منع کرنا چاہیے۔ سُحت کا لفظ رشوت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا جس جسم کی پرورش حرام کے مال سے کی گئی ہو، رشوت کے مال سے کی گئی ہو، آگ اس کی زیادہ مستحق ہے کہ وہ اس جسم کو کھائے، بجائے اس کے کہ اس کے اعمال

اللہ کے ہاں قبول ہوں اور اس کی دعائیں قبول کی جائیں۔ اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دعاؤں کی قبولیت کا انحصار رزق حلال پر ہے' اور اگر حرام مال ہو' حرام غذا ہو' حرام کمائی ہو تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہونا چاہیے اور اکثر پیدا بھی شاید ہوتا ہوگا کہ ہمارے ہاں دعاؤں کی تو کوئی کمی نہیں ہے' ہر نماز کے بعد ہم اللہ کے آگے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں' خوب خوب دعائیں ہوتی ہیں' ہزاروں لاکھوں مسلمان دعائیں کرتے ہیں' اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ' اے اللہ' اے رب' اے رب' سن لے' روتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں بھی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اللہ کے بہت سارے بندے ہیں جو راتوں کو کھڑے ہوتے ہیں' اندھیرے میں کھڑے ہوتے ہیں' ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں' اس کے آگے پیشانی ٹیک دیتے ہیں' گڑگڑا کے دعائیں مانگتے ہیں۔ لاکھوں آدمی اللہ کے گھر کا سفر کرتے ہیں' اپنا پیسہ خرچ کرتے ہیں' تکلیف اٹھاتے ہیں' گھربار چھوڑتے ہیں' کاروبار ترک کرتے ہیں' حرم میں حاضر ہوتے ہیں' خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں' خانہ کعبہ کے دروازے سے چمٹ جاتے ہیں۔ جس نے بھی وہاں پر حاضری دی ہے' وہ ان مناظر کو خوب جانتا ہے۔ لوگ گڑگڑاتے ہیں' روتے ہیں۔ عرفات کے مقام پر لاکھوں آدمی جمع ہوتے ہیں اور اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں' ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اتنی دعائیں کی جاتی ہیں مگر اس امت کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ سوال کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ دعاؤں کی تو کوئی کمی نہیں ہے' رونے کی بھی کمی نہیں ہے' گڑگڑانے کی کمی نہیں ہے' عاجزی کی کمی نہیں ہے' مانگنے کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اجتماعی دعائیں بھی اتنی کثرت سے مانگی جاتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں؟

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دعاؤں کے ساتھ کوشش اور عمل صالح نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے خود ہی اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ عمل صالح ہی سے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ عبادت کی قبولیت کا انحصار اسی پر ہے کہ اس کے ساتھ نیک عمل ہو اور نیک عمل سے جو چیز بڑھ کر ہے وہ رزق حلال ہے۔ بنی اسرائیل کے ذکر میں کئی دفعہ اس کا ذکر ہوا ہے۔ لوگوں کو سود کھانے سے' دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے روکا گیا

ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے اور ان پر لعنت کردی ہے۔ یہی تو ان سے میثاق تھا' یہی تو ان سے وعدہ تھا کہ وہ اللہ کے احکام کی پابندی کریں گے۔ اللہ نے پہلے انسان کی جو آزمائش کی تھی' وہ یہ تھی کہ دیکھو! اس درخت کے قریب مت جانا۔ وہ درخت کیا تھا۔ اس کے اندر کیا خواص تھے' ہم کو یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دیکھیں کہ یہ حکم کس لیے دیا گیا تھا۔ فرمایا گیا کہ دیکھو! اس کے قریب مت جانا اور انسان کے اندر یہی غلطی ہے کہ جس چیز سے روکا جائے وہ اسی کے قریب جائے اور اسی کو کھائے۔ جس پھل سے' جس پیسے سے' جس مال سے' جس غذا سے روک دیا گیا ہے اس کے پیچھے جائے' اسی کو کھائے۔ یہی جنت سے نکلنے کا سبب تھا اور یہی جنت سے دور رہنے کا سبب بھی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کیفیت مسلط ہوجاتی ہے کہ لوگ دعائیں مانگتے ہیں اور وہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

یہ حدیث ایک طویل حدیث ہے۔ اس میں قرآن کی آیات کا بھی حوالہ ہے۔ یہ اصول بھی بیان ہوا ہے کہ اللہ خود پاک ہے اور پاک چیزوں کو قبول کرتا ہے۔ یہ حدیث اس راز کو کھول کر بیان کردیتی ہے۔ اگر یہ راز واقعی راز ہے اور یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں مسلمان جمع ہوتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں' دعائیں مانگتے ہیں وہ کیوں قبول نہیں ہوتیں۔ ہم میں سے ہر آدمی اپنے مال کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اور اگر اپنے مال کا جائزہ لینا گراں گزرے تو مجموعی طور پر آپ دیکھ لیں کہ معاشرے کی حالت کیا ہے۔ مختلف پہلوؤں سے آپ دیکھیں۔ وہ مال جو آدمی نے کسی دوسرے کا غصب کرلیا ہو' کسی کا حق مارلیا ہو' وہ مال تو سرے سے ہی ناجائز ہے۔ اس کے بارے میں بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی نے کسی کا مال ناحق کھالیا' غصب کرلیا' اپنے مال میں ملالیا تو اللہ نے اس کے اوپر جنت کو حرام کردیا اور آگ کو حلال کردیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اگرچہ بہت معمولی چیز ہو۔ آپؐ نے فرمایا: اگرچہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔ اتنی کم چیز بھی ہو تو اللہ نے کسی کا مال ناجائز غصب کرنے اور کسی کا حق مار لینے کو سب سے بڑھ کر حرام قرار دیا ہے۔ اگر آدمی سود لے تو شاید اس میں کسی دوسرے کا حق نہ مارا جارہا ہو لیکن یہ تو سب سے بڑھ کر ہے کہ ایک آدمی پر ظلم بھی ہوا ہو' اس کا حق بھی مارا گیا ہو اور پھر اس آدمی نے اس حق کو اپنے مال

میں ملالیا۔ کسی کا حق مارنا' کسی کا حق غصب کرنا اور اس مال کو کھانا اور اس کو پہننا اور اس کو پینا اور اس سے اپنی پرورش کرنا' اس طرح جب حرام غذا شامل ہوگئی تو جسم سے جو صدا اللہ کو پکارنے کے لیے اٹھے گی وہ کہاں سنی جائے گی۔ ایسے آدمی کی کون سنے گا اور کیوں سنے گا۔

ایک تو آدمی جانتے بوجھتے مال غصب کرتا ہے' ایک رواج ہوجاتا ہے۔ میراث کا حکم بڑا واضح اور صاف ہے۔ اللہ نے جہاں میراث کے احکام بیان کیے ہیں وہاں قرآن کا انداز بڑا واضح اور بڑا سخت ہے اور نبی کریمؐ نے بھی اس کی بڑی واضح تشریح فرمادی ہے۔ کسی وارث کو اس کے ورثے سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی وارث کسی دوسرے کا مال اپنے قبضے میں لاکر استعمال نہیں کرسکتا۔ مال کی وصیت بھی ایک تہائی سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ ورثے کے اندر خورد برد بہت عام ہے۔ ایک تو رواج ہی چلا آتا ہے کہ لڑکیوں کو اور عورتوں کو ورثے سے محروم کردیا جاتا ہے۔ اچھے اچھے لوگ غور نہیں کرتے کہ عورتوں کے جس حصے کو ان کے رب نے ان کو متعین کرکے دے دیا تھا' وہ انھوں نے کیسے رکھ لیا۔ اس کے بارے میں سورۂ نساء کے اندر بڑی وعید ہے اور ایسے آدمی کو جو ورثے کے اندر زیادتی اور تجاوز کرتا ہے جہنم کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ مرنے والے کی ہر چیز ورثہ ہے' اس کا لباس' اس کے جوتے' اس کے استعمال کی چیزیں' اس کا مال ہر چیز' ایک ایک آنہ بلکہ ایک ایک پائی پر بھی وارثوں کا حق ہے۔

رشوت معاشرے کے اندر اتنی عام ہوگئی ہے کہ اب یہ تصور بھی نہیں کیا جاتا کہ اس کے بغیر معاشرہ قائم رہ سکتا ہے۔ یہ آہستہ آہستہ معاشرے کی جڑیں کاٹتی چلی جارہی ہے۔ اس کی وجہ سے حق اور انصاف رخصت ہوگیا ہے۔ کسی کو یہ یقین نہیں ہے کہ میرا حق بغیر رشوت کے مل سکتا ہے۔ کسی بھی کاروبار کے اندر' کسی بھی معاملے کے اندر لوگ خوب بڑھ کر ہاتھ مارتے ہیں اور رشوت کھاتے ہیں۔ ویسا ہی حال ہے جیسا قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے بارے میں کثرت سے ذکر کیا ہے کہ حرام کا مال کھانے والے ہیں۔ ان پر اللہ کا جو غضب نازل ہوا' وہ اسی وجہ سے نازل ہوا ہے۔

اَلرَّاشِیُ وَالْمُرْتَشِیُ کِلَاھُمَا فِی النَّارِ "رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی جہنم میں جائیں گے۔" رشوت حکمرانوں کے لیے اور کسی بھی انسان کے لیے ناجائز ہے۔

ایک صاحب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اس زمانے میں یہ حکومت کا ایسا منصب تھا جس طرح آج کل انکم ٹیکس آفیسر ہوتے ہیں۔ وہ صدقہ وصول کرنے کے لیے گئے۔ بالکل ٹھیک ٹھیک، صاف صاف معاملہ کر کے آئے۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، بے انصافی نہیں کی۔ صدقے کا مال وصول کیا اور اللہ کے رسولؐ کے پاس لا کر حاضر کر دیا اور کہا کہ یہ صدقہ ہے۔ کچھ اور بھی مال ان کے پاس تھا۔ حضورؐ نے پوچھا کہ یہ مال تمھارے پاس کہاں سے آیا؟ انھوں نے کہا کہ لوگوں نے یہ مجھے ہدیے کے طور پر دیا ہے۔ نہ کوئی ایسا ثبوت تھا نہ کوئی ایسی بات تھی کہ ہدیہ قبول کر کے ان صاحب نے کوئی زیادتی کی ہو، کوئی ناانصافی کی ہو یا بیت المال کے اندر کوئی خیانت کی ہو۔ لیکن آپؐ نے کہا: اگر تم گھر بیٹھے رہتے تو کیا تمھیں یہ مال ملتا؟ چنانچہ آپؐ نے سارا مال ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا۔ تو یہ بھی رشوت کی تعریف میں آتا ہے۔

ایک آدمی کہتا ہے کہ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے، بے انصافی بھی نہیں کی ہے، حقدار کو حق ادا کر دیا ہے، اس تحفے اور ہدیے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہی مال تو رشوت خوری ہے جو آہستہ آہستہ انصاف کی، حق کی اور حقوق کی ادائیگی کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور معاشرہ کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ حکمران بیرونی آقاؤں سے رشوت لیتے ہیں۔ سودے کرنے والے اور معاہدے کرنے والے ان سے رشوت کھاتے ہیں۔ سیاسی معاہدے رشوت کے بل پر ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی آزادی کے سودے رشوت کے بل پر ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ اس بات سے بھری ہوئی ہے۔ اسپین میں مسلمان ایک ایک کر کے اس لیے ضائع ہوتے گئے کہ ان کے حکمران اور ان کے امرا عیسائی بادشاہوں سے رشوت لیتے تھے اور مسلمان حکومتوں کی جڑیں کھوکھلی کرتے اور کاٹتے تھے۔ اسی لیے سحت کے معنی جڑ کاٹنے کے ہیں جو رشوت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سود کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ (النساء ۴: ۱۶۱) ''سود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا ہے اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں۔'' سود کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا ہے۔ سود کے اس پیسے کے اندر کیا گندگی ہوتی ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے لیکن سود حرص اور لالچ کو

بڑھاتا ہے۔ آدمی چاہے کہ بغیر محنت کے اور کمائی کے مال آتا جائے اور یہ بات معاشرے کے اندر پھیل جائے تو اس کے اندر فساد پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بغیر محنت کے مال کمانے کی اور مال حاصل کرنے کی حرص اور لالچ پیدا ہو جائے تو معاشرے کی پوری کی پوری بنیادیں ڈھے جاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ سود تو اتنی بڑی برائی ہے اور سود سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک خرابی ناپ تول میں کمی کرنا ہے جو بڑی عام ہے۔ اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ آدمی جہاں بھی مال لیتا ہے تو اس میں خیال کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے کہ کتنا حرام ملا ہے اور کتنا حلال۔ گنے کے کاشت کار ملوں پر آتے ہیں' گنا فروخت کرتے ہیں' تول میں فرق ہوتا ہے اور اس طرح مل مالک کاشت کاروں کو ان کے نفع سے محروم کر دیتے ہیں۔

ناپ تول کی کمی اتنی عام ہو تو اس سے قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ ناپ تول کی کمی سے بھی حرام کی کمائی آتی ہے۔ اسی ناپ تول کی کمی سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کراچی کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں' ان کی بڑی دکانیں بھی ہیں' کاروبار بھی ہیں' فیکٹریاں بھی ہیں اور دین دار بھی ہیں۔ کہنے لگے کہ میں آپ کو اپنا واقعہ بتاؤں کہ ایک دفعہ میں نے یہ سوچا کہ میں بالکل حلال کھاؤں گا۔ میں اپنی بہن کے پاس گیا اور کہا کہ آپ اپنی حلال کی کمائی سے سو روپے یا پچاس روپے مجھے دے دیں۔ وہ بہت پریشان ہوئیں کہ لکھ پتی اور کروڑ پتی آدمی مجھ سے اتنے سے پیسے مانگ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی حلال کی کمائی کھاؤں۔ چنانچہ میں منڈی میں گیا اور میں نے پیاز خریدا' پیاز مجھے پانچ روپے سیر ملا۔ باہر آیا تو معلوم ہوا کہ پیاز ہر جگہ تین روپے سیر بک رہا ہے۔ میں نے ٹھیلے والوں سے پوچھا کہ یہ کیا کرشمہ ہے کہ منڈی کے اندر پانچ روپے بکتا ہے اور تم اس کو تین روپے سیر دیتے ہو۔ اس نے ایک ترازو پکڑ لیا کہ اس کے بل پر ہے' کم تولتے ہیں اور نفع کما لیتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ جن کو اللہ نے لاکھوں کروڑوں دیا ہے فیکٹریاں چلا رہے ہیں' بڑی بڑی دکانیں ہیں' ان کے ہاں بھی اگر ناپ تول میں کمی ہو تو یہ بھی اسی حرام کی تعریف میں آتا ہے۔

یہ حدیث جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ نے صرف پاکیزہ کھانے کی اجازت دی ہے' وہی قبول بھی فرماتا ہے۔ آپؐ نے جس آدمی کا

ذکر کیا ہے وہ تو بڑا عبرت ناک ہے۔ ایک آدمی لمبے سفر کرتا ہے' اس میں مشقت اٹھاتا ہے' سر کے بال پریشان ہیں' پرانے زمانے کے سفر کا ذکر ہے دھول اور گرد پڑی ہوئی ہے اور کپڑے بھی گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔ اور اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتا ہے یا رب' یا رب۔ اے میرے رب' اے میرے رب۔ روتا ہے' گڑگڑاتا ہے' آنسو بہاتا ہے' مانگتا ہے لیکن اس حال میں آیا ہے کہ کھانا بھی حرام' پینا بھی حرام' لباس بھی حرام' جو جسم بنا ہے وہ بھی حرام سے بنا ہے۔ ایسے آدمی کی دعا کیسے سنی جائے گی!

اگر آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اتنی دعاؤں کے باوجود دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو اس کا سراغ اس حدیث کے اندر موجود ہے۔ معاشرہ جاہلیت کے اندر مبتلا ہے' معاشرے کے اندر ظلم ہے' معاشرے کے اندر آدمی مجبور ہو جائے لیکن کم سے کم جو چیز ہمارے اختیار میں ہے اس کے لیے تو ہم قابل مواخذہ ہیں۔ اللہ کے سامنے کوئی کہتا ہے' کہ اے اللہ! میں مجبور تھا' کوئی چیز میرے اختیار میں نہیں تھی۔ کوئی آدمی اس کے لیے تو مجبور نہیں ہے کہ پچاس لاکھ کا نفع ضرور کمائے۔ آدمی مجبور اس لیے ہوتا ہے کہ قناعت کے ساتھ اپنی زندگی گزارے۔ وہ بھی ممکن نہ ہو تو اللہ کے سامنے شاید اپنی جواب دہی کر سکے۔ لیکن ہر آدمی کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنی کمائی کو حلال کرے' اپنے رزق کو حلال کرے' لقمہ منہ میں جائے تو حلال کا جائے' لباس پہنے تو حلال کا پہنے۔ ورنہ یہ نیک اعمال' یہ نمازیں' یہ صدقات ان میں سے کیا چیز فائدہ دے سکتی ہے۔ دعا کیوں نہیں قبول ہو رہی؟ اس لیے کہ قوم کے اتنے گھر ایسے ہوں گے جو حرام سے پل رہے ہیں۔ ایک تو گرد و غبار میں حرام موجود ہے اور وہ ہر ایک کو جا کے لگتا ہے۔ لیکن ہمیں سوچ کے فیصلہ کرنا چاہیے کہ جس کمائی کے اوپر میرا اختیار ہے' جس حرام کو رد کرنا میرے اختیار میں ہے' اس کے لیے مجبور نہیں ہوں' مضطر نہیں ہوں' کم سے کم میں اس سے اپنا دامن بچاؤں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ برکت دے گا' دعائیں قبول ہوں گی' اللہ کی مدد ساتھ ہو گی اور حالات بھی ٹھیک ہوں گے۔

عدل و انصاف کا قیام

وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "اِنَّ الْمُقْسِطِیْنَ عِنْدَاللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ : اَلَّذِیْنَ یَعْدِلُوْنَ فِیْ حُکْمِھِمْ وَاَھْلِیْھِمْ وَمَاوُلُّوْا۔" (رواہ مسلم)

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک انصاف کرنے والے اللہ کے ہاں نور کے منبروں پر ہوں گے۔ وہ لوگ جو اپنے فیصلے میں اور گھر کے معاملے میں اور جن کے وہ ذمہ دار ہیں انصاف برتتے ہیں۔"

جو لوگ انصاف کرنے والے ہیں وہ اللہ کے قریب نور کے منبروں پر اس کے داہنی طرف بیٹھے ہیں۔ رحمٰن عز و جل ہے' اس کا غلبہ اور شان بلند ہے۔ اس کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں میں انصاف کرتے ہیں' جو ان کے ساتھ ہیں ان کے ساتھ بھی انصاف کرتے ہیں اور جو معاملات بھی ان کے سپرد کر دیے جائیں اور ان کے ذمے ہوں' ان سے متعلق ہوں' ان کے اندر بھی عدل کرتے ہیں۔

بالعموم محدثین نے اس حدیث کو عادل حکمرانوں کے باب میں نقل کیا ہے۔ یقیناً ایک عادل حکمران کو سب سے بڑھ کر اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ عدل کرے اور عدل کے اوپر قائم رہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو یہ کہتی ہو کہ یہ حدیث تو صرف حکمرانوں کے لیے مخصوص تھی۔ یہ عام لفظ استعمال ہوا ہے: مقسطین یعنی قسط کرنے والے' قسط کے اوپر قائم رہنے والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سارے فیصلوں

میں، سارے معاملات میں انصاف سے کام لیتے ہیں، انصاف پر قائم رہتے ہیں۔ جن کے ساتھ بھی ان کا معاملہ ہوتا ہے، اور جو برتاؤ ہوتا ہے، گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، گھر کے باہر پڑوسیوں کے ساتھ، دوستوں کے ساتھ، کاروبار میں کام کرنے والوں کے ساتھ اور اگر کسی معاملے کے ذمے دار بنا دیے جائیں تو ان کے ساتھ، غرض ہر ایک کے ساتھ عدل کا برتاؤ کرتے ہیں۔ جس چیز کی بھی ذمے داری ان کے سپرد کر دی جائے، خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز ہو، کوئی حکومت کا منصب ہو، یا کوئی عہدہ ہو، ان سب میں وہ انصاف اور عدل کے اوپر قائم رہتے ہیں۔

ان کا اجر یہ ہے کہ اللہ ان کو اپنی داہنی طرف نور کی مسجدوں کے منبروں پر بٹھا دیتا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ جو رحمٰن ہے، عزوجل، جو بے انتہا، سراپا رحمت ہے، وہ عدل کرنے والوں کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے داہنی طرف نور کے منبروں پر جگہ دیتا ہے۔ پھر فرمایا: ''اس کے دونوں ہاتھ، داہنے ہاتھ ہیں''۔ داہنے ہاتھ پر بٹھانا ایک عزت کا مقام ہے۔ بادشاہوں کے درباروں میں معزز لوگوں کو جن کا احترام مقصود ہوتا ہے، جن کے بارے میں بادشاہ سب کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہے کہ ہم نے اس کو سب سے زیادہ معزز کیا ہے، ان کو اپنی داہنی طرف بٹھاتے تھے۔ یہ صرف بادشاہوں کے درباروں کا ہی اصول نہیں بلکہ پرانے زمانوں میں انسانی معاشروں میں داہنی طرف جگہ دینا عزت کا مقام دینا اور عزت و اکرام کی نشانی تھی، جو بادشاہ اور بزرگ اپنے چھوٹوں سے کیا کرتے تھے۔ اب بھی اس کے اثرات باقی چلے آرہے ہیں۔ آج دنیا میں یہ عام رواج ہے کہ وزرا اور حکمران اسمبلیوں کے اندر اسپیکر کے داہنی طرف بیٹھتے ہیں اور جو حکمران نہیں ہوتے وہ بائیں طرف بیٹھتے ہیں۔ شاید ان عام ایوانوں کے اندر بھی وہی قاعدہ پرانے زمانے کے ورثے کے طور پر چلا آرہا ہے۔ داہنی طرف بٹھانے سے یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے عزت اور احترام کا معاملہ فرمائے گا۔

فرمایا کہ اس کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ اس بات سے بالاتر ہے کہ اس کا کوئی جسم ہو، اس کے کوئی ہاتھ ہوں۔ جو تشبیہات قرآن مجید اور احادیث میں بیان کی گئی ہیں، وہ دراصل اس بات کو ہمیں سمجھانے کے لیے ہماری زبان اور ہمارے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے چاروں

طرف جہاں بھی جگہ ملے گی' وہ عزت اور احترام کی جگہ ہوگی۔ اس کا مقام داہنی طرف ہی ہوگا۔ میں اس کا یہی مطلب سمجھ پایا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پاس جگہ دے گا' اپنے قریب کرے گا' عزت واکرام کرائے گا' اچھی اونچی مسندوں پر جگہ دے گا' وہ مسندیں نور اور روشنی کی مسندیں ہوں گی۔ یہ اجر ہے مقسطین کے لیے' جو اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو دے گا۔

دنیا کے اندر قسط کی تعریف میں وہ ساری تعلیمات آتی ہیں جو اللہ نے خود بندوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود عدل و انصاف پر قائم ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران:۱۸)

اللہ تعالیٰ نے بھی اس بات کی گواہی دی ہے' فرشتے بھی اس بات کے اوپر گواہ ہیں اور جن کے پاس علم ہے' وہ بھی اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں اور وہ انصاف اور قسط کے اوپر قائم ہے۔ اسی بات کا حکم اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ قف (الاعراف:۲۹)

میرے رب نے انصاف اور قسط کا حکم دیا ہے۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان عدل اور انصاف سے کام لوں۔

قسط کی تعریف بڑی وسیع ہے۔ اس کے اندر انسانوں کے تعلقات میں' معاملات میں ہر دائرے میں جو بھی چیزیں آتی ہیں' وہ گفتگو ہو یا عمل ہو' سب قسط کے اندر آجاتے ہیں۔ اسی لیے اس کی تعریف بھی اسی حدیث میں کر دی گئی ہے کہ آدمی کوئی فیصلہ کرے' کسی کے بارے میں کوئی رائے دے تو اس کے اندر وہ انصاف کرے۔ اَھْلِیْھِمْ کا لفظ تو بڑا وسیع ہے۔ اہل کے اندر ہر وہ آدمی' ہر وہ انسان' ہر وہ چیز شامل ہوتی ہے جس کا تعلق انسان کے ساتھ ہو جائے۔ وہ اس کے اہل میں سے ہے۔ ولایت کا لفظ اسی سے نکلا ہے۔ ولی کے معنی ہیں کہ جو معاملہ' جو مناصب اس کے سپرد کر دیے جائیں' جو امانتیں اس کو دی جائیں' وہ ان سب کے حوالے سے عدل و انصاف پر قائم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی ہے' جو کتاب اتاری

ہے اس میں خود ہی فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب بھی اتاری ہے اور میزان بھی اتاری ہے؟ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید:۲۵) ''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا' اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ میزان ترازو کو کہتے ہیں۔ ترازو دنیا بھر میں عدل و انصاف کی نشانی کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے اور قرآن مجید میں ہر چیز میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کے ضمن میں ناپ تول کا ذکر جگہ جگہ کیا گیا ہے۔

دراصل یہ دو چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اتاری ہے' انبیا پر جو احکام اتارے ہیں وہ خود ہی ایک میزان ہیں۔ عقائد میں' اعمال میں ہر چیز میں ٹھیک طریقہ کیا ہے۔ یہ تک متعین ہے کہ بات چیت میں کیا بات کہنا ٹھیک ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ ہم نے اس لیے کیا' اپنے رسول اس لیے بھیجے' ہدایت اس لیے دی' کتاب اس لیے نازل فرمائی اور میزان اس لیے اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ گویا سارے انبیا کے آنے کا مقصد' ہدایت کے آنے کا مقصد' کتاب کے آنے کا مقصد یہ ٹھہرا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور انصاف پر قائم رہنے کو ایک فرض قرار دیا۔ فرمایا: اور پھر ہم نے لوہا اتارا اور لوہے میں قوت ہے' طاقت ہے اور لڑائی کا سامان ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو دیکھے اور آزمائے کہ وہ کون ہیں جو قوت کے ذریعے' اور قوت کو استعمال کرکے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ اور قوت کے ذریعے ہی انصاف قائم کرتے ہیں۔ گویا صاف صاف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معاشرے میں حکومت اور قانون کی طاقت کے بل پر انصاف قائم کرنا بھی ایک فریضہ ہے جو اللہ نے اس امت پر فرض فرمایا ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں بھی اللہ نے فرائض کا حکم بیان فرمایا ہے' یہ بھی کہا ہے کہ تم انصاف کو قائم کرو اور انصاف کے اوپر گواہی دو۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ (المائدہ:۸) انصاف کو قائم کرنے والے' اس پر گواہ بن کر کھڑے ہوجاؤ اور یہ صرف اللہ کے لیے ہو اور کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ صرف اللہ کے لیے' اللہ کے واسطے ہونا چاہیے۔

دوسری جگہ اسی آیت میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے جو میں نے آپ کے سامنے

پڑھی وہ یہ ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ (النساء:۱۳۵)
اور اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، انصاف کو قائم کرنے والے اور انصاف پر گواہ بن کر۔

پوری امت کے وجود کا مقصد یہی ہے کہ حق اور انصاف کے اوپر قائم ہو اور اسی پر گواہی دے۔ یہ بھی حکم ہے کہ خود اپنے اجتماعی اور انفرادی تمام معاملات میں عدل اور انصاف پر قائم رہو۔ یہ دونوں آیتیں جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ میں آئی ہیں، اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ کام اللہ کی طرف سے سپرد کر دیا گیا ہے، اس کو صرف اللہ کے لیے انجام دینا چاہیے۔ کام یہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہوں، اپنے قول میں، فعل میں، معاملات میں، عدل و انصاف قائم رکھیں اور اس کی گواہی دیں۔ امت کا فرض ہے کہ انصاف پر قائم رہے، انصاف کی بات کرے اور انصاف کا عمل کرے۔ انصاف کے اوپر قائم رہنے اور انصاف کی بات کرنے کی زد خود تم پر پڑتی ہو تب بھی تمھیں انصاف پر قائم رہنا ہے۔ والدین ہوں، قرابت دار ہوں، قبیلے والے ہوں، برادری والے ہوں، قوم کے لوگ ہوں، جس سے بھی معاملہ پڑے امیر ہو یا غریب، بے اثر ہو یا دولت مند، تمھارا فرض ہے کہ اللہ کے واسطے انصاف ہی کی بات کہو اور انصاف پر قائم رہو۔ کوئی حکومت کے کسی عہدے پر ہو، معزز ہو، گاؤں کا چودھری ہو، تو آدمی ان کے ساتھ کچھ اور بات کرے، اور غریب، بے بس، بے سہارا ہو تو ان کے ساتھ کچھ اور بات کرے تو یہ زوال اور تباہی کا راستہ ہے۔ دونوں طرح کے معاملات میں حق پر قائم رہنا اور انصاف کی بات کرنا ہے۔

اسی آیت سے متصل قرآن مجید میں ایک آیت آرہی ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (النساء:۱۳۶) ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ۔ بڑا عجیب سا طرز بیان محسوس ہوتا ہے کہ ایمان لانے والوں سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ ایک تو یہ کہ وہ لوگ جو امت مسلمہ کے اندر شامل ہیں، مومن شمار ہوتے ہیں اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، ان سے یہ مطالبہ ہے کہ تم واقعی صحیح مومن بن جاؤ۔ چونکہ اس آیت سے متصل ہے، اس لیے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ ایمان کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ صحیح معنوں میں ایمان لاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی میں، اپنی سوچ میں، اپنے اخلاق میں، اپنی فکر میں، تعلقات

میں، معاملات میں ہر دائرے میں حتیٰ کہ منہ سے بات نکلے تو انصاف کی بات نکلے، کام کرے تو انصاف کا کام کرے۔ کسی کا حق ہو تو اسے پورے کا پورا ادا کرے اور کسی پر فرض عائد ہوتا ہو تو وہ بھی پورا ادا کرے۔ اپنے حق سے زیادہ لینے کی کوشش نہ کرے اور دوسرے کو اس کے حق سے کم دینے کی کوشش نہ کرے۔

یہ دراصل ایمان کی دعوت ہے۔ ایمان کا تقاضا ہے اور مومن کا یہی کردار ہے کہ سارے معاملات میں اسی روش پر قائم ہو جائے۔

حسد اور بغض

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ' اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ "اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ" اَوْ قَالَ "اَلْعُشْبَ" (سنن ابی داؤد 'جلد چہارم' کتاب الادب)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ' اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو ایندھن بنا کر چند منٹوں میں راکھ کر دیتی ہے۔"

ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے نبی نے کچھ چیزوں کا حکم دیا ہے اور کچھ چیزوں سے روک دیا ہے۔ جن کا حکم دیا گیا ہے وہ فرائض میں داخل ہیں اور جن سے روک دیا گیا ہے وہ حرام چیزوں میں داخل ہیں۔ عام طور سے کھانے پینے اور دوسرے معاملات میں ہم حلال و حرام سے اچھی طرح واقف ہیں۔ شراب حرام ہے' سور کا گوشت حرام ہے' زنا حرام ہے' ان سب چیزوں سے ہم بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نماز' روزہ فرض ہے' ان کے احکام پر عمل کرنا چاہیے۔

جن چیزوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے یا جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کا تعلق صرف کھانے پینے اور عبادات سے نہیں ہے' بلکہ ان کا تعلق زندگی کے ہر دائرے سے ہے۔ لوگ عبادات اور کھانے پینے میں حرام و حلال کی حدود سے واقف بھی ہوتے ہیں اور اس پر عمل کی کوشش بھی کرتے ہیں' لیکن اخلاق اور معاملات میں اور زندگی کے دوسرے دائروں

کے اندر بھی اسی طرح چیزیں حلال اور حرام کی گئی ہیں' ان کی لوگ عموماً فکر نہیں کرتے۔

جو چیزیں حرام کی گئی ہیں ان میں سے ایک ''کبر'' ہے یعنی اپنی بڑائی کا احساس' اور دوسروں کو حقیر اور کم تر جاننا۔ گفتگو میں اور معاملات و تعلقات میں اس کے بہت سارے مظاہر مال و دولت کی وجہ سے اور زبان و نسل و رنگ کی وجہ سے سامنے آتے ہیں۔ دراصل سارے گناہوں کی پہلی جڑ کبر ہے۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے آدمی حق بات ماننے سے انکار کرتا ہے' حق کو سننے سے انکار کرتا ہے۔ نصیحت اس کو بری لگتی ہے اور وہ بے شمار برائیوں میں گھرتا چلا جاتا ہے۔ دوسری برائی جو زندگی کے بے شمار اعمال و افعال میں خرابی کی جڑ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کو خود قرآن کریم میں بہت سارے بالواسطہ اشاروں سے منع کیا گیا ہے اور نبی کریمؐ نے بہت واضح طور پر منع کیا ہے' حسد ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَأْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ 'اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ' اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو ایندھن بنا کر چند منٹوں میں راکھ کر دیتی ہے۔

دوسری جگہ اس بات کو واضح حکم دے کر منع کیا گیا ہے۔ بخاری' مسلم' مؤطا اور جامع ترمذی میں بھی ایک روایت ہے جس میں مسلمان کو بہت سی چیزیں نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے' مثلاً ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو' ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو۔ وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَلَا تَحَاسَدُوْا۔ اس میں نہی کا صیغہ ہے' یعنی منع کیا جا رہا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ حسد مت کرو۔ کیوں کہ حسد آدمی کے دل کے لیے اور اس کے نیک اعمال کے لیے اور عبادات کے لیے اور بڑے اچھے اچھے اعمال کے لیے جو آدمی جمع کرتا ہے' ان سب کے لیے مہلک ہے۔ نیک اعمال کبر' حسد اور اس قسم کی بیماریوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا: میں تمھارے اندر انھی برائیوں کو ظاہر ہوتا دیکھتا ہوں جو برائیاں تم سے پچھلی قوموں کے اندر ظاہر ہوئی ہیں اور وہ ہیں اَلْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ وَالْکِبْرُ ، حسد' ایک دوسرے سے دشمنی پالنا اور کبر۔ آپؐ نے فرمایا: دشمنی اور کینہ حسد ہی کا نتیجہ ہے اور حسد استرے کی طرح ہے۔ یہ بال نہیں مونڈتا' پورے دین کو مونڈ کر صاف کر دیتا ہے: ''لا یحلقُ الشعر ولکن

یحلق الدین۔'' ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ کسی بھیڑوں کے گلے میں ان دو بھیڑیوں سے زیادہ کوئی خطرناک بھیڑیے نہیں ہیں کہ جو چھوڑ دیے جائیں تو ان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک بھیڑیا مال کی حرص ہے اور دوسرا حسد۔ یہ دو چیزیں تعلقات خراب کرتی ہیں اور لوگوں کے درمیان فتنہ وفساد پیدا کرتی ہیں' نیز خون بہانے پر' مال کھانے پر' ایک دوسرے کو گالی دینے پر اور حق مارنے پر ابھارتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتایا ہے کہ انسان کی زندگی کی بہتری کی بنیاد کیا ہے اور خرابی کی جڑ کیا ہے۔ آدمی کس طرح اصلاح کی طرف آ سکتا ہے اور کس طرح خرابیوں میں پڑ سکتا ہے۔ حضرت آدم و ابلیس کے واقعے میں کبر کا مظاہرہ سامنے آتا ہے۔ شیطان نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں' میں اسے کس طرح سجدہ کروں؟ اس پر اس نے اللہ کی نافرمانی کی: تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔ اس میں جہاں کبر ہے' حسد بھی ہے۔ جس کو مٹی سے پیدا کیا اس کو اللہ نے یہ مقام کیوں دیا کہ مجھ سے اور سب سے کہا کہ اس کے آگے جھک جاؤ۔ یہ صرف اپنی بڑائی کا احساس نہیں ہے' اپنے مقابلے میں دوسرے کو بڑا دیکھ کر' دوسرے کی کوئی اچھائی یا نعمت دیکھ کر اس پر غصہ اور ناراضی بھی ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کو یہ چیز حاصل نہ ہو۔ اگر حاصل ہوگئی ہے تو میں اس سے چھیننے کی کوشش کروں گا۔ دائیں سے' بائیں سے' آگے سے' پیچھے سے آؤں گا اور گھات لگا کر بیٹھوں گا اور جتنا بھی میں ان لوگوں کو گمراہ کرسکوں گا اور جنت سے نکال کر جہنم میں ڈال سکوں گا' اس کے لیے کوشش کروں گا' اس میں کوئی کمی نہ کروں گا۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے پہلی چیز کبر ہے' اس لیے کہ شیطان کبر کی وجہ سے برائی میں داخل ہوا۔ دوسری چیز آدمی کا لالچ ہے' کیونکہ آدمؑ نے لالچ کی وجہ سے پھل کھایا اور جنت سے نکالے گئے۔ اور تیسری چیز آدمی کا حسد ہے' کیوں کہ دنیا میں سب سے پہلا خون حسد کی وجہ سے ہوا۔ قابیل کو ہابیل سے حسد ہوا کہ اس کو وہ چیز کیوں مل رہی ہے جو مجھے نہیں مل رہی۔ اس نے چاہا کہ یہ اس کو نہ ملے۔ اسی بات نے اسے پہلے خون پر آمادہ کیا۔

یہ حسد بنیادی چیز ہے جو بہت سارے برے اعمال' اخلاقی برائیوں اور انسانوں کے

ساتھ تعلقات میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ جو کفارِ قریش اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے حق اور ہدایت کی مخالفت پر آمادہ تھے' ان کو بھی دراصل اس بات کا حسد تھا کہ نبوت بنو ہاشم میں کیسے چلی گئی۔ اس لیے اس کو ماننے سے انھیں انکار تھا۔ یہودیوں کو بھی اس بات کا حسد تھا کہ نبوت اور رسالت کی وہ نعمت جو بنی اسرائیل میں مسلسل چلی آ رہی تھی' وہ اسحٰقؑ کے بھائی اسماعیلؑ کی نسل میں کیوں منتقل ہوگئی۔ ان کو اپنے دین پر' اپنی ہدایت پر' اپنی تورات پر' انبیا پر' اپنی تاریخ پر' اللہ تعالیٰ نے ان پر جو خصوصی احسانات کیے تھے' ان سب پر بڑا ناز تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ سب چھین کر دوسرے کو دیا جا رہا ہے تو حسد ان کے قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ قرآن مجید نے اس طرف بار بار اشارہ کیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں حسد سے بہت شدت سے روکا گیا ہے اور اس کے نقصانات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ حسد کی حقیقت کیا ہے' اور اس کے معنی کیا ہیں' یہ بات نبی کریمؐ کے مختلف ارشادات سے واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسد یہ ہے کہ اگر کسی اور بھائی کو کوئی نعمت حاصل ہو تو وہ آدمی کو بری لگے۔ صرف بری نہ لگے بلکہ وہ یہ چاہے کہ یہ اس سے چھن جائے۔ یہ دو چیزیں جب جمع ہوں تو حسد بنتا ہے۔ صرف برا لگے اور یہ آدمی کے دل میں رہے تو یہ اگرچہ برائی ہے' لیکن کیونکہ دل قابو میں نہیں ہوتا' وسوسے قابو میں نہیں ہوتے' اس لیے مواخذہ نہیں۔ طبعی طور پر آدمی کے دل میں غصہ بھی آتا ہے' نفرت بھی پیدا ہوتی ہے' حسد کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے لیکن یہ قابلِ مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن جب اس کو برا لگے اور برائی کی آگ میں جل کے وہ یہ چاہے کہ اس سے چھن جائے اور پھر دوسری بے شمار برائیوں کے راستے پہ جا نکلے' اس سے اپنے دل کے اندر دشمنی پال لے' میل رکھے (جس میل کو رکھنے سے منع کیا گیا ہے کہ مسلمان کا سینہ دوسرے مسلمان کے لیے صاف ہونا چاہیے)۔ اگر دل کے اندر عناد' دشمنی' بغض یہ سب میل کچیل ہے تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ حضور پاکؐ نے اپنے ایک صحابیؓ سے کہا کہ اگر تم سے ہو سکے کہ تم صبح اس طرح کرو اور شام اس طرح کرو کہ کسی دوسرے مسلمان کی طرف سے تمھارے دل میں کوئی غش نہ ہو' کوئی دھوکہ نہ ہو' تم اس کے خلاف سوچ نہ رہے ہو' اس کے خلاف کوئی تدبیر نہ کر رہے ہو تو ایسا کرو' اس لیے کہ

یہ میری سنت ہے۔ جس نے میری سنت کی پیروی کی اس نے دراصل مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی' میں بھی اس سے محبت کروں گا اور اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

انسانی تعلقات جب بھی بگڑتے ہیں وہ بنیادی طور پر دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے کی وجہ سے اور حسد اور دشمنی کی وجہ سے بگڑتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے آدمی غیبت کرتا ہے' برا چاہتا ہے' موقع ملتا ہے تو ذلیل کرتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں تعلقات کی خرابی کے لیے جو دشمنی کی وجہ سے بگڑ جائیں' یہی کہا گیا ہے کہ یہ بھی فَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ' آپس کے تعلقات میں فساد اور بگاڑ ہے۔ ایک اور حدیث میں اِفْسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ' لوگوں کے درمیان خرابی پیدا کرنے کو کہا گیا کہ یہ بھی ایک استرا ہے اور اس سے بھی دین کا صفایا ہو جاتا ہے۔ تعلقات کی خرابی اور بگاڑ نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج ان سب کا صفایا کر دیتا ہے۔

حسد کی حقیقت کے بارے میں ایک بات اور یہ ہے کہ یہ ضروری ہے کہ آدمی کو برا لگے اور یہ چاہے کہ وہ اس سے چھن بھی جائے۔ لیکن اگر ایسی چیزیں جو اللہ کو پسند ہیں' نیک اعمال ہیں' اور کسی کو دیکھ کر آدمی کا دل چاہے کہ میں بھی ایسا ہی ہو جاؤں تو یہ تو اللہ کو بہت محبوب ہے۔ ایک حدیث ہے کہ سوائے دو آدمیوں کے کسی سے حسد کی اجازت نہیں ہے۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اگر آدمی کے دل میں یہ خواہش آئے کہ میرے پاس بھی مال ہو اور میں بھی اس کو اس طرح اللہ کی راہ میں خرچ کروں تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ بھی ہے۔ اسی طرح وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب' دین' رسول کی سنت کا علم دیا ہو اور وہ اس کو دوسروں تک پہنچائے' اس جیسا بننے کی خواہش بھی حسد نہیں ہے' بلکہ جائز اور مطلوب ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر آدمی دنیا کے بارے میں چاہے کہ اس آدمی کے پاس جیسا مکان اور جیسی دولت' عزت' شہرت ہے' یہ مجھے بھی حاصل ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فی نفسہ آدمی کا اللہ تعالیٰ سے یہ خواہش کرنا کہ مجھے بھی دولت' مکان' عزت عطا فرما' اس میں کوئی چیز اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں ہے۔ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ لیکن یہ ناپسندیدہ اسی وقت ہے جب آدمی اسی کے اندر ڈوب جائے۔ وہ ان چیزوں کو حاصل کرنے میں دوسروں

سے آگے بڑھنے کے لیے غلط کاموں پر بھی اتر آئے۔ اگر آدمی یہ چاہے اور اللہ سے دعا بھی کرے کہ جیسا مکان اس کے پاس ہے ویسا مکان میرے پاس بھی ہو اور جیسی دولت اس کے پاس ہے ویسی دولت میرے پاس بھی ہو دنیا کے اندر جیسی کامیابی اسے مل رہی ہے مجھے بھی ملے جتنی عزت اور شہرت اس کے پاس ہے اتنی عزت اور شہرت میرے پاس بھی ہو تو یہ فی نفسہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی طرف انسان کی رغبت اللہ تعالیٰ نے خود انسان کی فطرت میں رکھی ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ (اٰل عمران: ۱۴) "لوگوں کے لیے مرغوبات نفس--- عورتیں اولاد سونے چاندی کے ڈھیر چیدہ گھوڑے مویشی اور زرعی زمینیں--- بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں"۔ ان چیزوں کی خواہش تو انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ اس کے بغیر تو نہ اس کا امتحان ہو سکتا ہے نہ وہ امتحان میں کامیاب ہو کے جنت حاصل کر سکتا ہے اور نہ انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی ہو سکتی ہے۔

لیکن فرمایا کہ اس سے بہتر بھی کوئی چیز ہے۔ کیا میں تمھیں اس کی خبر نہ دوں۔ اصل مقصود تو اللہ کی رضا اور جنت ہونی چاہیے۔ اگر آدمی پر دنیا کی خواہش اتنی غالب آجائے کہ وہ یہی سوچتا رہے کہ اس کے پاس جیسا مکان ہے ایسا ہی میرے پاس ہو تو یہ چیز خرابی اور فتنے کی جڑ ہے۔ اس لیے اس سے آدمی جتنا بچے اچھا ہے۔ اپنی دنیا کے لیے کوشش کرنا منع نہیں ہے۔ اگر آدمی جائز ذرائع کے ساتھ حدود کے اندر رہتے ہوئے اللہ کا حق ادا کرتے ہوئے کوشش کرے تو یہ پسندیدہ ہے۔ لیکن جب آدمی دوسرے کو دیکھ کر مقابلے پر آ کر کہتا ہے کہ وہ آگے بڑھے گا اور پھر جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر کوشش کرتا ہے تو یہ دنیا کے اندر وہ دلچسپی ہے جو انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہے۔

حسد کا سبب بھی قرآن و حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہی ہوتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑی شے سمجھے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے بھی میری طرح ہو رہے ہیں ان کو مجھ سے زیادہ مل رہا ہے تو اس کے دل میں برائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کو یہ بہت سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ ان سے چھن جائے۔ مجھے سب کچھ ملے مگر ان کو

کچھ نہ ملے۔ یہ اپنی بڑائی کے احساس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

آپ غور کریں کہ ہم نے ان چیزوں کی جن سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے، جو ترتیب قائم کی ہے اور جو دل اور عمل دونوں سے تعلق رکھتی ہے، ان میں سے بنیادی چیز ''کبر'' یعنی اپنے بڑے ہونے کا احساس ہے۔ حسد کا پہلا سبب یہی ہے کہ آدمی کے اندر'' کبر'' ہو۔ اس کے بعد اگر کسی سے دشمنی ہو جائے، کوئی تکلیف یا ایذا پہنچائے، کوئی حق مارے، کسی وجہ سے بھی دشمنی ہو سکتی ہے، بے بنیاد بھی ہو سکتی ہے، جب دشمنی ہوتی ہے تو اپنے دشمن کی کوئی بھی چیز دیکھ کر آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نعمت اس کو حاصل نہ ہو اور یہ اس سے چھین لی جائے۔ اسی لیے اکثر احادیث میں عداوت اور حسد کو جمع کیا گیا ہے، یعنی دشمنی پیدا ہو جائے تو وہ حسد کی طرف لے کر جاتی ہے۔ حسد پیدا ہو جائے تو وہ دشمنی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ جب آدمی کسی کو اپنا دشمن سمجھ لے تو اس کی ہر اچھی چیز اس کو ناگوار لگتی ہے۔ دشمنی کے پیدا ہونے کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نے آپ کا کوئی حق مارا ہے، دشمنی پیدا ہونے کے تو بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں۔

پھر اپنی عزت کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔ دوسرے شخص کو آگے جاتا دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ میری عزت پر حرف آ رہا ہے۔ جب کسی دوسرے کو دیکھ کر عزت پر حرف آنے لگے کہ اس کو حیثیت، مرتبہ اور دولت حاصل ہو رہی ہے، تو پھر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس سے یہ چھن جائے اور یہ چیز بھی مجھ کو مل جائے، یا مجھ کو نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھن جائے۔

حسد کا ایک سبب دنیا کی محبت بھی ہے۔ یہ بہت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح حرص ہے۔ حدیث میں ان دونوں چیزوں کو ساتھ جمع فرمایا ہے کہ جہاں پر مال کی حرص ہو گی اور اس کے ساتھ حسد ہو گا تو یہ بھی نیکیوں کو کھا جائے گا۔

اس طرح مختلف اسباب کی وجہ سے آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ برائیوں کے راستے پہ نکل کھڑا ہوتا ہے۔ آدمی کی فطرت میں اور اس کے کردار و اعمال میں یہ برائیاں مختلف طریقے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے دل کے اندر جو جلن اور غم ہوتا ہے وہ تو اپنی جگہ، لیکن اس سے آگے بڑھ کے آدمی پھر وہ کام کرنے لگتا ہے جن میں ایک ایک کو اللہ اور اس

کے نبیؐ نے ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسد کے ساتھ جو بہت سی برائیاں جمع کی ہیں وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ آدمی جب دوسرے کی برائی کی ٹوہ لیتا ہے کہ اس میں کیا کیا برائی اور خامی ہے' تجسس کرتا ہے تو یہ بھی ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے کہ اس کے پاس مال ہے' عہدہ ہے' عزت وشہرت ہے' اس کا خاندان اچھا ہے تو اس کے دل میں حسد پیدا ہوجاتا ہے اور پھر وہ اس فرد میں خرابیاں اور برائیاں تلاش کرنے لگتا ہے۔ سوچنے لگتا ہے کہ کیا کیڑے میں اس میں نکال سکتا ہوں جو دوسروں کے سامنے بیان کر کے ان کی نظروں میں اسے گرا سکوں۔ ٹوہ لگانا' تجسس کرنا' باقاعدہ جاسوسی کرنا' ان سے منع فرمایا گیا ہے۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا، اور تجسس نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ برائیوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور ان کو بیان نہ کرو۔

غیبت کے اندر بھی دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب حسد ہوتا ہے۔ آدمی کسی کی برائی پیٹھ پیچھے اس لیے کرتا پھرتا ہے کہ کسی طرح دوسروں کی نگاہوں میں اس کو گرائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑا معزز بنا پھرتا ہے' لوگ اس کو بڑا اچھا سمجھتے ہیں' اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں' تو اس کو کسی طرح لوگوں کی نظروں میں گرایا جائے۔ چنانچہ وہ اپنی دشمنی کے انتقام کے لیے' اپنے نفس میں مخفی عداوت کی خاطر ان برائیوں کو بیان کرتا پھرتا ہے۔ غیبت تو سود کھانے سے بھی بڑا گناہ ہے اور بعض احادیث کے مطابق زنا سے بھی بڑا گناہ ہے۔ قرآن نے اس سے روکا ہے اور اسے اپنے بھائی کا مردار گوشت کھانے کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ غیبت جیسا بڑا جرم بھی حسد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

آدمی جس سے حسد کرتا ہے اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہوتا ہے۔ گفتگو میں تمسخر' گالی کا استعمال اور ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کو تکلیف پہنچے اور حاسد کی حسد کی آگ میں ٹھنڈک پڑے' ان ساری برائیوں میں وہ حسد کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر برائی نیکیوں کو کھانا شروع کر دیتی ہے۔ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مظلوم اپنے دعوے لے کر کھڑے ہو جائیں گے تو وہاں ظالموں کے پاس اپنے نیک اعمال کے سوائے کوئی

کرنسی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہر دعویدار کو اس پر کیے گئے ظلم کا قصاص ضرور دے گا۔ یہ وہ اس طرح دے گا کہ نیکیاں لیتا جائے گا اور دعویداروں کے حوالے کرتا جائے گا۔ اگر اس کے بعد بھی ان کے دعوے پورے نہیں ہوں گے تو دعویدار مظلوموں کے گناہ لے کر ظالم کے سر ڈال دے گا۔ وہ اپنے گناہ بھی سمیٹے گا' دوسروں کے گناہ بھی سمیٹے گا اور جہنم میں جا گرے گا۔ حاسد کا یہ حشر ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ اگر حسد کی آگ دل کے اندر جل اٹھے تو یہ محبت' شفقت' انصاف اور وہ ساری نیکیاں جو دل کے اندر ہونا ضروری ہیں' ان سب کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

پھر ان اعمال کا ذکر ہے جو نیکیوں کو برباد کرنے والے ہیں۔ اسی لیے حسد کو استرا بھی کہا گیا ہے۔ حسد سے کینہ اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ جب کینہ اور دشمنی پیدا ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں آدمی وہ کام کرتا ہے جو اعمال کو صاف کر دیتے ہیں۔ اسی لیے اس کو بھیڑیا کہا گیا ہے۔ جس طرح بھیڑیا گلّے کے اندر داخل ہو کر اس کا صفایا کرتا ہے' اسی طرح حسد اگر داخل ہو جائے' تو اعمال کا بھی صفایا کرتا ہے اور آپس کے اعتماد' محبت اور یگانگت کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ احادیث میں جن تمثیلات اور تشبیہات کے ذریعے حسد سے روکا گیا ہے' وہ سب کی سب اپنی جگہ بڑی بامعنی ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسد کا علاج کیا ہے۔ ہمیں اس بات کو اس طرح سمجھ لینا چاہیے اور ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس کام کے لیے اللہ کے رسولؐ نے صاف صاف حکم دیا ہے کہ یہ اسی طرح حرام ہے جس طرح شراب پینا حرام ہے' وہ ہمارے لیے اسی طرح حرام ہے۔ شراب تو ظاہر میں موجود ہے' آدمی جام اٹھائے گا' شراب پی لے گا تو حرام کا ارتکاب کرے گا۔ اس لیے ہم اس سے رکے رہتے ہیں' لیکن حسد ایک غیر محسوس چیز ہے۔ اسی طرح غیبت ہے۔ لیکن یہ چیزیں معاملات میں اور اخلاق میں اسی طرح حرام ہیں جس طرح کہ کھانے پینے میں یہ چیزیں حرام ہیں۔ کوئی بھی ایمان دار آدمی یہ نہیں سوچے گا کہ میں اس حرام کا ارتکاب کروں۔ دراصل ان چیزوں کی حرمت عموماً محسوس نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے دیندار

لوگ اور علما بھی ان میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دین اور نیکی کے ساتھ کبر اور حسد کا داخل ہونا بڑا اغلب ہے اور اس کا بڑا امکان ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ چھ آدمیوں کو اللہ حساب کیے بغیر ہی جہنم میں ڈال دے گا' یعنی وہ جرم اتنا بڑا ہے کہ اگر حساب نہ بھی کیا جائے تو وہ اس کو جہنم میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔ ان میں پہلا ظالم حکمران ہے۔ اگر حکمران ظالم ہو تو وہ لازماً اتنے گناہ کرے گا کہ اگر ان کا باقاعدہ حساب نہ بھی کیا جائے تو بھی اس کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ان چھ میں آخری وہ عالم ہے جس کے اندر حسد کی بیماری موجود ہو۔ اگر کسی دوسرے کو تقریر کے لیے زیادہ بہتر موقع دیا جائے تو اس کا دل جلنے لگتا ہے۔ اسٹیج سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ماتھے پر تیوری چڑھ جاتی ہے۔ کسی دوسرے کو اگر اسٹیج پر لا کر پہلے بٹھا دیا جائے' دوسرے کا احترام اگر پہلے کیا جائے تو برائی دل کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ جس عالم کے اندر حسد کی بیماری ہو' وہ لازماً اتنے گناہوں کا ارتکاب کرے گا کہ حدیث کی رو سے اگر بغیر حساب کے بھی اسے جہنم میں ڈال دیا جائے تو انصاف کے منافی نہیں ہوگا۔

حسد کا پہلا علاج یہ ہے کہ آدمی ہر بات کو جانے اور سمجھے اور عمل اور کوشش سے اور ریاضت اور مجاہدے سے اس بیماری کو اپنے دل سے نکال دے۔ اگر شراب کی عادت کسی کو پڑی ہوئی ہے تو اس کی دوا کوئی وظیفہ یا نسخہ نہیں ہے۔ گناہوں کو ترک کرنے کا طریقہ اپنے ارادے اور کوشش کے سوا کوئی نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کوئی نسخہ بتایئے کہ یہ کام ہو جائے' تو اپنے کیے بغیر تو کوئی کام نہیں ہوتا۔ جتنا آدمی کے اختیار میں ہے اتنا وہ کرے۔ اگر آدمی کے دل میں تنگی پیدا ہو جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن اس تنگی کو پالنا' دشمنی میں بدلنا' کوئی ایسی بات کہنا' کوئی ایسا عمل کرنا' اپنی زبان سے کہنا' اپنے ہاتھ سے عمل کرنا' یہ اختیار میں ہے' اس پر مواخذہ ہوگا۔ لہٰذا پہلی بات: صحیح سوچ اور ارادہ ہے' اس کے بعد: مجاہدہ' ریاضت' محنت' جس سے کہ یہ برائی دور ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کسی سے حسد کرتا ہے تو جیسا کہ کسی بزرگ نے فرمایا کہ آدمی اس کا نہیں اللہ کی نعمت کا دشمن ہوتا ہے' اس لیے کہ جو کچھ اس کو ملا ہے' وہ اللہ کی طرف

سے ملا ہے۔ دنیا میں جس کو جو کچھ مل رہا ہے‘ وہ اللہ کی طرف سے مل رہا ہے۔ اگر اتنی بات ہی ذہن میں راسخ ہو جائے کہ جو بھی میرے دوست کو‘ دشمن کو ملا ہے‘ برابر والے کو ملا ہے‘ دوسری عورت کو ملا ہے تو یہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اللہ کی بخشش کو غلط سمجھنا‘ اس پر دل تنگ ہونا‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ تو انصاف کے ساتھ دے رہا ہے‘ برکات و بخشش کے ساتھ دے رہا ہے۔ اللہ کی نعمت سے دشمنی کی وجہ سے حسد پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

حسد دراصل اللہ کی تقسیم پر ناراضی کا اظہار ہے۔ کوئی شخص بندے سے تو ناراض ہو سکتا ہے‘ لیکن جس کے دل میں ایمان ہے وہ اللہ سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ اگر دینے والا اللہ ہے تو اس سے ناراضی کیسی۔ نبی کریمؐ نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ کسی دل میں اور کسی سینے میں حسد اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے۔ جب یہ ایمان ہو کہ خدا کی بخشش میں کوئی چیز غلط نہیں ہو سکتی تو پھر حسد نہیں پیدا ہو سکتا۔

اگر میں حسد کرتا ہوں تو میں اپنی آگ میں جلتا ہوں۔ میرے دل کے اندر بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے‘ ڈیپریشن کی بیماری ہوتی ہے اور میں نفسیاتی طور پر ایک کڑھن کے اندر مبتلا رہتا ہوں۔ اب میں اسی آگ میں جلتا رہوں کہ کسی سے اس کا رتبہ اور ہر شے چھین لوں۔ یہ حسد رشتوں کے اندر بھی ہوتا ہے‘ بیوی کو بھی ہوتا ہے کہ شوہر کی توجہ دوسری طرف زیادہ کیوں ہو گئی۔ اس کی وجہ سے اولاد اور والدین کے درمیان کتنے فتنے اور فساد پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا حاصل‘ رنج والم کے اندر مبتلا رہنے کے علاوہ اور کیا ہے۔

جس کسی آدمی کے بارے میں یہ احساس پیدا ہو‘ آدمی اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے اللہ! اس کو تو اور عطا فرما۔ اپنے دل پر جبر کر کے اس کے لیے دعا کرے۔ کسی مجلس میں اگر اس کی تعریف کرنا ہو تو اپنے دل پر جبر کر کے اس کی تعریف کرے‘ اس کی برائی کی بات نہ کرے اور کہیں برائی کی بات زبان پر آئے بھی تو اس کی اچھائی بیان کرے۔ ایک طرف اللہ کے اوپر ایمان رکھے کہ دنیا و آخرت میں اس کے انجام کو سوچے‘ اس کی تعریف

کرے، اس کی اچھائی بیان کرے، اس کی شکل کو اپنے ذہن میں لا کر اس کی بخشش کی دعا کرے۔ آدمی جس کا دشمن ہو اس کے لیے دعائے خیر کرے۔ اس کو معاف کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ یقیناً یہ آسان کام نہیں لیکن جو درخت زمین کے اندر گڑا ہوا ہو، آپ چاہیں اور دعا کریں کہ وہ گر جائے تو وہ نہیں گرے گا، اس کے لیے کھودنا پڑے گا اور محنت کرنا پڑے گی۔ حسد اور بغض جیسی صفات جو دین کو برباد کر کے رکھ سکتی ہیں، ان کا علاج یہی جدوجہد ہے۔

وعدے کی پابندی

عَنْ اَبِیْهِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔

(بخاری)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔"

جن اخلاقی صفات پر ہماری زندگی کی بہتری کا دارومدار ہے' ان میں سے ایک اہم اخلاقی صفت یہ ہے کہ انسان اپنے وعدے کو پورا کرے۔ حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ " اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: آیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ ۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ' وِ اَذَا وَعَدَ اَخلَفَ' وَاِذَا عٰھَدَ غَدَرَ ، جب بات کرے جھوٹی کرے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب عہد کرے تو اس عہد کو توڑے۔

مسلم کی روایت میں اس کے بعد کچھ اور بھی الفاظ ہیں اور وہ یہ ہیں: 'وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ ' اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور یہ زعم دعویٰ کرتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ دیگر روایات میں کچھ دوسرے الفاظ کا بھی اضافہ ہے۔ "اگرچہ وہ نماز پڑھے، روزہ رکھے، حج کرے، عمرہ کرے اور اپنے بارے میں یہ زعم رکھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔" اس کے باوجود یہ نشانی' منافقت کی نشانی ہے۔

اس حدیث میں منافق کی تین نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ تینوں کے مطلب ایک

دوسرے سے قریب قریب ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ بعض روایات کے اندر یہ الفاظ بھی ہیں۔ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ ، جب کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

جھوٹی بات بہت وسیع چیز ہے۔ جھوٹ برائیوں کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور سچائی پر قائم رہنا، سچائی کی تلاش کرنا اور پہچاننا اور قبول کرنا پورے دین کی بنیاد ہے۔ نبی کریمؐ چونکہ سچے تھے' اس لیے ماننا پڑا کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ثبوت ایسا نہیں ہے جس سے ہم یہ ثابت کرسکیں کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے۔ جو بھی دلیل ہم دیں گے' اس کے مخالف بھی دلیل دی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر نبی کریمؐ سچے تھے اور آپؐ کا یہ بیان، دعویٰ اور قول تھا تو اس گواہی کے بعد شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ دین کی ساری تعلیم سچائی پر مبنی ہے۔ کسی آدمی کا ایمان لانا بھی سچائی کو ماننا ہے۔ ایمان بھی ایسا مطلوب ہے جو سچا ایمان ہو۔ سچے ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دل میں کچھ اور نہ ہو اور عمل کسی اور قسم کا نہ ہو۔ جو بات زبان پر ہو، دل بھی اسے سچ جانتا ہو۔ عمل بھی اس کی تصدیق کرے کہ جو کچھ زبان پر ہے' وہ دل میں بھی سچا مانا جارہا ہے اور عمل بھی سچائی کی گواہی دے رہا ہے۔ فقہا نے ایمان کی تعریف یہی کی ہے کہ زبان سے اقرار ہو، دل سے تصدیق ہو اور جسم کے اعضا سے اس کے مطابق عمل ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اپنی رضامندی سے غائب ہو تو پھر ایمان صحیح نہیں رہتا۔ اگر آدمی دل میں سچا جانتا ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا، اور اس کو اقرار کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے تو یہ بھی منافقت کی بات ہے۔ ہاں اگر جان کا خوف ہو تو آدمی کو اجازت ہے کہ اقرار نہ کرے بلکہ جان کے خوف سے کلمہ کفر کہنے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن اگر کسی کو خوش کرنے کے لیے، لعنت و ملامت کے ڈر سے آدمی سچی بات کا اقرار نہیں کرتا تو اس کی اجازت نہیں۔ اگر زبان پر سچی بات ہو اور دل میں عمل اس کے مخالف ہو تو قرآن مجید نے اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ تو خالص منافق آدمی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ منافق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ یہ بات سچی کہہ رہے ہیں، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ: نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ،ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں تو بالکل صحیح بات کہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ

ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنٰفقون ۶۳:۱)، اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ آپؐ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔ سچی بات کہنے کے باوجود جھوٹے ہیں، یعنی دل اور زبان میں جو جھوٹ ہے اس کو بھی منافقت کہا گیا ہے۔

منافق کے حوالے سے حدیث میں جو تین نشانیاں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی بات تو جامع ہے کہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اس کے بعد کی دو باتیں دراصل اسی کی تشریح ہیں۔ وعدہ کرنا اور اس کے خلاف کرنا، یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ عہد باندھنا اور اس کو توڑنا' یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ ان تینوں صفات کا خلاصہ جھوٹ ہے۔ منافق فی الواقع جھوٹا ہوتا ہے۔ اسی لیے منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، وعدہ توڑتا ہے اور عہد کے خلاف کرتا ہے۔

وعدے کا لفظ یہاں علیحدہ آیا ہے اور عہد کا لفظ علیحدہ۔ ان دونوں کا الگ الگ استعمال کیوں کیا گیا؟ یہاں پر وعدے کا لفظ زبانی قول وقرار کے معنی میں ہے اور عہد کا لفظ بہت وسیع ہے۔ ایک یہ کہ آدمی زبان سے کسی چیز کا اقرار کرے، پھر اس کے خلاف کرے اور دوسری بات یہ کہ جس عہد کا وہ پابند ہے' اس عہد کو وہ توڑے۔ عہد کے لفظ پر غور کریں تو یہ پوری حدیث اور وعدے کی پابندی کے معنیٰ اور اس کی دین میں اہمیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہاں پر یہ لفظ اس طرح سے ہے کہ وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے۔ بعض احادیث میں اس طرح ہے کہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ عہد باندھتا ہے تو توڑتا ہے۔ کوئی امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ یہاں پر عہد کا لفظ زبانی قول وقرار میں شامل ہے۔ جو آدمی بھی اس بات کا اقرار کرے کہ میں ایسا کروں گا' تو بات چھوٹی ہو یا بڑی ہر طرح کی بات اس کے اندر شامل ہے۔ زبانی قول وقرار سے بڑھ کر اس کے اندر وہ سارے معاہدے بھی شامل ہیں جو معروف طریقے سے معاشرے کے اندر مسلّم سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا عہد۔ اگر آدمی زبان سے اقرار نہ بھی کرے تو وہ بندگی کا اس لیے پابند ہے کہ وہ معروف طریقے سے دسترخوان پر اس کا دیا ہوا کھاتا ہے، اس کے بنائے ہوئے گھر کے نیچے رہتا ہے، اس کی بنائی ہوئی چھت کے نیچے بسیرا کرتا ہے اور اس کا اتارا ہوا پانی پیتا ہے۔ قرآن مجید نے انھی دلائل کی طرف کثرت سے بار بار اشارہ کیا اور بندگی کی دعوت

اسی کے حوالے سے دی ہے۔ جس نے آسمان کو چھت بنایا اور زمین کو فرش بنایا اور آسمان سے پانی اتارا، اسی کی بندگی کرو کیونکہ تم اس کی بندگی کے پابند ہو۔

عہد کا لفظ کسی خاص چیز کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے، جس میں آدمی ذمہ داریاں اُٹھانے کا وعدہ کرے، مثلاً ریاست کے مناصب یا دوسرے عہدوں کے لیے حلف اٹھائے جاتے ہیں، یا کوئی آدمی اس ریاست کے قوانین کی اطاعت کا عہد کرتا ہے تو یہ بھی اس عہد کے اندر شامل ہے۔ پھر معاشرے کے اندر وہ حقوق جو انسانوں کے اندر جانے پہچانے ہیں، جن کو سب مانتے ہیں، ان کا اگر وہ زبان سے اقرار نہ بھی کرے یا لکھ کر نہ بھی دے تب بھی اس کی حیثیت ایک عہد کی سی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بیٹا اپنے باپ کو یہ لکھ کر نہ بھی دے کہ میں نے تمھاری خدمت کا، اطاعت کا اور تمھارے ساتھ اچھے سلوک کا عہد کیا ہے، تب بھی معاشرے کے اندر یہ مسلّم اور معروف ہے، اس لیے یہ عہد کی تعریف میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عہد کو دین کی بنیاد قرار دیا ہے۔ نبی کریمؐ نے بھی یوں فرمایا ہے کہ جسے پاسِ عہد نہیں، اس کا کوئی دین نہیں۔ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَھْدَلَہٗ ’’جسے امانت داری کا پاس نہیں، اس کا کوئی ایمان نہیں اور جسے اپنے قول و قرار اور عہد کا پاس نہیں، اس کا کوئی دین نہیں۔‘‘

دین پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کا نام ہے۔ یہ بندگی کے اقرار پر قائم ہوتا ہے۔ بندگی کے اقرار کا اللہ تعالیٰ نے دو طرح سے ذکر کیا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ تم نے اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کے بارے میں تم کسی طرح بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی اور کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ اس لیے وہ بار بار سوال کرتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کس نے بنائے؟ آسمان سے پانی کون اتارتا ہے؟ رات کے بعد دن، اور دن کے بعد رات کون لاتا ہے؟ تو کہتے ہیں: اللہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم رات کو اتنا طویل کر دیں کہ سورج نہ نکلے، تو کیا دنیا کے اندر کوئی ہے جو اس رات کو دن میں بدل سکے۔ لوگ کہیں گے، نہیں، ایسا کوئی نہیں۔ اس کے واسطے سے پھر وہ کہتا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو۔

وہ ایک اور اشارہ بھی کرتا ہے کہ ہم نے سارے بنی آدم کو ازل میں جمع کیا۔ ان سے پوچھا: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (الاعراف: ۱۷۲) ’’کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں‘‘؟ قَالُوْا بَلٰی، تو

انھوں نے کہا: کیوں نہیں، تو ہمارا رب ہے۔ اس کو ہم عہدِ ازلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ عہد جو ابتدا میں ہی مخلوق نے اپنے خالق سے باندھ لیا تھا۔ جب خالق نے بندگی کا اقرار کروایا تھا کہ مجھے ہی اپنا رب تسلیم کرو تو انھوں نے اس کو ماننے کا اقرار کیا تھا۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمیں یاد نہیں، ہمارے حافظے میں یہ محفوظ نہیں ہے کہ ہم نے کسی دن کھڑے ہو کر اس بات کا اقرار کیا ہو۔ پھر اس عہد کی نوعیت کیا ہے؟ معنیٰ کیا ہیں؟ اس پر مفسّرین نے بہت گفتگو کی ہے کہ واقعی کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا، یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رب کی جو طلب اور جستجو رکھی ہے، وہ ہے۔ رَب اور بندگی کی تلاش، خواہ آدمی مانتا ہو یا نہ مانتا ہو، خواہ بتوں کے پیچھے جاتا ہو، ازل سے انسان کی فطرت کی جستجو ہے۔ وہ پتھر کے آگے سر ٹیک دے، سورج کو اپنا رب مانے، چاند کے آگے سر جھکا لے، انسانوں کو رب بنا لے، چاہے اس کے پاس جائے جو ساری دنیا کو بنانے والا ہے لیکن بندگی اس کی فطرت کے اندر اس طرح گھلی ہوئی ہے کہ اس سے وہ انکار نہیں کر سکتا اور کسی نہ کسی کو اپنا معبود ضرور بناتا ہے۔ یہ عہد ہے جس پر انسان قائم ہے۔

پھر دیکھیں، ایمان بھی ایک معاہدہ ہے۔ ایمان اقرار بھی ہے اور معاہدہ بھی۔ چنانچہ جب اللہ نے ایمان کی تعریف فرمائی تو ایک طرف تو جو ایمان لانے والے ہیں ان کی طرف سے تعریف یوں فرمائی ہے کہ: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط (البقرۃ:۲۰۷) ”وہ لوگ جو کہ اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں، اللہ کی رضا چاہنے کے لیے“۔ یعنی اس قیمت کے عوض پر۔ یہ ایمان کی تعریف ہے۔ اپنے آپ کو فروخت کرنا، بیچنا ایک معاہدہ ہے، عہد ہے اور ایک وعدہ ہے، جس میں آدمی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کی رضا کی قیمت قبول کرتا ہے اور اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہ تو بندوں کی طرف سے ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کی تشریح یوں ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: ۱۱۱) ”اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال خرید لیے ہیں، اس بات کے بدلے میں کہ ان کے لیے جنت ہے“۔

اللہ تو ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس نے آ کر ہمیں احکام نہیں دیے ہیں

کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں، اس کی بندگی کے عہد کے کیا تقاضے ہیں اور کیا قیمت ہم کو ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اللہ کا رسول انسانوں میں ہی سے آتا ہے۔ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔ جو اس بات، اس دعوے کو نہ مانے وہ تکذیب کا مرتکب ہے۔ لیکن جو اس بات کو جان لے اور ماننے کے بعد بھی رسول کا کہنا نہ مانے' اور نہ اس کے پیچھے چلے، اس کی بات کے بارے میں شک وشبہ میں رہے تو وہ آدمی بدعہدی کا مرتکب ہوتا ہے کہ عہد کرنے اور ماننے کے بعد خلاف ورزی کرتا ہے۔ رسولؐ کا تو یہ مقام ہے ''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر وہ اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرتا پھرے''۔ (الاحزاب ۳۶:۳۳) امیر اور حاکم کی اطاعت آدمی خوش دلی کے ساتھ کرے یا بددلی کے ساتھ کرے' لیکن کہنا ماننا ضروری ہے۔ وہ اس کا پابند ہے۔ ایک قانون آپ کو ناگوار بھی ہو' تو ناگواری کے ساتھ بھی اس کی اطاعت کریں' لیکن ناگواری کا ہونا کسی جرم یا کسی نقص کی بات نہیں ہے۔ لیکن اللہ کے رسولؐ کے حکم پر کسی ناگواری کا ہونا ایمان کے منافی ہے۔ اگر یہ ایمان ہے کہ اللہ کے رسولؐ جو بات کہہ رہے ہیں، جو حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے تو اس کے بعد دل کے اندر کسی ناگواری، تنگی یا تلخی کا ہونا ایمان کے منافی ہے۔

آدمی جو بھی عہد کرے، اس کی پابندی اس کے لیے ضروری ہے۔ عہد کے جو مختلف طریقے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کا لفظ اپنے اندر ہر اس چیز کو شامل کرتا ہے جس کا آدمی کرنے کا پابند ہے۔ یہ پابند وہ عقل کی رو سے فطرت، شرع اور معاشرے کے معروف و مسلّم قواعد کے تحت بھی ہو سکتا ہے اور اپنے قول وقرار کی نسبت سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے واضح طور پر اقرار کیا ہو کہ میں اس کی پابندی کروں گا۔ ہر جگہ یہ واضح اقرار ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی سڑک پر گاڑی لے آئے اور داہنی طرف گاڑی چلانے پر اصرار کرے کہ میں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا کہ میں بائیں طرف گاڑی چلاؤں تو اس کا حادثہ ہوگا، ہلاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں اقرار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ جس معاشرے کے اندر وہ رہتا ہے' اس کے قانون کا وہ خود بخود پابند ہے۔ جب پابند ہے تو سڑک پر اسی طرف چلنے کا وہ پابند ہے جس طرف قوانین میں چلنے کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح زندگی کی ٹریفک بھی ہے اور زندگی کی

سڑک بھی۔ اس کے لیے ہر چیز میں قول وقرار ضروری نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ اگر وہ گاڑی غلط رخ سے لائے گا تو یقیناً اس کا حادثہ ہوسکتا ہے۔ وہ اگر ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا یہ کہنا کہ "میں لاعلم تھا" اس کو جرمانے سے نہیں بچاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو مغفرت کا ہے۔ وہ لاعلمی کا عذر بھی قبول فرمائے گا لیکن عام طور پر زندگی کی شاہراہ پر اللہ کے قوانین کے تحت چلنا اس عہد میں شامل ہے۔ پھر زبانی قول وقرار کی پابندی لازمی ہے اور اس وعدے کے خلاف کرنا منافقت کی نشانی ہے۔

منافق کی تین نشانیاں اس حدیث کے اندر بیان کی گئیں (۱) ایک یہ کہ بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے (۳) عہد باندھے تو اس کو توڑ دے۔

یہ وعدہ جو آدمی زبانی قول وقرار کرکے کرتا ہے، یہ ہم عام زندگی میں بھی کرتے رہتے ہیں۔ گھروں کے اندر بھی ہم بے شمار وعدے کرتے ہیں۔ بچوں، بیوی، شوہر، بھائی بہنوں سے بھی بہت سے وعدے کرتے ہیں۔ کاروبار اور عام لین دین اور معاملات کے اندر بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کی پابندی ایمان کا تقاضا ہے اور وہ ضروری ہے۔ اور کسی چیز کی بھی خلاف ورزی منافقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

حضورؐ نبی بنائے جانے سے پہلے تجارتی قافلے لے کر جایا کرتے تھے۔ ایک صحابیؓ اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب آپؐ تجارتی قافلے لے کر جایا کرتے تھے' میں نے ایک چیز آپؐ سے خریدی اور خریدنے کے بعد میں نے کچھ قیمت آپ کو دی اور کہا' باقی قیمت آپؐ کو میں بعد میں لاکر دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں بھول گیا۔ تین دن کے بعد مجھے یاد آیا۔ میں گیا تو میں نے حضورؐ کو اسی مقام پر پایا۔ آپؐ تین دن سے میرا انتظار کررہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ تین دن انتظار کرایا۔

وعدے کی پابندی یہ ہے کہ آدمی اگر کہہ دے کہ میں آؤں گا تو وہ پہنچے۔ اور وقت کی پابندی یہ ہے کہ آدمی اگر کہہ دے کہ اس وقت آؤں گا تو اسی وقت پہنچے۔ وقت کی پابندی ہمارے معاشرے کے اندر ایک مفقود چیز ہے۔ یہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ کوئی کہہ دے کہ میں دس بجے آؤں گا تو یہ بھی کوئی وعدہ ہے اور یہ بات بھی وعدے کے اندر شامل ہے۔ دفاتر کے

اوقات اگر مقرر ہیں اور ایک آدمی دفتر سے پوری تنخواہ وصول کرتا ہے تو یہ اس کا وعدہ ہے کہ وقت پر پہنچے گا۔ اس کا یہ معاہدہ ہوتا ہے۔ وہ اس معاہدے پر دستخط بھی کرتا ہے۔ یہ اس کا Employment Contract ہے جس کے تحت وہ پابند ہے۔ وقت کی پابندی کو مسلمان معاشرے میں اس قدر ضائع کیا جا چکا ہے کہ آدمی اگر یہ کہے کہ کل آؤں گا یا پرسوں' تو اس کا یقین نہیں کیا جاتا کہ وہ وقت کی پابندی کرے گا۔ چار پانچ منٹ دیر ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بھی وعدے کے اندر شامل ہے۔ گھروں کے اندر ہم بچوں، بیوی اور رشتہ داروں سے جو وعدے کرتے ہیں، ان کو بھی ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

ایک اور واقعہ یہ بھی حدیث میں موجود ہے کہ ایک صحابیہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ میرے گھر تشریف فرما تھے۔ میں نے اپنے بچے سے کہا کہ ادھر آؤ، میں تمھیں ایک چیز دوں۔ یہ ہمارے ہاں بہت عام ہے کہ آؤ بچو ہم تمھیں چاکلیٹ لے دیں۔ بہلانے اور پھسلانے کے لیے یہ عام سی بات ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تمھاری نیت تو معلوم نہیں ہوتی دینے کی؟ یہ آپؐ نے اعتراض نہیں کیا بلکہ سوال کیا کہ کیا تم واقعی کچھ دو گی؟ انھوں نے کہا: ہاں، میں کچھ دوں گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر دینے کی تمھاری نیت نہ ہوتی تو یہ بھی تمھارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔ صحابہ کرامؓ یا رسولؐ کی زندگی سے وعدے کی پابندی ہم کو اس حد تک ملتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے جہاں اپنے انبیا کی تعریف کی ہے وہاں اس صفت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ سچے تھے۔ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم:۵۴)، ''وہ وعدے کا سچا تھا''۔ کئی انبیا کے بارے میں قرآن مجید نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ وہ وعدے کے سچے تھے۔ اس کے بعد شروع ہی میں سورۃ البقرۃ کے آغاز کے بعد سب سے پہلے اس نے تین ایسی صفات بیان کی ہیں جو اگر کسی کے اندر نہیں پائی جاتی ہیں تو وہ اللہ کی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل کیے گئے ہیں جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (البقرۃ:۲۷) ''اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔''

جن قرابت داریوں کو اللہ نے قائم کیا ہے' جو گھروں میں رشتے ہوتے ہیں' یہ بھی معاہدے ہیں' ان کو وہ کاٹتے ہیں۔ سورۃ الرعد میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ جو وعدے کی پابندی نہیں کرتے، اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں، بندگی، اطاعت، شریعت پر چلنے، ایمان کے تقاضے پورے کرنے کا عہد توڑتے ہیں' جس چیز کو جوڑنا اللہ نے لازم کیا ہے اس کو کاٹتے ہیں۔ پھر ان کی تعریف فرمائی جو اللہ سے اپنے وعدوں کی پابندی کرتے ہیں اور رشتوں کو جوڑتے ہیں۔ پھر اس کے بعد آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظاہری نماز اور ظاہری رسم ورواج اور ظاہری مذہبیت، یہ دراصل نیکی نہیں ہے۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (البقرۃ ۲:۱۷۷) ''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ'' ہاتھ باندھ لو، یہ نیکی نہیں ہے۔ یہ بات اس سیاق میں کہی جارہی ہے جہاں قبلے کی تبدیلی کا حکم ہوا تھا اور بڑی اہمیت کے ساتھ تین دفعہ حکم دیا گیا تھا کہ جہاں کہیں بھی ہو، جس حالت میں بھی ہو' نماز پڑھو تو حرم کی طرف رُخ کرو۔ لیکن ان سب احکامات کے بعد اگر کسی کے ذہن میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ دین تو بس یہی ہے اور نیکی تو بس یہ ہے کہ آدمی مراسم کو ادا کرے اور قبلے کی طرف منہ کرے' تو یاد رہے کہ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے نکاح، طلاق، حج، نماز اور سارے احکام اس کے بعد آئے۔ بات واضح کر دی گئی کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ انسان مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرے۔ پھر اس کی تعریف بیان کی کہ نیکی کیا ہے۔ نیکی کی تعریف میں، ایمان، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کے حکم کے بعد کہا: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ج (البقرۃ:۱۷۷) ''اور جو عہد بھی باندھتے ہیں، اس کو پورا کرتے ہیں''۔ اور پھر فرمایا: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ o (البقرۃ:۱۷۷) ''یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں''۔

مسلم کی روایت میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی جھوٹ بولے، وعدہ خلافی کرے' عہد کو توڑے، وہ اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ بھی رکھتا ہو اور حج بھی کرتا ہو اور اس نے عمرہ بھی کیا ہو، اور اپنے بارے میں اسے بڑا گمان ہو کہ میں تو بڑا اچھا مسلمان ہوں، اس کے باوجود یہ منافقت کی نشانی ہے۔

یہ بات قرآن مجید سے بالکل واضح ہے کہ دین کی جو عمارت تعمیر ہوتی ہے، اور صالح

زندگی بنتی ہے، وہ اس دنیا میں بھی کامرانی کی طرف لے جاتی ہے اور آخرت میں بھی اللہ کی رضا اور جنت کی مستحق بناتی ہے۔ یہ تین اخلاقی صفات اسی زندگی کی بنیاد ہیں۔ یہ صفات نماز، روزہ، زکوٰۃ اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یہ اخلاقی صفات پیدا نہ ہوں تو محض نماز، روزہ اور زکوٰۃ انسان کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس کے اندر یہ صفات ہونی چاہییں۔ اس کے بعد ہی وہ اللہ کا محبوب اور پیارا بن سکتا ہے۔ پھر فرمایا: ہر وعدے کے بارے میں سوال ہوگا اور زبان کے بارے میں، آنکھوں اور کان کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔ اسی طرح جو عہد باندھا ہے اس کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔

جو عوامی عہد ہوتے ہیں، قومیں ایک دوسرے سے کرتی ہیں، ان کی بھی تاکید کی گئی کہ ان کی بھی پابندی کرو۔ کفار اور مشرکین نے مسلمانوں سے بدعہدیاں بھی کیں، ان پر مظالم بھی ڈھائے، ان کو ہر قسم کی تکلیفیں بھی پہنچائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ مسلمان اپنی جگہ پر بدعہدی کریں۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد سخت ترین حالات پیش آئے۔ مسلمانوں نے اس بات کا وعدہ کرلیا کہ کوئی وہاں سے ہماری طرف آئے گا تو ہم اسے واپس کردیں گے۔ وہ آدمی جو اس معاہدے کے لیے گفت وشنید کر رہا تھا، اس کا بیٹا مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کو بیڑیوں سے باندھ کر رکھا ہوا تھا، اور اس پر تشدد بھی ہوتا تھا۔ اس وقت وہ نکل کے وہاں پہنچ گیا۔ اس شخص نے کہا: پہلے آپ یہی پابندی کیجیے کہ میرے اس بیٹے کو واپس کردیجیے۔ ان ۱۴۰۰ آدمیوں کے لیے جو مرنے مارنے کی بیعت کر چکے تھے اور عرب کی وہ روایات جن میں غیرت کا اور اپنے قبیلے کا بڑا نام اور مقام تھا، ان کے لیے بڑی ذلت کی بات تھی کہ اپنا آدمی آئے اور اس کو اس طریقے سے واپس کردیں۔ لیکن معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اسے واپس کردیا۔ پھر کچھ لوگ بھاگ کر مدینہ آئے اور مدینہ آنے کے بعد انھوں نے پناہ مانگی تو آپؐ نے پناہ دینے سے بھی انکار کردیا۔ اور فرمایا کہ نہیں، ہمارا معاہدہ ہے۔ لیکن آپؐ نے اشارہ کردیا کہ اگر یہ چاہیں تو ان کے لیے راہ نکل سکتی ہے۔ وہ جاکر اس تجارتی راستے پر بیٹھ گئے جس پر کفار کے تجارتی قافلے شام جایا کرتے تھے، اور ان پر حملے شروع کردیے۔ اب نہ وہ مدینہ کی اطاعت میں تھے اور نہ مکے کی اطاعت میں۔ اہل مکہ شکایت بھی نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ رسول اللہؐ نے انھیں مدینہ میں پناہ نہیں دی تھی۔

قوموں کے اندر جو معاہدے ہیں ان کی اس حد تک پابندی بھی ضروری ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ اگر تمھیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تمھیں بدعہدی کا حق نہیں۔ معاہدے کو توڑنے کا اعلان کر دو۔ اس کو ان کی طرف واپس پھیر دو تو اس کے بعد پھر تم اس عہد کی خلاف ورزی کر سکتے ہو۔ پھر جب سارے مشرکین سے اعلان برأت ہوا تو اس میں یہ استثنٰی کیا گیا کہ وہ لوگ جو اپنے عہد پر قائم رہے ان کے ساتھ تم بھی اپنے عہد کو قائم رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے: مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ○ (ال عمرٰن:۷۶) ''جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا' کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں''۔ تقویٰ بھی عہد کی پابندی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۷۷) ''یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں''۔ اللہ انھی سے پیار و محبت کرتا ہے جو زندگی میں ایفائے عہد اور تقویٰ کی روش پر قائم رہتے ہیں۔

زبانی قول و قرار ہو، اتنی چھوٹی سی بات ہو کہ میں کل اتنے بجے آؤں گا یا بہت بڑے بڑے معاہدے ہوں، گھر کی زندگی میں ہوں یا کاروبار میں' یا ریاست کے مناصب تک جاتے ہوں، جو وعدے بھی انسان کرے، ان سب کی پابندی، ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ لَا دِیْنَ، لِمَنْ لَّا عَھْدَ لَہٗ ۔ اگر عہد کی پابندی نہ ہو تو نہ بندگی کا اعتبار ہے اور نہ اللہ کے عطا کیے ہوئے ایمان کا۔ عہد کی خلاف ورزی کے ساتھ انسانی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر عہد کا قول و قرار نہ ہو تو تجارت، معیشت، حکومت کوئی چیز بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ جو کافر معاشرے ہیں ان کو بھی ایک حد تک پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اعتبار جاتا رہتا ہے۔ اگر یہ حالت ہو جائے کہ لوگ کہیں کہ فلاں فلاں آدمی اس بستی کے اندر ایسا ہے جو ایمان دار ہے اور اسی طرح عہد کے بارے میں بھی کہا جائے کہ اس بستی میں صرف دو ہی آدمی ہیں جو وعدے کی پابندی کرتے ہیں تو یہ خرابی کی نشانی ہے۔ اس لیے اپنی زندگیوں میں اس بات کا خیال رکھیے کہ جو بھی بات زبان سے نکل جائے، جو بھی آدمی وعدہ کرے، اس کی پابندی ضروری ہے۔

یہاں پر دو تین باتیں اور ذہن میں رکھنی چاہییں۔ اگر آدمی کوئی وعدہ کرے اور کوئی ایسی مجبوری ہو جائے جس کی وجہ سے وہ وعدہ پورا نہ کر سکے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ دوسری

بات یہ ہے کہ حدیث میں منافق کی تین نشانیاں بتائی گئی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جو آدمی جھوٹ بولے تو آپ فوراً جا کر اس کو کہیں کہ تو تو منافق ہو گیا' اور جو آدمی وعدہ خلافی کرے آپ اس پر منافق ہونے کا فتویٰ جاری کر دیں' اور جو اپنے عہد کو توڑے اس کو آپ منافق کہنا شروع کر دیں۔ اس لیے کہ منافقت کا کوئی کام کرنا اور منافق ہو جانا، اس میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اگر یہ فرق نہ ہو تو امت میں تفرقہ، انتشار اور فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ہر آدمی دوسرے کو منافق، کافر اور مشرک قرار دینے لگے تو اس طرح امت کی وحدت پارہ پارہ ہو سکتی ہے۔ یہ سوچنا کہ یہ کام منافقت کا کام ہے یا مشرک کا کام ہے' یہ اپنی جگہ' لیکن کسی کو کافر کہنا، مشرک قرار دینا، امت سے خارج کر دینا اور منافق قرار دینا' اس کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا قول یہ ہے کہ حضوؐر کے زمانے کے ساتھ منافق کا ہونا ختم ہو گیا۔ اب تو ہم لوگوں کے ظاہر پر معاملہ کریں گے یا مومن ہے یا کافر۔ اگر ظاہر میں مومن ہے تو مومن' ورنہ کافر ہے۔ منافقت کا تعلق دل سے ہے اور دل کے اندر کوئی جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ اس لیے انھوں نے فرمایا کہ منافقت کا فیصلہ اب کوئی نہیں کر سکتا۔

حضوؐر کے زمانے میں جو منافق تھے ان کے نام یا تو حضوؐر کو یاد تھے یا ایک صحابیؓ کو صیغۂ راز میں بتائے ہوئے تھے۔ معاشرے میں ان کو منافق کہہ کر نہیں پکارا جاتا تھا۔ البتہ ان کے کام منافقوں جیسے تھے۔

یہ احتیاط نہایت ضروری ہے۔ اس حدیث کو ہاتھ میں لے کر منافقت اور کفر کے فتوے جاری کرنے کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔

حقیقتِ زُہد

عَنْ اَبِي الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدِالسَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:
جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللّٰهِ دُلَّنِي عَلٰى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللّٰهُ ' وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ. فَقَالَ : " اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ ' وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ."

(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَغَيْرُهُ بِأَسَانِيْدَ حَسَنَةٍ)

"حضرت ابوالعباس سہل بن سعد الساعدیؓ سے روایت ہے' کہتے ہیں ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ مجھے کسی ایسے عمل کی طرف رہنمائی کیجیے کہ جب میں اسے سرانجام دوں تو اللہ مجھے چاہنے لگ جائے اور لوگ مجھے پیار کرنے لگ جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: مال و دولت اور دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ' اللہ تجھے چاہنے لگے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جاؤ لوگ تجھے پیار کریں گے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات انسان کے اخلاق اور سدھار اور اس کی پاکیزگی کے لیے ہیں۔ ایمان کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے دین کے جتنے بھی احکام ہیں' خواہ ان کا تعلق نفس سے ہو یا دوسرے انسانوں سے' ملک وقوم کے معاملات سے ہو یا مال سے' ان سب پر عمل کرنے کے لیے اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنے کے لیے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے' اپنے اندر ایک قوت اور استعداد کی ضرورت ہے۔

نبی کریمؐ نے ایک پہلو یہ بیان فرمایا ہے کہ آخرت کی تیاری کرو۔ اس کے ذریعے

اس امت کو پہلے بھی اصلاح اور غلبہ نصیب ہوا ہے۔ زندگی کی مہلت کو عمل کے لیے غنیمت جانو۔ جو فراغت میسر ہو، خواہ دولت مندی کی حالت ہو یا تنگ دستی کی، اس کو غنیمت جانو۔ انسان اپنا سارا زور عمل پر لگائے۔

نبی کریمؐ نے ایک دوسری چیز کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جو بہت اہم ہے اور اس کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ حضرت سہلؓ بن سعد الساعدی روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا، اے اللہ کے رسولؐ! مجھے آپؐ وہ عمل بتائیں جو میں کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ کو چاہیں۔ آپؐ نے فرمایا: دنیا کے معاملے میں زہد اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور ان چیزوں کے معاملے میں زہد اختیار کرو جو لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، لوگ تم سے محبت کریں گے۔

یہ روایت ابن ماجہ میں شامل کی گئی ہے۔ امام منذریؒ جنھوں نے ان احادیث کو جمع کیا ہے کہا ہے کہ نبوت کے انوار اور روشنیوں میں بڑی واضح روشنی اور نور اس حدیث کے اندر موجود ہے۔ آدمی خود بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرے اور اسے بھی اللہ کی محبت حاصل ہو، یہ ایمان اور زندگی کا بہت اہم مقصود ہے۔ ایمان لانے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ:۱۶۵) جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں بہت سے اعمال کے بارے میں بتایا ہے کہ مومنین یہ اور یہ اعمال کرنے والے ہیں۔ امت سے مخاطب ہو کر اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے ہمارا کام نہیں کیا، ہمارا راستہ اختیار نہیں کیا، ہم سے وفاداری نہیں برتی تو ہم تمھاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں گے اور تمھیں ذلیل و خوار کر دیں گے۔ مومنوں کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ:۵۴) اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے صحابہ کرامؓ کو ان کاموں کی تلاش تھی جن کو کرنے سے انھیں اللہ کی محبت حاصل ہو جائے۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ ایک صحابیؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ کوئی ایک ایسا عمل بتایئے ___ بہت طویل نصیحت کے نہیں بلکہ مختصر نصیحت کے طالب

تھے ___ کوئی ایک ایسی بات جس کے اندر اہم باتیں سمیٹ کر بیان کردی گئی ہوں، جس پر چلنے سے اللہ کی محبت حاصل ہو اور لوگ بھی محبت اور عزت و احترام کریں۔ یہ خواہش ایسی خواہش نہیں ہے جو اللہ اور رسولؐ کی نظر میں ناپسند ہو۔ یہ خواہش بہت شدید ہوتی ہے۔ چنانچہ آنے والے صحابیؓ نے آپؐ سے یہی سوال کیا کہ کوئی ایسا عمل بتائیں جس کی وجہ سے اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ: دنیا کے اندر زہد اختیار کرو۔

زہد اور زاہد کا لفظ بڑا معروف ہے۔ شاعری کے اندر بھی استعمال ہوتا ہے، طعن و تشنیع میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور کچھ لوگوں کو اچھا کہنے کے لیے، کچھ لوگوں کو برا بھلا کہنے کے لیے بھی۔ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ زہد کا مقام کوئی بہت اونچا اور باوقار اور بلند درجے کا اور صوفی لوگوں کا مقام ہے، عام آدمی کا نہیں ہے۔ عام آدمی دنیا کے اندر کاروبار میں، شادی بیاہ میں مصروف رہتا ہے، تجارت کرتا ہے، مکان بناتا ہے، اچھے کپڑے بنانا چاہتا ہے، غذاؤں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ زہد میں یہ سب کچھ چھوڑ دینے کی تلقین ہے اور یہ عام انسان کے بس میں نہیں ہے۔ یہ تو صرف انھی کے حصے میں آسکتا ہے جو یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دیں، اور کسی گوشے میں بیٹھ جائیں۔ عام طور پر لوگوں کے ذہن میں یہ زہد کی تعریف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور نبی کریمؐ نے اپنی تعلیمات میں ہر مسلمان سے جن خوبیوں کا مطالبہ کیا ہے، ان کو ایسی اہم اور خاص صفات سمجھ لیا گیا ہے، جو صرف اولیا اور اونچے درجے کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عام مسلمان سے ان کا مطالبہ نہیں ہے۔ زہد کی جو تعریف قرآن کریم نے بیان کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کسی نہ کسی درجے میں اس زہد کو حاصل کرسکتا ہے۔ ہر مومن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے اور لوگ بھی اس سے محبت کریں، اس لیے اس کا حاصل کرنا اس کے لیے ضروری بھی ہے۔

زہد کے معنیٰ کیا ہیں؟ زہد کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز سے انسان کو رغبت ہو، وہ اس کو لینا چاہتا ہو لیکن وہ اس کو کسی ایسی چیز کی خاطر چھوڑ دے جس سے اسے زیادہ محبت و رغبت ہو۔ ہوسکتا ہے کہ انسان ایک چیز سے کم درجے میں محبت رکھتا ہو اور دوسری چیز سے زیادہ درجے میں محبت رکھتا ہو اور دونوں کو وہ ساتھ لے کر چل سکے۔ لیکن جہاں پر دونوں کا تصادم ہوجائے تو

وہاں وہ اس چیز کو چھوڑ کر جس کی طرف وہ رغبت رکھتا ہے' پسند کرتا ہے' خواہش بھی ہے' اس چیز کو اختیار کرے جس سے وہ زیادہ محبت کرتا ہے۔ نبی کریمؐ نے اپنے ایک انتہائی محبوب صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ وہ صحابی ہیں جو دنیا کے اندر اپنی ضرورت سے زیادہ مال و دولت جمع کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ آدمی اپنی ضرورت پوری کر کے سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔

زہد اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی حلال چیزوں کو حرام کر دے۔ جو چیزیں اللہ نے فائدہ اٹھانے کے لیے پیدا کی ہیں ان کو آدمی اپنے اوپر حرام کر دے اور جو مال اس کے پاس آئے اس کو خرچ کر کے کچھ بچا کر نہ رکھے' بلکہ زہد تو اس چیز کا نام ہے کہ جو معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں ان پر ہمیں ان معاملات کے مقابلے میں زیادہ اعتماد اور بھروسا ہو جو لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر لوگوں کے ہاتھ میں ہماری تعریف ہے تو ہمیں اس تعریف پر زیادہ اعتماد ہو جو اس کے مقابلے میں اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر لوگوں کے پاس مال ہے جو ہمیں مل سکتا ہے تو ہمیں اس کے مقابلے میں وہ مال زیادہ محبوب ہو جو اللہ کے پاس ہے۔ لذتوں اور رغبتوں اور دنیا کو ترک کرنے کا نام زہد نہیں ہے' بلکہ زہد یہ ہے کہ جو رغبت بھی اللہ نے فطری طور پر آدمی کی طبیعت میں رکھی ہے' اسے وہ مقام دے جو اس کا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط (اٰل عمرٰن: ۱۴) لوگوں کے دل کے اندر خواہش رکھ دی گئی ہے عورتوں کے لیے' اولاد کے لیے اور سونے چاندی کے ڈھیروں کے لیے' کھیتی باڑی کے لیے اور تجارت کے لیے اور نشان زدہ عالیشان گھوڑوں کے لیے' آج کے دور میں نئے نئے ماڈل کی کاروں کے لیے۔

ان میں سے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اللہ نے حلال کی ہو اور اس کو حرام کرنے کا نام زہد ہے' بلکہ زہد تو اس چیز کا نام ہے کہ آدمی ان سے کم اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ رغبت رکھے' اور اگر ان دونوں کے درمیان تصادم ہو جائے تو اللہ کے پاس جو زندگی اور بخشش ہے' اس کی طرف متوجہ ہو اور اس کو ترجیح دے۔ یہ دراصل دل کی کیفیت اور حالت کا نام ہے۔ اگر دل اٹھی

چیزوں میں اٹک جائے' اور اس کو اس کی فکر نہ ہو کہ اللہ کے پاس کیا ہے اور کیا ملنے والا ہے تو یہ زہد کے منافی ہے۔ زاہد تو وہ ہے جو دنیا کے اندر رہتا ہے' دنیا کو برتتا ہے' دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کوئی چیز مل جائے' یا چھوٹ جائے اس کی اسے کوئی زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ وہی باتیں اللہ نے اپنے کلام پاک میں یوں بیان فرمائی ہیں۔ لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ط (الحدید: ۲۳) جو ہاتھ سے نکل جائیں ان کا تمھیں غم نہ ہو اور جو مل جائیں ان میں تم مگن نہ ہو جاؤ۔ یہ اصل مطالبہ ہے۔ یہ مطالبہ نہیں ہے کہ جو ملتا ہے' آدمی اس کا انکار کر دے' جو آتا ہے اس کو چھوڑ دے اور جو جاتا ہے اس کے رنج میں مبتلا رہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ زہد کا تعلق دولت سے نہیں ہے۔ ایک آدمی جس کے ہاتھ میں پانچ روپے ہوں لیکن اس کا دل مزید سو روپے کے اندر اٹکا ہوا ہو' تو وہ دنیا پرست ہے اور ایک آدمی جس کے پاس لاکھ روپے ہوں اور اس کے دل کے اندر اس کی کوئی وقعت نہ ہو' اسے خرچ کرنے کو تیار ہو اور اس کا دل مزید روپے کی طلب میں نہ اٹکا ہو کہ اللہ کی نافرمانی کر کے حاصل کرے' تو وہ آدمی مال رکھنے کے باوجود زاہد ہے۔ اسے دنیا کی بجائے اللہ سے رغبت ہے۔ اس گھر سے رغبت ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ ان نعمتوں کی تلاش ہے جو اللہ کی طرف سے ملنے والی ہیں۔ لیکن وہ آدمی جو قلیل مال رکھتا ہے لیکن اس کا دل دنیا کے اندر اٹکا ہوا ہے' وہ مال کی قلت کے باوجود دنیا کے پیچھے جا رہا ہے۔ جس آدمی کے پاس مال زیادہ ہے اور وہ اس کی پروا نہیں کرتا تو وہ اللہ کے ہاں زیادہ محبوب ہے۔

مال اللہ نے دیا ہے' اس کو سب کا سب خرچ کر ڈالنا بھی کوئی زہد کی علامت نہیں۔ اس لیے کہ مال اور دولت اللہ نے اسی لیے دیا ہے کہ آدمی اپنی ضروریات پوری کرے اور دنیا سے فائدہ اور لذت بھی حاصل کرے۔ لیکن اس کی وقعت اور حیثیت اس کے نزدیک ایسی نہ ہو کہ اس کی خاطر اللہ سے رغبت اور معاملے کو ترک کر دے۔

اسی طرح اگر اس پر کوئی مصیبت پڑنے والی ہے تو اس مصیبت سے بچنے کی تدبیر کرنا' بیمار ہو جائے تو علاج کرنا یہ بھی زہد کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بھی اللہ نے لازم کیا ہے کہ آدمی دنیا کے اندر رہے' اس کی تدبیر کرے' اسے سنوارے' دنیا کو بہتر بنائے' مال آئے تو اپنے

اوپر بھی خرچ کرے اور دوسروں پر بھی خرچ کرے اور اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرے۔ غریبوں' ناداروں' مسکینوں' حقداروں کو بھی دے۔ اسی طرح اگر مصیبت میں تکلیف محسوس کر رہا ہے تو یہ بھی زہد کے منافی نہیں ہے۔ لیکن اس کو اس مصیبت کے اندر بھی ثواب کی رغبت ہو جس کا وعدہ اللہ نے بار بار فرمایا ہے کہ مومن کو کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں۔ ہر مصیبت پر اللہ کے پاس اجر ہے۔ مصیبت سے آدمی کا بھاگنا بھی زہد کے خلاف نہیں ہے۔

ایک آدمی وہ ہوتا ہے جو لذتوں کے اندر منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کو ساری فکر اسی بات کی ہوتی ہے کہ وہ کھائے پیے' اچھا پہنے' اچھا رہے۔ اس کے علاوہ اس کو نہ اللہ کے بندوں کی فکر ہوتی ہے اور نہ اللہ کی راہ میں کچھ دینے کی فکر ہوتی ہے۔ یہ دنیا پرستی ہے۔ لیکن اگر لذتوں میں انہماک نہ ہو اور آدمی اس چیز پر جو مل جائے اللہ کا شکر کر کے فائدہ اٹھالے اور جو نہ ملے اس کا افسوس نہ ہو' نفس کو آرام بھی دے اور اس سے کام بھی وہ لے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور جو اللہ پسند کرتا ہے تو یہ دنیا پرستی نہیں ہے۔

یہ ساری چیزیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ زہد کا وہ تصور جو عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے کہ زاہد تو دراصل تارک دنیا ہوتا ہے' ایسا نہیں ہے۔ نہیں' زاہد تو وہ ہوتا ہے جو اللہ سے تعلق اور محبت کو ہر محبت پر غالب کر دے اور اس کا طالب ہو جائے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کہتے ہیں کہ جب آدمی کے لیے یہ بات برابر ہو جائے کہ وہ ایک عالیشان زندگی بسر کر رہا ہے یا فقر کی زندگی بسر کر رہا ہے' وہ بہت اچھے کھانے کھا رہا ہے یا روٹی چٹنی کھاتا ہے' کوٹھی میں رہتا ہے یا چھوٹے مکان میں' اس کو اس سے فرق نہ پڑے بلکہ وہ ان دونوں حالتوں کو اللہ کی طرف سے قبول کرے۔ نعمتیں خدا نے دی ہیں' نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔ اچھے کھانے آئیں' وہ بھی خدا کے عطا کردہ ہیں' حلال ہیں' اس کو اس نے حرام نہیں کیا ہے' ان سے لطف اندوز ہو۔ گویا ہر حال میں اس کی نظر خدا کے فضل و کرم اور اس کی خوشنودی کے حصول پر رہے' نعمتوں کے آنے یا چھن جانے پر اسے کوئی ملال نہ ہو تو وہ زاہد ہے' اور زہد و تقویٰ کی راہ پر ہے۔

یہی طریقہ نبی کریمؐ کا تھا۔ اگرچہ آپؐ نے بہت سادگی سے زندگی بسر کی لیکن اچھے کھانے آئے تو آپؐ نے رغبت کے ساتھ کھائے۔ آپ کو اچھے کھانے محبوب بھی تھے' آپؐ نے اس کا ذکر بھی فرمایا۔ آپؐ نے لباس پیوند لگا ہوا بھی پہنا اور قیمتی بھی پہنا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں خوارج نے حضرت علیؓ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ ان سے کچھ گفتگو کرنے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ حضرت علیؓ کے خلاف کفر کا فتویٰ دے رہے تھے' ان کے چہرے عبادت سے سیاہ پڑ رہے تھے' آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہیں' اور پیشانی پر سجدے کے نشان ہیں اور ایڑیوں پر بھی نماز کے نشان ہیں۔ نماز اور قرآن پڑھتے ہیں اور حضرت علیؓ پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ خود ان کے بدن کے اوپر یمن کی ایک بیش قیمت چادر تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے یہی کہا کہ دین کی بات کہنے آئے ہو اور لباس اتنا قیمتی پہنا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ میں نے تو نبی کریمؐ کو اس سے بھی اچھا لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ آپؐ کے پاس مصر سے' یمن سے تحائف آتے' اچھا لباس آیا تو آپؐ نے اس کو بھی زیب تن کیا' اور اگر پیوند لگا ہوا لباس آیا تو اس کو بھی پہنا۔

ہمارے بڑے بڑے علما کا یہی طریقہ رہا ہے کہ جو ملتا تھا اس کو اسی طرح استعمال کرتے تھے بلکہ دین کے معاملات میں خصوصی لحاظ کرتے تھے۔ امام مالک بن انسؒ جنھوں نے حدیث کی کتاب موطا مرتب کی ہے اور جو ان چار فقہا میں سے ہیں جن کی اتباع مسلمان بالعموم کرتے ہیں' جب مسجد نبویؐ میں آتے تھے تو ساری مسجد خوشبو سے مہک جاتی تھی۔ چونکہ حدیث کا درس ہوتا تھا' اس لیے بڑی عالیشان مسند پر بیٹھا کرتے تھے اور لباس بھی اس زمانے کے حساب سے ایک ایک ہزار درہم کا پہنتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کا شکر واجب ہے' اور دوسرے اس حدیث کا مقام ہے جس کی عزت کی جاتی ہے۔ حدیث بیان کرتے تھے کہ زہد اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی لذتوں کو ترک کردے' اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کردے' سب مال ضائع کردے' بے مصرف خرچ کر ڈالے' اپنے پاس بچا کر نہ رکھے' دوسروں سے مانگتا پھرے' بیوی' بچے فاقے کریں اور وہ باہر لٹاتا پھرے' بلکہ زہد تو

اس کا نام ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کو صبر اور شکر سے قبول کرے، کم ہو یا زیادہ اس سے کوئی فرق نہ پڑے، اور رغبت صرف اجر سے ہو۔

جب اللہ سے ملنے والے اجر کی قدر و قیمت کا احساس ہو تو نظر میں دنیا کی وقعت نہیں رہتی۔ دنیا تو اسے پھر بھی ملتی ہے لیکن دنیا کی وقعت نگاہوں سے نکل جاتی ہے۔ دنیا کی وقعت نگاہوں سے نکل جائے تو آدمی اس کو ہر طرح برتتا ہے لیکن اس کا غلام نہیں بنتا، اس کے پیچھے نہیں پڑتا۔ آدمی جو چیز اللہ کی محبت میں چھوڑ رہا ہو، اس سے محبت اور تعلق بھی ہو۔ آدمی سڑک پر پڑے ہوئے پتھر کو اللہ کی خاطر چھوڑ دے، یہ زہد نہیں ہے۔ آدمی کے پاس کچھ نہیں ہے اور دل میں خواہش اس کی ہے جو نہیں ہے، اور کہے کہ میں اللہ کی راہ میں زہد کر رہا ہوں، مجھے تو پروا نہیں ہے تو یہ بھی زہد نہیں ہے۔ اور زہد وہ بھی ہوتا ہے جو مال سے اور لوگوں کی مدد کرنے سے ہوتا ہے۔ آدمی جب اپنے دل کو اس طریقے سے اللہ کی طرف راغب کرے تو پھر اس کو اللہ کی محبت نصیب ہوتی ہے۔

اس کے اندر کوئی بڑی مشقت نہیں ہے جو آدمی کو برداشت کرنا پڑے لیکن اپنی حالت اور کیفیت بدلنے کی ضرورت ہے جس کا اثر پورے اعمال اور رویے پر پڑتا ہے۔ صحابہ کرامؓ دنیا کو استعمال کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ حکومتیں انھوں نے کیں، سلطنتیں انھوں نے فتح کیں، لیکن وہ دنیا میں سب سے زیادہ اللہ کے سائے میں تھے۔ ان کو دنیوی چیزوں سے رغبت نہیں تھی بلکہ رغبت اس سے تھی جو اللہ کے پاس تھا۔

اس حدیث میں دوسرا سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جس سے لوگوں کی محبت بھی حاصل ہو؟ آپؐ نے فرمایا تھا کہ لوگوں کے ہاتھ میں جو چیزیں ہیں، ان سے بھی رغبت کم کرو۔ جو کچھ لوگوں کے پاس ہوتا ہے، اسی پر جھگڑے ہوتے ہیں اور لوگوں سے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ اگر آدمی کو اس سے رغبت نہ ہو تو لوگوں کی تعریف اسے حاصل ہو جائے گی۔ پھر لوگ اس سے تعلق رکھیں گے، وہ لوگوں سے بے نیاز ہو جائے گا۔ آدمی لوگوں سے امیدیں رکھتا ہے، پوری نہ ہوں تو پھر تعلقات خراب ہوتے ہیں، زبان سے باتیں بھی نکل جاتی ہیں اور عزت اور مقام گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ جو معاملات لوگوں کے ہاتھ میں ہیں ان کے بارے میں بھی

بے رغبتی اختیار کرو۔ اس کے مقابلے میں جو اللہ کے پاس ہے اس کی رغبت کرو۔

اس کا نسخہ علاج بھی وہی ہے جو اللہ نے زہد کے بارے میں بتایا ہے۔ جب تک دنیا مقصود ہو' اس وقت تک آدمی لوگوں سے امیدیں رکھتا ہے' جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس کو لینے کے لیے لپکتا ہے۔ ان کے منہ سے اپنی تعریف سننا چاہتا ہے۔ نہیں سنتا ہے تو دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں دنیا میں اس کی عزت اور تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ جو چیزیں ہمیں مطلوب ہیں' یہ ان کو چھوڑنے کو تیار ہے' تو اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں محبت بڑھتی ہے۔ زہد کا ماحصل تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کے پاس ہے' وہی آدمی کو زیادہ عزیز ہو' اسی پر زیادہ اعتماد اور طلب ہو اور لوگوں کے پاس جو مال اور اشیاء ہیں ان کی طلب نہ ہو۔ لوگ جو کچھ دے سکتے ہیں دنیا میں دے سکتے ہیں' اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔ جو اللہ دے سکتا ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر تمام تعلیمات اور شریعت پر عمل کرنا آدمی کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس کے اندر اس کے لیے قدرت اور استطاعت پیدا ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ شروع میں امت کی اصلاح انھی دو چیزوں سے ہوئی ہے: ایک یقین کہ جو بھی اللہ نے وعدے کیے ہیں وہ صحیح ہیں۔ دوسرے زہد' یعنی دنیا کے مقابلے میں اس سے زیادہ رغبت جو اللہ کے پاس ہے۔ آپؐ نے مزید فرمایا: اس امت کے اندر جب فساد پیدا ہوگا تو وہ دو چیزوں سے پیدا ہوگا۔ پہلی کنجوسی' مال کی محبت' آدمی اسے سینت سینت کر جمع کر کے گن گن کے تجوریوں میں رکھے۔ اِس سے اسے' اس کے مقابلے میں جو کچھ اللہ کے پاس ہے' رغبت زیادہ ہو۔ دوسری' امید اتنی لمبی باندھے کہ جس کے کل ہونے یا نہ ہونے کا بھروسا نہیں ہے' اس امید پر آئندہ دس بیس برس بعد تک کے منصوبے بنائے۔ اس کی امیدیں باندھے کہ یہ مجھے مل جائے گا' اس لیے میں کام کروں گا۔

لہٰذا زہد کا روایتی تصور کہ وہی زاہد ہے جو دنیا سے کٹ کر رہ جائے' خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے قصداً منہ موڑ لے' فائدہ نہ اٹھائے' جو کچھ اللہ نے اسے دیا ہے اس کا اظہار نہ کرے' صحیح نہیں ہے۔ زہد یہ ہے کہ انسان کی نظر جو کچھ اس کے پاس ہے' اس سے زیادہ اس پر ہو جو کچھ خدا

کے پاس ہے یا اس سے ملنے والا ہے اور دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز ہو جائے۔ دنیا کی نعمتیں مل جائیں یا اس سے چھن جائیں اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ اس کی نظر خدا کے اجر پر ہوتی ہے۔ یہی نبی کریم کا طریقہ تھا۔ آپؐ نے اگرچہ سادہ زندگی بسر کی لیکن خدا کی عطا کردہ بہترین نعمتوں سے بھی استفادہ فرمایا۔ خدا کے اجر پر نظر ہو تو دنیا بے وقعت ہو جاتی ہے۔ اس زہد کے حصول کے لیے کچھ زیادہ مشقت کی نہیں' صرف دل کی کیفیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں زندگی گزارنے کا یہی درست رویہ ہے اور اللہ اور دنیا والوں کی نگاہ میں عزت و سربلندی کا راستہ بھی یہی ہے۔

صبر اور شکر

وَعَنْ اَبِیْ یَحْیٰی صُهَیْبِ بْنِ سِنَانٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ کُلَّهٗ لَهٗ خَیْرٌ۔ وَلَیْسَ ذٰلِکَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ۔ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَکَرَ فَکَانَ خَیْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَکَانَ خَیْرًا لَّهٗ۔

(مسلم)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس کا سارا معاملہ بھلائی کا معاملہ ہے۔ اور یہ صورت حال سوائے مومن کے کسی کے بھی حصہ میں نہیں آتی۔ اگر اسے کوئی فراخی یا آسانی میسر ہے تو وہ شکر کرتا ہے' اور یہ اس کے لیے خیر کا معاملہ ہوتا ہے' اور اگر کوئی مصیبت یا تنگی آپڑتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے' اور یہ بھی اس کے لیے بہتری اور خیر کا معاملہ ہوتا ہے۔"

یہ حدیث جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا' حضرت صہیبؓ نے روایت کی ہے۔ مسلم اور مسند احمد بن حنبلؒ کے اندر یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس کا سارا معاملہ بھلائی کا معاملہ ہے۔ اور یہ صورت حال سوائے مومن کے کسی کے بھی حصہ میں نہیں آتی۔ اگر اسے کوئی فراخی یا آسانی میسر ہے تو وہ شکر کرتا ہے' اور یہ اس کے لیے خیر کا معاملہ ہوتا ہے' اور اگر کوئی مصیبت یا تنگی آپڑتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے' اور یہ بھی اس کے لیے بہتری اور خیر کا معاملہ ہوتا ہے"۔

دوسری جگہ جہاں حدیث نقل کی گئی ہے' وہ اس بات سے شروع ہوتی ہے کہ جو مرد مومن ہو وہ کیا ہی خوب آدمی ہے۔ اس کے بعد پھر یہ الفاظ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی اچھائی' فراخی' کوئی آسانی' کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ اس پر شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بڑی بھلائی کا سبب ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی تکلیف یا مصیبت پڑتی ہے تو اس پر وہ صبر کرتا ہے اور یہ معاملہ بھی اس کے لیے بڑی بھلائی اور خیر کا معاملہ ہوتا ہے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کی اس بنیاد کا ایک حصہ بتایا گیا ہے جس کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور آپؐ کی تعلیمات کے مطابق سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش ہم سب کو کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی بندگی اس طرح کریں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور اللہ کی بندگی کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات پر یقین رکھیں کہ اس دنیا کے اندر سارے اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جو کچھ بھی انسان کو ملتا ہے یا اس سے روک لیا جاتا ہے' جو اس کو اچھائی پہنچتی ہے یا بھلائی پہنچتی ہے' یہ سب اللہ کے حکم' اس کی مشیت اور اس کی اجازت سے ہوتی ہے۔ اسی لیے اس بات کی تعلیم دی گئی کہ جو کچھ مانگنا ہے' اللہ سے مانگو' جو سوال کرنا ہے' اس سے کرو' اور جو مدد طلب کرنی ہے اس۔ سے طلب کرو۔ اس لیے کہ ساری مخلوق' اور مخلوق کے معنیٰ ہیں کہ خالق کے علاوہ ہر چیز' اگر سب مل کر بھی تمھیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو اس سے زیادہ نفع نہیں پہنچا سکتے جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے اور نقصان پہنچانا چاہیں تو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ حدیث کے اندر بھی اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت' اس کا حکم' اس کا ارادہ' وہی سب سے غالب امر اور سب سے زیادہ کارفرما قوت ہے۔

یہ حدیث بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ تم سب بھوکے ہو' اور میں تم کو کھانا کھلاتا ہوں' تم سب پیاسے ہو اور میں تم کو پانی پلاتا ہوں' تم سب بے لباس ہو اور میں تم کو لباس پہناتا ہوں۔ تم سب خطائیں کرتے ہو اور میں تم کو معاف کرتا ہوں۔ کھانا مجھ سے مانگو' پینا مجھ سے

طلب کرو، لباس مجھ سے مانگو، غلطیاں کرو تو بخشش و مغفرت مجھ سے طلب کرو۔ اور تم اگر سب کچھ بھی مانگ لو، ساری کی ساری مخلوق جمع ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ مانگ سکتی ہے وہ مانگ لے، تب بھی میری مملکت اور خزانوں کے اندر اس سے زیادہ کمی نہیں ہوتی کہ ایک مچھر اپنا ایک پر پانی میں ڈال کر نکال لے یا کوئی سوئی کسی عظیم الشان سمندر میں ڈبو کر نکال لی جائے، یعنی کوئی بھی کمی نہیں ہوگی۔ میرے کام تو ایسے ہیں کہ میں کہتا ہوں "کُــنْ" تو وہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے کسی مادی وسائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

پھر اس بات کا حکم ہے کہ سب سے بڑھ کر محبت اللہ کی ہو اور اطاعت اسی کی ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسی تعلق کے دو پہلو صبر اور شکر کے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو ہم کو دنیا کے اندر جو حالات بھی پیش آتے ہیں، وہ ان دو میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں ہوتے۔ دو ہی قسم کے معاملات پیش آتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم کو پسند آئیں، جن سے ہم کو کچھ ملے، جن سے ہم خوش ہوں، جن سے کہ ہم کو فراخی اور وسعت نصیب ہو۔ دوسرے وہ معاملات جو ہم کو ناگوار ہوں، جو ہمارے لیے ناپسندیدہ ہوں، جن سے ہم کو کوئی تکلیف پہنچے۔ کوئی بھی زندگی کا معاملہ ان دو حالات سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کا کوئی معاملہ بھی خیر سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر وہ معاملہ پیش ہو جو اسے پسند آئے، جس میں اسے کچھ نصیب ہوتا ہے، کچھ ملتا ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک راستہ ایسا رکھا ہوا ہے کہ وہ بڑا اجر اور ثواب حاصل کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے اور دنیا و آخرت کی بڑی نعمتیں سمیٹ سکتا ہے۔ اور اگر کوئی مشکل پڑے یا کوئی مصیبت پڑے، کوئی تنگی پیش آئے تو یہ معاملہ بھی اس کا خیر اور بھلائی سے خالی نہیں ہوتا۔ اس میں اگر وہ صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب اجر و ثواب سمیٹتا ہے اور اس کے خزانے اس کو بخشے جاتے ہیں۔

مومن کا تو سارا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ وہ سارا کا سارا بھلائی کا اور خیر کا معاملہ ہے۔
شکر اور صبر، یہ ذہن کی، عمل کی اور دل کی دو کیفیات ہیں۔ یہ بڑی اہم باتیں ہیں اور ان کو سمجھنا

بہت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں ان کو اختیار کر لیں تو ہماری زندگی ان بے شمار مصائب و آلام اور مشکلات سے پاک ہو سکتی ہے جس کا وہ شکار ہے۔

شکر کے معنوں میں سب سے پہلے یہ احساس ہے کہ جو کچھ بھی ملنا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنا ہے۔ منعم وہ ہے۔ ہر چیز اس کی عطا کی ہوئی ہے۔ جس سے مل رہا ہے اس کے آگے شکر گزاری کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اس کا زبان سے اظہار ہو اور اس کی نعمت کا اس طرح استعمال ہو جو اس کی پسند کے مطابق ہو۔ یہ تین باتیں شکر کے اندر شامل ہیں۔

سارے دین کی بنیاد یہی شکر ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کا آغاز حمد کے کلمے سے کیا۔ فرمایا کہ "الحمد للہ" کا کلمہ تو ایسا ہے کہ ساری میزان کو بھر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شکر کا تعلق پوری زندگی میں قائم ہونا چاہیے۔ یہ تعلق ایک زندہ اور متحرک تعلق ہے' ایک ہمہ وقتی تعلق ہے۔ یہ اس لیے کہ زندگی کا کوئی لحہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ جب آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات نہ ہو رہے ہوں۔ یہ سانس بھی جو ہر لحہ اندر جاتا اور آتا ہے' اللہ کا انعام ہے۔ اس نے جسم کے اندر وہ مشین رکھی ہے جو باہر سے سانس لے سکے اور اندر خون صاف کر کے گندی سانس باہر پھینک سکے۔ اگر وہ صحیح کام کر رہی ہے تو یہ اس کا انعام ہے۔ اگر اس نے بغیر مانگے چاروں طرف ہوا کا نظام پیدا کر دیا ہے جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے تو یہ اس کا انعام ہے۔ اگر آپ غور کریں تو ہر سانس جو اندر جاتا ہے اور ہر سانس جو باہر آتا ہے اس سے آدمی پر شکر کی کیفیت' شکر کا اظہار' شکر کا جذبہ اور شکر کا عمل واجب ہو جاتا ہے۔ سانس زندگی میں کسی وقت بھی نہیں رکتا' اس لیے کہ اگر سانس رک جائے تو زندگی ختم ہو جائے۔

اس کے علاوہ بھی اس کی بے شمار نعمتیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اس نے ان کے بارے میں خود فرمایا ہے" وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط (ابراہیم: ۳۴)" اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بے شمار نعمتیں کسی نہ کسی حال میں ہم کو پہنچتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ نعمتیں اتنی عام ہوتی ہیں کہ ان کا شعور اور احساس ختم ہو جاتا ہے۔ جو چیز ہر لحہ مل رہی ہو' بغیر مانگے مل رہی ہو' بغیر کوشش کے مل رہی ہو' بغیر سوال کے مل رہی ہو' تو

بالآخر یہ احساس دل سے رخصت ہو جاتا ہے کہ یہ بھی کوئی بہت بڑی نعمت ہے جو ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک چیز بھی آدمی سے چھن جائے تو پھر وہ جس طرح اس کے لیے روتا ہے' گڑگڑاتا ہے' جزع وفزع کرتا ہے' اپنی مصیبت پر شکوے کرتا ہے' وہ اس بات کو بتانے کے لیے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کتنی بڑی نعمت ہے۔ آنکھ میں اگر کھٹک پیدا ہو جائے تو آدمی کو چین نہیں آتا' جسم میں کہیں درد ہو جائے تو آدمی کبھی اِس کروٹ لیٹتا ہے کبھی اُس کروٹ لیٹتا ہے' اسے چین نہیں ملتا۔ کان میں خرابی پیدا ہو جائے تو بھی یہی حال ہوتا ہے' غذا کا وہ سلسلہ جو جاری ہے' رک جائے تو نعمتوں کی قدر ہوتی ہے۔ قحط پڑ جائے' سیلاب آ جائے تو ہر کسی کو اللہ کی یاد آ جاتی ہے۔ اسی طرح دن اور رات کا نظام چل رہا ہے' اس کے فوائد شمار نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ رات ہی رہے دن نہ ہو' یا دن ہی رہے رات نہ آئے' تب دن رات کی قدر ہوگی۔ چونکہ یہ ساری چیزیں عام ہیں اور بغیر مانگے ملتی ہیں' صبح شام ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں' اس لیے ان کے نعمت ہونے کا احساس رخصت ہو جاتا ہے۔

پھر وہ نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ خاص طور پر عنایت کرتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب بندوں پر اپنی نعمتوں کا احسان جتایا ہے اور شمار کرایا ہے لیکن ہم میں سے جو آدمی بھی آنکھیں بند کر کے' پیدائش سے لے کر اب تک کی اپنی زندگی پر غور کرے گا تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے۔ وہ دیکھے گا کہ پیدائش سے لے کر اب تک کی زندگی جو گزری ہے اس میں بے شمار نعمتیں ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اسے عنایت کی ہیں۔ ہر شخص اپنے اوپر ان ذاتی احسانات کا احساس رکھتا ہے، جو آدمی اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شعور رکھے گا' تو ہر لمحہ اس کا شکر ادا کرے گا۔

اس حدیث میں ایک اور خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ مومن کو جب بھی کوئی کشادگی نصیب ہوتی ہے اور خوشی کا معاملہ ہوتا ہے' تو وہ اس پر شکر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اتراتا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ میرے دست و بازو کی کمائی ہے' یہ میری تقدیر میں لکھا ہوا ہے' میں نے اپنی تدبیر سے یہ گرہ سلجھائی ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مجھے معلوم تھا کہ اس میں اس طرح نفع ہوگا'

اس لیے مجھے یہ نفع ہوا ہے۔ میں نے اس وقت یہ پلاٹ خرید لیا تھا' کاروبار میں روپیہ لگا دیا تھا' مجھے اس وقت اپنے مرض کا پتہ لگ گیا' میں ڈاکٹر کے پاس چلا گیا' ڈاکٹر نے دوا دے دی۔ ایک حقیقی مومن ان کے مادی اسباب تلاش نہیں کرتا بلکہ وہ اس بات کو جانتا ہے کہ جو بھی نعمت پہنچتی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتی ہے۔ وہ اس کے اوپر شکر کی روش اختیار کرتا ہے۔

لہٰذا شکر کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس کا دل اس جذبے سے بھر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا ہاتھ ہر وقت اس کو سہارا دیتا ہے' اس کو سنبھالتا ہے' اس کو ہر چیز پہنچاتا ہے۔

شکر کا اظہار زبان سے بھی ہوتا ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے' لیٹتے اللہ کی حمد کرتا ہے اور تعریف کرتا ہے اور اس کے بعد اس کا عمل بھی شکر کے مطابق ہوتا ہے۔ شکر صرف اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی دل میں شکر کا اقرار کرلے' شکر اس کا بھی نام نہیں ہے کہ زبان سے کہہ دے کہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں' بلکہ فرمایا کہ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ''داؤد کے گھرانے والوں کا شکر کا عمل کرو۔'' تمھارا عمل بھی اس بات پر گواہ ہو کہ یہ نعمت خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے۔ وہ اس کی مرضی کے خلاف' اس کے حکم کے خلاف استعمال نہ ہو۔ اس کی مرضی کے مطابق اور اس کے حکم کے مطابق استعمال ہو۔ اس کی نعمتیں ان طریقوں سے حاصل نہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیے ہیں اور جو اس کو ناپسند ہیں۔

بہت کم لوگ ہیں جو فی الواقع اللہ کے شکر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ (سبا : ۱۳) ''میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں''۔ میرے بندوں میں تھوڑے لوگ ہیں جو اس بات کو محسوس کرتے ہیں' مجھ ہی کو اپنا منعم اور دینے والا سمجھتے ہیں' اور میرے ہی آگے شکر کے ساتھ سر بسجود ہوتے ہیں اور شکر کی زندگی بھی گزارتے ہیں۔ ان کے دلوں میں شکر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ شکر کا عمل بھی اختیار کرتے ہیں۔ شکر کی روش زندگی کے لیے سہولت' اور دل کے لیے سکون اور چین ہے۔ ایسی روش اختیار کرنے والے کا ہر لمحہ خوشی میں گزرتا ہے اور کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ پریشانیوں کا شکار ہو جائے۔ آپ خود ہی سوچیں کہ

جو سمجھ رہا ہو کہ صبح شام اللہ کے خزانے میرے گھر پر برس رہے ہیں، صبح شام اللہ کی نعمتوں کی بارشیں ہو رہی ہیں، ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے، خواہ وہ رشتہ داریاں ہوں، قرابتیں ہوں، تجارت ہو، کاروبار ہو، صحت ہو، مرض کے بعد شفایابی ہو، ایسے آدمی کے لیے ہر حال میں اطمینان و خوشی کا، اور سکون کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ دل کے لیے بھی سکون کا سرچشمہ ہے، تعلقات کے لیے بھی سکون کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح ساری زندگی اطمینان اور سکون سے بھر جاتی ہے۔

پھر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی کو ناگوار اور ناپسندیدہ حالت پیش آئے، اس کو مصیبت پہنچے تو وہ صبر کا راستہ اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے صبر کے اندر بھی بے پناہ اجر رکھ دیا ہے۔ یہ مومن کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ صبر کے معنی روکنے کے ہیں۔ صبر کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ آدمی رونا دھونا نہ کرے، بلکہ اس کے معنی ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو ہر اس چیز سے روک لے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ مصیبتوں کے موقع پر رونا دھونا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، اور یہ سمجھنا کہ مصیبتیں کہیں اور سے آ گئی ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ آدمی رونا دھونا نہ کرے، چیخنا چلانا نہ کرے، بلکہ اس کو من جانب اللہ سمجھ کر صبر کا راستہ اختیار کرے۔

آپ غور کریں تو دو قسم کے حالات میں صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک یہ کہ آدمی پر ایسی مصیبت پڑے جو اس کے بس میں نہ ہو۔ کسی کی موت ہو جائے، کوئی بچہ اللہ تعالیٰ واپس لے لیں، چاہنے والا رخصت ہو جائے، کوئی مرض ہو جائے، کوئی مال کا نقصان ہو جائے، جسم کے کسی حصے پر چوٹ پڑ جائے اور اس کا نقصان ہو جائے۔ یہ چیزیں آدمی کے اختیار میں نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ اس کے آزمائش اور تربیت کے قانون کے تحت یہ صورتیں پیش آتی ہیں۔

یہ مسئلہ ہمیشہ انسان کو پریشان کرتا رہا ہے کہ زندگی کے اندر یہ رنج، غم اور پریشانی کیوں ہے؟ عام طور پر اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا ملتا ہے؟ کیا اللہ کی قدرت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ ان آزمائشوں کو ہم سے دور فرما دیتا، یا ہم پر یہ نہ آتیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی ہے کہ کسی مخلوق کے لیے یہ سوال

کہ خالق کو کیا ملتا ہے' اس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس لیے کہ خالق کو ملنے اور نہ ملنے کا سوال مخلوق اپنے اوپر قیاس کر کے کرتی ہے۔ ہم معاملات کے بارے میں یوں سوچتے ہیں کہ اس سے ہمیں کیا نفع ہوا اور کیا نقصان ہوا؟ کیا ملا اور کیا چھن گیا؟ لیکن خالق ان چیزوں سے بالکل ماورا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ خالق کے لیے مخلوق سوچے۔ مخلوق کی سوچ اور فکر محدود ہے اور خالق کی ذات لامحدود ہے' آدمی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو یہ سوال کرنے کے بجائے کہ بندوں کو تکلیف پہنچا کر اس کو کیا ملتا ہے' سوال تو یہ کرنا چاہیے کہ ہمیں کیا ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون بیان فرما دیا ہے کہ نعمتیں ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی رنج وغم اور آلام و مصائب ہمیشہ کے لیے ہوتے ہیں۔ وقت کا دریا بہتا رہتا ہے۔ مصیبت آدمی کو ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ بالآخر موت ساری مصیبتوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اور نہ کوئی نعمت ایسی ہے کہ آدمی ہمیشہ کے لیے اس کو پکڑ کر بیٹھ جائے۔ یہ تو اس لیے ہے کہ تم کو آزمائے کہ تم میں کون زیادہ نیک عمل کرنے والا ہے۔ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ۲) اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے تمھاری پرورش کرے' تمھاری تربیت کرے' تمھیں آزمائے اور تم بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرو۔ یہ چند لمحات کی زندگی جو تمھیں ملی ہے' باقی رہنے والی نہیں ہے۔ جو نعمتیں تم کو ملی ہیں' یہ بھی ختم ہونے والی ہیں۔ جو رنج وغم اور الم پہنچتا ہے' یہ بھی مٹ جانے والا ہے۔

دنیا کے اندر وقت بہت سارے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اور بالآخر ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ ساری چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن جو صبر کا راستہ اختیار کریں ان کے لیے ہم نے بے حساب اجر تیار کر رکھا ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ''جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہ جانے والا ہے۔'' پھر فرمایا کہ رنج' غم' مصیبت کے بارے میں یہ سوال اٹھانا بے معنی بات ہے۔ اس لیے کہ اس میں سے ہر چیز عارضی ہے' صرف اس لیے ہے کہ ہم تمھیں آزمائیں اور تمھاری تربیت کریں۔ تمھیں خوشی پہنچے تو تم شکر کی روش اختیار کرو اور غم پہنچے تو صبر کی روش اختیار کرو۔ اور یہ اس لیے ہے کہ تم حسن عمل کا راستہ اختیار کرو۔

اگر کوئی مصیبت نہ آئے تو انسان بالکل خود سر' بے مہار اور بے لگام ہو جائے۔ نعمتوں کے بارے میں یہ شعور نہ ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہیں تو بھی آدمی کے کوئی لگام نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صحیح راستے پر رکھنے کے لیے ان دو چیزوں سے گھیر دیا ہے۔ نعمتیں بھی دیتا ہے' اور مصیبتیں بھی ڈالتا ہے۔ نعمتوں پر آدمی شکر کی روش اختیار کرے تو بے انتہا اور دیتا ہے۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان کی روش اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ تو خود صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے: إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ اللہ صبر کا بے حساب اجر دیتا ہے۔ دراصل صبر اور شکر وہ راستے ہیں' جن کے اوپر آدمی کا دل' اس کا دماغ' اس کا ذہن صحیح صحیح سمت میں قائم رہتا ہے۔

صبر کا ایک پہلو وہ ہے جو آدمی کے اختیار سے باہر ہے۔ جو مصیبتیں ہمارے اوپر پڑتی ہیں' وہ ہماری اپنی لائی ہوئی نہیں ہوتیں' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں۔ لیکن صبر کا ایک پہلو وہ ہے جو آدمی کے اپنے اختیار میں ہے' یعنی یہ کہ ہم اللہ کی اطاعت کریں اور ان چیزوں سے رک جائیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس کے لیے بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ صبر کے معنی اپنے مقام کے اوپر رک جانے اور جم جانے کے' اپنے آپ کو باندھ لینے کے اور ان راہوں سے روک لینے کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے' چاہیں تو اس کی فرماں برداری کریں اور چاہیں تو اس کی نافرمانی کریں۔ اس کی فرمانبرداری کرنے کے لیے اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنے اوپر قابو رکھنے اور صبر کرنے کی ضرورت ہے۔

صبر اور شکر کا ذکر اس لیے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے کہ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ شکر کرنے کے لیے صبر کی ضرورت ہے' اور جب مصیبت پڑے تو سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ آدمی مصیبت پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں تو ان دونوں کے تعلق کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آدمی کے اوپر نعمتیں نازل ہو رہی ہوں اور وہ ان نعمتوں کے ذریعے اپنے رب کو پہچان جائے اور بھول نہ جائے' اس کے لیے اپنے آپ کو غفلت میں پڑنے سے روکنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے نعمتوں کو اپنے دست و بازو کی کمائی سمجھنے سے روکنے کی

ضرورت ہے۔ نعمتیں آدمی کو غافل کر دیتی ہیں' لاپروا کر دیتی ہیں اور سرکشی کے راستے پر نکال لے جاتی ہیں' اس سے بھی اپنے آپ کو روکنے کی ضرورت ہے۔ جو آدمی صابر نہ ہو' وہ شکر کے درجات بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ جو صابر ہو' وہی شکر کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔ یہ وہ شکر ہے' جس کا درجہ صبر سے کم نہیں ہے۔

ایک حدیث ہے کہ جو دل کھول کر کھاتا پیتا ہے' اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے' اس کا مقام اس کے برابر ہے جو روزہ رکھتا ہے اور صبر کرتا ہے' روزہ رکھتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں آدمی کو اپنے اوپر قابو کی ضرورت ہے۔ آدمی کے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہوں تو وہ ان کو اللہ کی نعمتیں سمجھ کر استعمال کرے اور کھائے پیئے۔ اس میں اس کا حق ادا کرے' اس کا دل بھی شکر ادا کرے' اس کی زبان بھی شکر ادا کرے' اس کا عمل بھی اللہ کے راستے سے نہ ہٹے' یہ شکر ہے۔ جو کھاتا ہے' پیتا ہے' اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے' شکر کا راستہ اختیار کرتا ہے' اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہے جتنا اُس کا جو بھوکا پیاسا رہتا ہے' اللہ کے لیے روزہ رکھتا ہے اور صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ صبر کا بھی اصل درجہ یہ ہے کہ آدمی سمجھے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر بہت رحم کرنے والا ہے' رب العالمین ہے' رحمٰن ورحیم ہے۔ مومنین کے حق میں تو وہ خاص طور پر رحم کرنے والا ہے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (الاحزاب: ۴۳) ''مومنوں کے حق میں تو وہ مسلسل رحم کا برتاؤ کرنے والا ہے۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت بھی پہنچتی ہے تو اس میں خیر کا سامان ہوتا ہے۔

حدیث کے الفاظ اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ مومن کا تو سارا معاملہ بھلائی اور خیر کا ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے نعمت پہنچتی ہے' دروازے کھلتے ہیں' فراخی نصیب ہوتی ہے تو بھلائی کا معاملہ ہے۔ اس لیے کہ وہ شکر ادا کر کے بے شمار اجر کماتا ہے۔ اگر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو بھی یہ بھلائی کا معاملہ ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار اجر کماتا ہے۔ بال بچے اگر فوت ہو جاتے ہیں' آدمی صبر کرتا ہے' آخرت میں بڑے ذخیرے اور خزانے اس کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ مومن کو کوئی کانٹا چبھتا ہے' کوئی درد ہوتا ہے' کوئی چیز

اس کی گم ہو جاتی ہے' کسی چیز کے بارے میں اس کو پریشانی ہوتی ہے' کوئی چیز وہ کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے' پریشان ہوتا ہے کہ میں اس کو تلاش کروں' اگر اللہ سے اس کے دل کا تعلق قائم رہے تو یہ بھی اس کے لیے اجر کا باعث ہے۔ گناہ مٹائے جاتے ہیں' نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی چیز گم ہوگئی۔ آپؐ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور کہا کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے مومن کے لیے خیر کا سامان رکھ دیا ہے۔ مومن کی زندگی اس طرح خیر سے بھری ہوئی ہے' خیر سے گھری ہوئی ہے۔ اگر اس کو کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر ادا کرتا ہے' اس طرح اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی ملتی ہے۔ مصیبت کو مصیبت سمجھ کر جھیلنے کی روش بھی صحیح ہے۔ آدمی سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت پڑی ہے' اس میں رونا دھونا کرنے کی بجائے صبر سے کام لے' لیکن اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا بھی صبر کا ایک درجہ ہے کہ نعمت پر ہی نہیں' بلکہ مصیبت پر بھی شکر کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے میری تربیت کا سامان کیا۔ میں اس سے غافل ہوسکتا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ اپنا تعلق قائم کرلیا اور اس ذریعے سے اس نے مجھے صبر کرنے کا بے انتہا اجر دیا۔ اور سب سے بڑا اجر یہ ہے کہ اس ذریعے سے مجھے اس کا ساتھ' اس کی صحبت اور اس کی رفاقت مل گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت عباسؓ کا انتقال ہوا تو ایک بدو ان کے پاس آیا۔ عرب کے صحرا کا رہنے والا بدو پڑھا لکھا یا عالم آدمی نہیں تھا۔ اس نے آکر ان کے سامنے ایک شعر پڑھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بعد میں فرماتے تھے کہ مجھ سے میرے باپ کی وفات پر کسی نے اس سے بہتر الفاظ میں تعزیت نہیں کی۔ اس شعر کا مفہوم یہ تھا کہ عباسؓ جس کے پاس گئے ہیں وہ تم سے بہت بہتر ہے' یعنی اللہ کے پاس گئے ہیں۔ اللہ کا اجر' اللہ کی معیت' اللہ کا ساتھ تمھاری دنیا کی زندگی کے ساتھ سے بہت بہتر ہے۔ اور اگر تم صبر کرو تو تمھیں جس کا ساتھ نصیب ہوگا وہ عباسؓ سے بہتر ہے' اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ تمھیں اللہ کا ساتھ نصیب ہوگا۔

اگر اللہ ہمیشہ ساتھ ہے' اسی کا ہاتھ سب کچھ دے رہا ہے' اسی سے سب کچھ مل رہا ہے'

تو نعمت پر بھی اس کا شکر ہے اور مصیبت پر بھی اس کا شکر ہے۔ "عطائے دوست لقائے دوست" دوست سے جب بھی کچھ ملے گا، دوست سے ملاقات ہوگی۔

سب سے بڑھ کر محبت اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہیے۔ ایمان کی نشانی یہ ہے، ایمان کی مٹھاس اس میں ہے کہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت ہو: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (البقرۃ ۲:۱۶۵) "ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں"۔ اللہ جس آدمی کا محبوب ہے اس سے اگر تکلیف بھی پہنچے تو وہ اس پر راضی بہ رضا رہے۔ خوشی پر شکر اور تکلیف پر صبر --- زندگی اسی کا نام ہے!

دل کی زندگی

عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اِسْتَبْرَأَ دِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يُّوَاقِعَهٗ۔ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِي اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔

(بخاری، کتاب الایمان ۔باب فضل من استبرأ لدینہ)

''حضرت نعمان بن بشیرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

بے شک حلال واضح اور صاف ہے اور بے شک حرام بھی واضح اور صاف ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہ والی چیزیں ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جس نے اپنے آپ کو شبہ والی چیزوں سے بچایا اس نے اپنے دین کو اور اپنی عزت کو محفوظ کرلیا۔ اور جو مشتبہ چیزوں کے اندر پڑ گیا تو پھر وہ حرام میں پڑ گیا۔ جس طرح کہ کوئی چرانے والا کسی بادشاہ کی مخصوص چراگاہ کے گرد جائے اور قریب ہے کہ وہ اسی چراگاہ کے اندر داخل ہو کر چرانا شروع کردے۔ اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ اللہ کی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام کیا ہے۔ اور اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ یہ قلب ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے انسانوں کو بھی بدلا،

ان کی سوسائٹی بھی بدلی اور ان کی پوری دنیا بھی بدل دی۔ اس کام کو آپؐ نے کیسے سر انجام دیا، وہ کون سی کنجی تھی جس سے آپؐ نے لوگوں کی زندگیوں کے تالے کھول دیے اور ان کو بدل کے ان کے ذریعے ساری دنیا کو بدل دیا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اس حدیث میں ہے۔

اس حدیث کو ایک انصاری صحابی نعمان بن بشیرؓ نے روایت کیا ہے اور اس طرح روایت کیا ہے کہ جب انھوں نے یہ بیان کیا کہ میں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو انھوں نے اپنے کانوں کی طرف اپنی انگلیوں سے اشارہ کیا کہ یہ وہ کان ہیں جن سے سنا ہے:

فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: بے شک حلال واضح اور صاف ہے اور بے شک حرام بھی واضح اور صاف ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہ والی چیزیں ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تو جس نے اپنے آپ کو شبہ والی چیزوں سے بچایا اس نے اپنے دین کو اور اپنی عزت کو محفوظ کرلیا۔

اور جو مشتبہ چیزوں کے اندر پڑ گیا تو پھر وہ حرام میں پڑ گیا۔

جس طرح کہ کوئی چَرانے والا کسی بادشاہ کی مخصوص چراگاہ کے گرد جائے اور قریب ہے کہ وہ اسی چراگاہ کے اندر داخل ہو کر چرانا شروع کردے۔

اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ اللہ کی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام کیا ہے۔

اور اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور اچھی طرح سن لو اور جان لو کہ یہ قلب ہے۔

اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں میں روایت کیا گیا ہے۔ جو الفاظ میں نے آپ کے سامنے پڑھے ہیں وہ مسلم کے الفاظ ہیں۔ دونوں کے الفاظ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے

لیکن جس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے بیان کیا ہو وہ اپنی صحت کے لحاظ سے بہت اونچے درجے کی حدیث شمار ہوتی ہے۔ حدیث کی بعض کتابوں کو دوسرے طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلے طبقے میں بخاری، مسلم اور مؤطا امام مالک ہیں اور دوسرے طبقے میں ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی کی کتابیں ہیں۔ دوسرے طبقے کی کتابوں میں سے ابن ماجہ اور دارمی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور ان کے الفاظ بھی تقریباً وہی ہیں جو میں نے آپ کے سامنے پڑھے ہیں۔

اس حدیث کو محدثین اور علمائے کرام نے بہت عظیم الشان حدیث قرار دیا ہے بلکہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اسلام کا مدار اس حدیث پر ہے، یا یہ کہ یہ ان تین یا چار احادیث میں سے ایک ہے جن پر پورے اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

اس حدیث کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ حلال اور حرام اور مشتبہات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات ہم تک پہنچاتا ہے اور دوسرا حصہ دل یا قلب کے بارے میں ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں حصوں کا آپس میں کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ محدثین نے عام طور سے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے کہ ان دونوں حصوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ کیوں جمع کیا؟ ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پہلا حصہ جو کہ حلال و حرام اور مشتبہات کے بارے میں ہے، اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے، اور دوسرا حصہ جو دل کے بارے میں ہے، اس پر ہم پہلے گفتگو کریں گے۔ اس طرح اس حدیث کا جو مطلب ہے اور اس میں ہمارے لیے جو ہدایت ہے اس کا سمجھنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔

دوسرے حصے میں آپؐ نے یہ فرمایا کہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ سدھر جائے، سنور جائے، ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے، اور وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ یہ قلب ہے!

پہلا سوال یہ ہے کہ یہاں قلب کا کیا مطلب ہے؟ حدیث کے الفاظ تو یہ بتاتے ہیں کہ جسم میں دل کی شکل میں گوشت کا جو ٹکڑا ہے، آپؐ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے لیکن

قرآن مجید اور حدیث میں قلب کی اصطلاح بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کے مطابق ہماری پوری شخصیت کا نام قلب ہے۔ یہ جسم فنا ہو جائے گا اور انسان کی روح جس کو قرآن مجید میں قلب بھی قرار دیا گیا ہے وہ باقی رہ جائے گی۔

انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو قلب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کی طرف قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے' مثلاً عقل اور سمجھ بوجھ' شعور اور احساس' ان سب کا مرکز بھی قرآن کی زبان میں قلب ہے۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (الاعراف:۱۷۹) ''ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سوچتے سمجھتے نہیں ہیں۔'' کیا ان میں ایسے لوگ نہیں تھے جن کے پاس دل ہوتے اور وہ اپنی عقل سے کام لیتے۔ لہٰذا قرآن میں عقل' تفکر اور سمجھ بوجھ کا مرکز بھی قلب کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے بارے میں ارشاد ہوا: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ٥ (محمد:۲۴) ''یہ کیوں قرآن کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے' کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟'' تو گویا تدبر' یعنی قرآن پر غور و خوض کا مرکز بھی قلب ہے۔

جن دوسرے معنوں میں قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے' وہ ہماری خواہشات ہیں۔ یہ خواہشات دنیوی چیزوں کے لیے بھی ہو سکتی ہیں' ان سے اعلیٰ چیزوں کے لیے بھی ہو سکتی ہیں۔ ان خواہشات کا مرکز بھی قلب ہے۔ اسی طرح جو جذبات انسان کے اندر ہوتے ہیں' مثلاً شفقت کا جذبہ' محبت کا جذبہ' نرمی کا جذبہ' نفرت اور غصے کا جذبہ' ان سب کا مرکز بھی حدیث و قرآن کی رو سے انسان کا قلب ہے۔ اور سب سے آخر میں وہ چیز جو انسان کو انسان بناتی ہے' یعنی اس کا ارادہ اور نیت۔ وہ ارادہ' جس سے وہ اپنے اعضا کو حرکت دیتا ہے' کام کرتا ہے' کچھ چیزوں کو طلب کرتا ہے اور کچھ چیزوں سے رک جاتا ہے۔ اس ارادے کا مرکز بھی قلب ہے۔ اس لحاظ سے قلب دراصل انسان کی شخصیت کا پورا مرکز ہے۔ ہاتھ پاؤں نہ بھی رہیں' کٹ جائیں' ختم ہو جائیں' جسم کے اور دوسرے اعضا بھی ناکارہ ہو جائیں لیکن ایک چیز انسان کی شخصیت ہے' وہ باقی رہتی ہے۔ اسی کو قلب کہا گیا ہے۔

اس لحاظ سے اگر آپ غور کریں کہ حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ گوشت کا ایک ٹکڑا

ہے تو اس سے کیا مطلب ہے؟ اس بارے میں ہمارے محدثین نے کافی لکھا ہے اور لوگوں کا اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک عقل دماغ میں ہے اور بعض کے نزدیک دل میں ہے۔ سائنس کی رو سے بھی گوشت کا یہ ٹکڑا صرف اتنا کام کرتا ہے کہ خون پمپ کرتا رہے اور باقی انسان کے سارے جذبات اور سوچ سمجھ کا مرکز اس کا دماغ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بحث حدیث سے بالکل غیر متعلق ہے اور میری رائے میں حدیث کو سمجھنے کے لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ متعین کریں کہ فی الواقع یہ دماغ ہے یا قلب ہے۔ جب انسان آپس میں بات کرتے ہیں تو وہ اپنے مشاہدے کی بنا پر اور ادب کے پیرایے میں بات کرتے ہیں۔ اگرچہ سائنس یہ کہتی ہو کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے لیکن آپ یہی کہیں گے کہ سورج نکل آیا اور سورج ڈوب گیا۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ زمین نکل آئی اور زمین ڈوب گئی۔ اسی طرح ہماری زبان کے اندر معروف محاورہ یہ ہے کہ میرا دل یہ کہتا ہے' میرا دل یہ چاہتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ادب کی زبان ہے اور اس لحاظ سے اس کا مطلب سمجھنے کے لیے یہ متعین کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے کہ عقل کا مرکز کہاں ہے اور دماغ کا مرکز کیا ہے۔ قرآن نے یہ لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جسد سے کیا مراد ہے؟ جب جسم کہا تو اس سے ظاہری جسم مراد ہے یا کچھ اور۔ اس سے ہمارا یہ جسم مراد ہے۔ اس کی طرف محدثین نے اشارہ کیا ہے اور یوں کہا ہے کہ جسم کی حیثیت رعایا کی ہے اور قلب کی حیثیت بادشاہ کی۔ جس طرح رعایا بادشاہ کے ماتحت ہوتی ہے' اسی طرح یہ ہاتھ پاؤں' ناک کان' آنکھ ہر چیز قلب کے تابع ہے۔ آنکھ وہ چیز نہیں دیکھے گی جو دل دیکھنا نہ چاہے اور وہ چیز دیکھے گی جس کو دل دیکھنا چاہے۔ ہاتھ وہ چیز نہیں کمائے گا جس کے بارے میں دل نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ نہیں کمانا چاہیے اور وہی چیز کمائے گا جس کے بارے میں دل یہ فیصلہ کرلے کہ اسے کمانا چاہیے۔ یہ سارے اعضا رعیت ہیں' رعایا ہیں اور قلب کی حیثیت ایک بادشاہ کی ہے۔

جسد کے دو اور معنی بھی ہو سکتے ہیں' اگر ہم اس کو ایک استعارہ سمجھیں۔ ایک تو یہ کہ

جسد سے مراد وہ شریعت ہے جس کا ذکر حدیث کے پہلے ٹکڑے میں ہو چکا ہے اور یہاں سے ان دونوں کا ربط قائم ہوتا ہے کہ وہ شریعت جو حلال اور حرام کو واضح کرتی ہے' اس شریعت کے قائم ہونے کے لیے قلب کی بنیاد اور قلب کی قوت ضروری ہے۔ احکام کی اطاعت کے لیے سینے کے اندر دل بیدار ہونا چاہیے۔ سننے کے لیے' سمجھنے کے لیے' دیکھنے کے لیے' صحیح فیصلہ کرنے کے لیے' صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے' صحیح راہ پر چلنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دلِ بیدار موجود ہو۔

اس کے دوسرے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ جسد سے دراصل پوری انسانی زندگی مراد ہے۔ اس کی انفرادی زندگی بھی اور اجتماعی زندگی بھی اور اس کی زندگی کا ہر پہلو۔ اگر دل میں سکون ہے' زندگی میں سکون ہوگا' اگر دل میں اطمینان ہے' زندگی میں اطمینان ہوگا اگر دل میں اچھے خیال آتے ہیں' زندگی اچھے راستے پر جائے گی۔ دل میں برے خیال آتے ہیں' زندگی برے راستے پر جائے گی۔ اجتماعی طور پر بھی جو خرابیاں قوم کے اندر پیدا ہوتی ہیں' لوٹ مار ہوتی ہے' خون خرابہ ہوتا ہے' ڈاکے پڑتے ہیں ان سب کے پیچھے اصل خرابی دل کی خرابی ہے۔ انسان گناہ کرتا ہے' اس کے دل میں خرابی ہوتی ہے تو وہ غلطی کرتا ہے۔ گویا اس حدیث کی رو سے اصلاح کا راستہ قلب ہے۔ اگر قلب کی اصلاح ہوگی تو آدمی کے اعضا بھی صحیح کام کریں گے۔ شریعت کی اطاعت کی قوت بھی اس کے اندر پیدا ہوگی اور پوری انسانی زندگی کی اصلاح ہو جائے گی۔ اگر اس میں بگاڑ پیدا ہو تو پھر اعضا بھی غلط کام کریں گے' شریعت بھی کتابوں میں لکھی رہ جائے گی اور اس پر عمل نہیں ہوگا۔ یوں پوری انسانی زندگی کے اندر بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

''صلاح'' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے' اس کے معنی دراصل ہر قسم کی اچھائی اور بھلائی اور اصلاح ہے' اور فساد سے بھی ہر طرح کا فساد مراد ہے۔ حدیث میں اس کا کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے کہ کس قسم کی صلاح اور کس قسم کا فساد مراد ہے۔ ہر قسم کی صلاح اور ہر قسم کا فساد مراد لیا گیا ہے' خواہ وہ انسان کی جسمانی زندگی سے متعلق ہو یا اخلاقی زندگی سے متعلق ہو' یا مادی

زندگی سے متعلق ہو' خواہ اس کی انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا اس کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہو۔ لیکن یہ کہ ہر صلاح اور ہر قسم کی صلاح' ہر فساد اور ہر قسم کے فساد کا انحصار قلب پر ہے۔ دیکھیے' قرآن مجید نے اس بات کو بہت کھول کے بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ پوری انسانی زندگی میں جو کچھ بھی پیش آ رہا ہے وہ اس دل کی وجہ سے ہے۔ فرمایا: فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ (البقرۃ:۱۰) ''ان کے دلوں میں مرض ہے۔'' کسی منافقت' نافرمانی اور تغافل کے رویوں کے پیچھے جو چیز ہے وہ دلوں کا مرض ہے۔ مرض کی جڑ دلوں میں ہے۔ فرمایا: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ○ (الحج:۴۶) یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں کہ دیکھنے سے انکار کردیں کہ صحیح راستہ کیا ہے اور صحیح کام کیا ہے' بلکہ جو دل سینوں کے اندر ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد آنکھیں دیکھتی بھی ہیں اور کان سنتے بھی ہیں' لیکن نہ صحیح راستہ دکھائی دیتا ہے' نہ صحیح آواز سنائی دیتی ہے اور نہ آدمی ہدایت قبول کرتا ہے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ ایمان اور تقوے کا اصل مرکز دل ہے: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:۷) مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لیے محبوب اور پیارا کردیا ہے۔ دلوں کی سجاوٹ اور زینت ایمان کے اندر ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ (الحجرات:۳) یعنی جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوے کے لیے آزمالیا وہی اہل تقویٰ ہیں نہ کہ ظاہر کی چیزیں تقویٰ ہیں۔

اس بات کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق حضورؐ نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف تین دفعہ اشارہ کیا اور فرمایا کہ اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا' تقویٰ دراصل یہاں ہے۔ تقوے کو تم کبھی لباس میں ڈھونڈتے ہو' کبھی شکل وصورت میں' کبھی ظواہر میں' لیکن تقوے کا مرکز اور سرچشمہ تو یہاں پر ہے۔ تین دفعہ آپؐ نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرکے اس بات کی تاکید فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے بھی کئی دفعہ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اصل پرسش قلب کے اعمال کی ہے۔ اگر کسی آدمی کو زبردستی کلمہ کفر کہنا پڑے لیکن اس کے دل کے اندر ایمان ہو تو اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی جس کو مجبور کردیا گیا لیکن قلبہٗ مطمئن ،اس کا

دل ایمان کے اوپر مطمئن ہے۔ سینے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ تم گناہ تو کرتے ہو لیکن پرسش تو اس گناہ کی ہے جس کا دل نے ارادہ کیا ہو جو دل نے کمایا ہو۔ دل کی کمائی پر انسان سراسر قابل مواخذہ ہے۔

انسان اس لیے جواب دہ اور قابل مواخذہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ارادے کی آزادی دی ہے۔ کوئی چاہے تو نیکی کرے اور کوئی چاہے تو برائی کرے۔ اس ارادے کا سرچشمہ اور ڈوری کیونکہ قلب کے ہاتھ میں ہے' اس لیے اصل ذمے داری قلب کی ہے۔ گناہ کا ذمے دار بھی انسان کا قلب ہے' یعنی اس کے اندر کی شخصیت جو اس کے جذبات اور ارادے اور محرکات اور ہر چیز کا مرکز ہے۔ قیامت کے روز بھی وہی آدمی نجات پائے گا جو صحیح سالم دل لے کر اللہ کے پاس جائے گا۔ اس کو قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا: جس دن نہ مال کام آئے گا' نہ بیٹے کام آئیں گے' نہ دولت کام آئے گی' نہ جائیداد کام آئے گی سوائے اس کے کہ جو ''قلب سلیم'' لے کر آئے گا۔ جو سالم' صحیح' درست دل لے کر اللہ کے پاس آیا' بس وہی نجات پائے گا۔ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے ہیں' فرمایا کہ آگ اللہ کے ہاں تیار ہے' بھڑک بھڑک کر ان کے دلوں تک جھانکے گی۔ مختلف جگہ قرآن نے یہ اشارہ دیا ہے کہ دراصل ذمہ دار اندر کی شخصیت ہے۔ جسم تو ہر پانچ سال میں نیا بن جاتا ہے اور مٹی میں مل کے دوبارہ بھی نیا بنے گا۔ اس ہاتھ میں اس وقت جو گوشت ہے' وہ کوئی گناہ کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ تو فنا ہو جائے گا لیکن جو اندر کی شخصیت ہے' جو ارادہ کرتی ہے' اور گناہ کرتی ہے' اور نیکی کرتی ہے' وہی اس کے لیے ذمہ دار ہے۔

حضورؐ نے جو بات یہاں پر فرمائی ہے یہ انسان کی زندگی کے تالے کھولنے کے لیے پہلی کنجی ہے' انفرادی زندگی کے بھی اور اجتماعی زندگی کے بھی۔ دل اصل ذمہ دار ہے۔ اگر دلوں کے اندر بگاڑ ہوا تو زندگی بھی بگڑے گی' معاشرہ بھی بگڑے گا' سوسائٹی بھی بگڑے گی' ریاست بھی بگڑے گی' سیاست بھی بگڑے گی اور معیشت بھی بگڑے گی' اور اگر دل درست ہوں گے تو ہر چیز میں سدھار پیدا ہو جائے گا۔

اب ہم حدیث کے پہلے حصے کی طرف آئیں تو اس کا مفہوم بہت صاف اور واضح ہو جاتا ہے۔ حضورؐ نے بات کا آغاز اس طرح کیا کہ حلال بالکل واضح اور صاف ہے' اور حرام بھی واضح اور صاف ہے۔ جو چیزیں اللہ نے حلال کردی ہیں' ان میں کوئی شبے کی گنجائش نہیں ہے اور ان کو بیان فرمادیا ہے۔ حلال کے واضح ہونے کے معنی دراصل یہ ہیں کہ اس کے اندر کوئی شبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ جوئے کے بارے میں شبہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ شراب کے بارے میں شبہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ سود کے بارے میں کوئی شبہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ یہ وہ حرام ہیں جو بالکل واضح ہیں۔ اسی طرح حلال بھی واضح ہیں۔ اس میں آپؐ نے بین کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ میری فہم کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس قدر روشن اور کھلی بات ہے کہ اگر شرعی دلیل نہ بھی ہو' تب بھی انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی حلال وحرام اور برا بھلا سمجھ سکتا ہے۔

یہ بات قرآن مجید میں مختلف انداز میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے' مثلاً نیکی کو معروف کہا' یعنی وہ چیز جو انسان کی جانی پہچانی ہے اور برائی کو منکر کہا' یعنی وہ چیز جو انسان کے لیے اجنبی ہے۔ اس کی فطرت اس سے خود ہی کہتی ہے کہ یہ بات بری ہے۔ انسان نے کتنے ہی گناہ کیے ہوں' کتنی ہی برائیوں کے اندر پڑا ہو' کتنے ہی فلسفے بنائے ہوں لیکن انسانوں کی عظیم اکثریت آج تک اس بات پر متفق نہیں ہوئی کہ کوئی نیکی جو مسلمہ نیکی ہو' برائی ہے اور کوئی برائی نیکی۔ دنیا میں کبھی قوموں نے مل کر اس بات کو نہیں مانا' یہاں تک کہ وہ قومیں جو دن رات شراب پیتی ہیں' وہ بھی کہتی ہیں کہ شراب مضر ہے۔ جو سود کھاتی ہیں وہ بھی کہتی ہیں' سود کے اندر نقصان ہے' اور جو زنا کرتی ہیں وہ بھی اسے برا کہتی ہیں۔ زنا کی کوئی تعریف نہیں کرتا کہ زنا اچھی بات ہے۔ اس کو گوارا کرلیا گیا' اس کے لیے دلائل گھڑے گئے لیکن اگر آپ اسلاف کی تاریخ نکال کر پڑھیں تو کبھی بھی انسانوں کی اکثریت نے اس برائی کو اچھائی نہ سمجھا۔ ایسے لوگ بھی ہوسکتے ہیں جن کا ذائقہ بگڑ جائے لیکن انسانوں کی بڑی اکثریت نے کبھی معروف نیکیوں کے برے ہونے پر اصرار نہیں کیا اور معروف برائیوں کے اچھے ہونے پر اصرار نہیں کیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آدمی ایمان کے راستے پر آئے گا اور جس کے پاس سالم

دل ہوگا' جس کی اصلاح ہو چکی ہوگی' وہ حرام اور حلال کی پابندی تو لازماً کرے گا۔ جو چیز روزِ روشن کی طرح دکھ رہی ہے اور بین ہے' جیسے سورج چمک رہا ہے اگر آدمی کو معلوم ہو کہ یہ راستہ میرے گھر کی طرف جاتا ہے تو پھر وہ دوسرے راستے پر کیوں جائے گا۔ یہ تو اس طرح سے بینات ہیں کہ جس کے دل میں ایمان کی روشنی ہے' وہ ان میں سے کسی حلال کو نہ حرام کر سکتا ہے نہ حرام کو حلال۔

آپؐ نے ایک بات اور فرمائی: فرمایا کہ ان دونوں کے درمیان ایک چیز اور ہے جو شبہ والی ہے۔ لَا یَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ' اکثر لوگ اس کو جانتے نہیں۔ شبہ والی چیزوں سے کیا مطلب ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ شبہ والی چیزوں سے یہ مراد ہے کہ وہ چیزیں جن کے بارے میں قرآن وسنت کے دلائل سے واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ واقعی حلال ہیں یا حرام۔ جس پر اختلاف ہو جائے۔ اس سے وہ چیزیں مراد نہیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بالکل حلال کر دیا ہے۔ اب آدمی خواہ مخواہ شبہ پیدا کرے کہ پتہ نہیں یہ پانی حلال ہے یا نہیں' پتہ نہیں یہ جانور کھانے کے لائق ہے یا نہیں۔ اس قسم کے شبہات سے منع کیا گیا ہے۔ یہ سارے وسوسے ہیں' ان کے پیچھے مت پڑو۔ لیکن جہاں پر شرعی دلائل کی بنیاد پر آدمی شبہے میں پڑ جائے کہ یہ بات حلال ہے یا حرام' اور آج کی موجودہ دنیا میں بے شمار نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں' جن کے بارے میں شبہ پیدا ہوا ہے' جن کو اکثر لوگ نہیں جان سکتے' اس کے لیے شریعت اور دین کا علم ضروری ہے۔

فرمایا کہ جس نے اپنے آپ کو ان چیزوں سے بھی بچایا' یعنی مشتبہ چیزوں سے' اس نے اپنے دین کو شریعت کے لحاظ سے برا ہونے سے بچا لیا اور اپنی عزت کو دنیا کے اندر بدنام ہونے سے بچا لیا۔ یہ جو فرمایا کہ دین اور عزت دونوں کو بچا لیا اور شبہے سے اپنے آپ کو بچایا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی حرام اور حلال کی تو پروا نہ کرے اور جو چیزیں مشتبہ ہیں' ان سے اپنے آپ کو بچائے۔ اس قسم کا مضمون اور بھی بہت سی حدیثوں میں آیا ہے۔ ایک بہت مشہور حدیث ہے کہ ایک بندہ فرائض ادا کرتے کرتے مجھ سے قریب ہوتا ہے اور وہ مجھے بہت محبوب

ہے۔ پھر وہ نوافل بھی ادا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں' اس کا کان بن جاتا ہوں' اس کی آنکھ بن جاتا ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نوافل کا درجہ فرائض سے اونچا ہے بلکہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب دل اتنا بیدار اور حساس ہوجاتا ہے کہ حرام اور حلال کی لازماً پابندی کرے تو وہ چیز جو مشتبہ ہو' اس سے بھی اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ جو آدمی بہت پاک صاف رہتا ہو' اگر شبہ بھی ہوجائے کہ کپڑوں پر گندگی کا داغ لگ گیا ہے تو وہ اس سے اپنے آپ کو بچائے گا اور اسے صاف کرے گا۔ یہ دراصل دل کی اس کیفیت کا اظہار ہے۔ یہ نہیں کہ مشتبہات کا درجہ حلال وحرام سے اونچا ہے۔ اصل چیز تو حلال وحرام سے بچنا ہے لیکن یہاں دل کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تقوے کی کیفیت ہے۔ جس کے اندر تقویٰ ہوگا' جس کا دل صالح اور سالم ہوگا تو وہ ان مشتبہات سے بھی دور رہے گا۔ فرمایا کہ اس طریقے سے اس کا دین محفوظ ہوجائے گا اور اس کی عزت بھی محفوظ ہوجائے گی۔

دین کس طرح محفوظ ہوگا؟ اس کی تفصیل بھی یہ بتائی کہ جو مشتبہ چیزوں کے پیچھے جائے گا وہ بالآخر حرام میں پڑ جائے گا۔ کس طرح ہوگا؟ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب آدمی ایک مشتبہ چیز کے پیچھے جائے گا کہ چلو یہ تو بہت چھوٹی بات ہے' اس کے بہت دلائل ہیں' تو کل اس سے زیادہ مشکوک چیز کی طرف جائے گا' اور پرسوں اس سے بھی زیادہ مشکوک چیز کی طرف جائے گا تو پھر بالآخر حرام کو بھی حلال ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جائے گا۔ دوسری وجہ یہ کہ طبیعت کے اندر سستی پیدا ہوجائے گی۔ وہ طبیعت جس کو چست و چالاک ہونا چاہیے' کوئی ذرا سی بات ایسی نہ ہو جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہو' جو اللہ کو ناپسند ہو' مشتبہات کرتے کرتے اس کی طبیعت کی حس کمزور پڑ جائے گی اور جب یہ غائب ہوجائے گی تو پھر آدمی لازماً حرام کا بھی ارتکاب کر بیٹھے گا۔ اس لیے طبیعت کی چستی ضروری ہے۔

یہاں آپؐ نے بڑی خوب صورت مثال اور تشبیہ دی۔ پرانے زمانے میں جو بادشاہ اور عرب قبائل کے سردار ہوتے تھے' ان کو چراگاہیں بہت محبوب ہوتی تھیں' جہاں جانور چرائے جاتے تھے۔ وہ بعض چراگاہوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے کہ اس کے اندر کوئی جانور نہیں

لائے گا' کوئی نہیں چرائے گا۔ اگر آئے گا تو سزا ملے گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس طرح جب ایک مخصوص چراگاہ کے قریب کوئی جانور چر رہا ہو تو جب وہ اس کی چار دیواری کے پاس پہنچ جائے گا تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ اندر سے سبزہ لہراتا ہوا نظر آئے تو حرام کی ترغیب و کشش ہوگی۔ قریب تو اس لیے آیا ہے کہ یہاں تک تو میں آسکتا ہوں لیکن پھر وہ اچانک احاطے کے اندر بھی داخل ہو جائے گا۔ اس کے لیے تو بخاری میں حدیث کے الفاظ ہیں کہ وہ احاطے میں داخل ہو جائے گا اور مسلم میں ہے کہ یرتع۔ یرنع، آہستہ آہستہ چگنے کے معنوں میں آتا ہے۔ یوں وہ چگنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر آپؐ نے بہت ہی تاکید کے ساتھ اور بہت زوردار انداز میں کہا کہ ہر بادشاہ کے لیے ایک چراگاہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمایا کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چراگاہ اپنے لیے مخصوص کر لی ہے' جس میں کسی کو داخل نہیں ہونا چاہیے' وہ محارمات ہیں جن کو اس نے حرام کر دیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً' جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ یہ دل ہے۔ چار دفعہ اَلَا کہا۔

ان دونوں حصوں کے درمیان جو بظاہر غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں' کیا ربط ہے؟ اس مسئلے سے محدثین اور علما نے کوئی بحث نہیں کی لیکن میں نے اس پر غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کے درمیان بڑا گہرا ربط ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ دل کی زندگی کا انحصار اس پر ہے کہ آدمی اطاعت گزار ہو۔ یہ سارے شیطانی وسوسے ہوتے ہیں کہ عمل سے کیا ہوتا ہے' اصل چیز تو دل کی نیکی ہے' اخلاق ہیں۔ عبادات سے کیا ہوتا ہے۔ دل کی جو فلاح ہے' اچھائی ہے' سنورنا ہے اس کا انحصار اس پر ہے کہ آدمی اللہ کی اطاعت کرے' حرام اور حلال میں تمیز کرے۔ اگر اس کی حس تیز ہو' دل زندہ ہو تو ان چیزوں سے بھی بچے گا جو حرام اور حلال کے درمیان ہیں' جن کے اندر شبہ ہے۔ یہ تو ایک وجہ ہے دونوں کے درمیان ربط کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حرام اور حلال کی حدود کو ہم سب جانتے ہیں۔ آج آپ کسی

مسلمان سے پوچھ لیں کہ حلال کیا ہے تو وہ آپ کو بڑے بڑے حلال بتادے گا۔ حرام پوچھ لیں تو بڑے بڑے حرام بتادے گا۔ لیکن اس کے اندر اتنی استعداد اور قوت نہیں ہے کہ اپنے آپ کو حرام سے بچائے اور حلال کے راستے پر لے کر جائے۔ ابھی حال میں ایک سروے میں لوگوں سے پوچھا گیا کہ سیور ریفل کے ٹکٹ کو کتنے لوگ اسلام کی رو سے جائز سمجھتے ہیں' تو سب نے کہا کہ یہ ناجائز ہے۔ پوچھا گیا کہ کتنے لوگوں نے ٹکٹ خریدا ہے' ہر دو میں سے ایک آدمی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ یعنی علم تھا کہ یہ حرام ہے لیکن عمل اس سے مختلف ہے۔ لہٰذا یہ قوت' نفس کے اندر یہ استعداد جس سے آدمی شریعت کی عمارت کا بار اٹھا سکے اور احکام کا بوجھ اپنے اوپر لے سکے اور اس عمارت کی پوری تعمیر شریعت پر کر سکے' اس کا سرچشمہ آدمی کا قلب اور اس کا دل ہے۔ دل کے ندر اگر یہ ایمان ہوگا' یہ جذبہ ہوگا' یہ کیفیت ہوگی' یہ قوت ہوگی' استعداد ہوگی تو پھر جو شریعت میں حلال و حرام طے کیا گیا ہے آج ہم اس کی پابندی کریں گے' اور اگر یہ نہیں ہوگی تو ہزار وعظ کہے جائیں' بیان کیے جائیں' لیکن دل کے اندر یہ نور نہیں ہوگا' یہ قوت نہیں ہوگی' یہ استعداد نہیں ہوگی تو حلال و حرام کتابوں میں لکھا رہے گا' وعظ کے اندر بیان ہوگا' علما کی زبان پر بھی ہوگا' غلط اور صحیح سب کو معلوم ہوگا لیکن عمل نہیں ہوگا اور جب عمل مختلف ہوگا۔ تو عمل کا اثر دل پر بھی پڑے گا۔

اب یہاں یہ حدیث ایک اور اہم مسئلہ طے کر رہی ہے۔ ہمارے ہاں شریعت کی اور طریقت کی اور ظاہر کی اور باطن کی مسلسل بحث چلتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شریعت الگ چیز ہے' اور طریقت الگ چیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حدیث میں دونوں کو ایک جگہ جمع کر کے اور جسم کی مثال دے کر رسول اللہؐ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ یہ تو ایک وحدت ہے۔ دل ہو یا شریعت' اندر کی زندگی ہو یا باہر کی' جس طرح دل کا تصور جسم کے بغیر نہیں ہو سکتا' اخلاق اور روح اور دل کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کہاں باقی رہے گا اگر نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حلال و حرام کی پابندی نہ ہو۔ اسی طریقے سے جسم کا تصور بھی دل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں' ایک ہی چیز کا حصہ ہیں' ایک ہی چیز کے ٹکڑے ہیں' اور ایک دوسرے کے ساتھ بالکل مربوط ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ یہ حدیث بالکل واضح طور پر طے کر دیتی ہے کہ انسان ایک وحدت اور ایک اکائی ہے۔ اس کا دل و دماغ اور جسم سب یکساں ایک ہی طرح ڈھلے ہوئے ہیں۔ یہ بات قرآن نے بار بار کہی ہے کہ ظاہر کے اعمال کا اثر دل پر پڑتا ہے اور دل ظاہر کے اعمال کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر صحیح یا غلط راستہ پر لے جاتا ہے۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ط (الصف:۵) جب لوگوں نے برائی کا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ جب لوگوں نے اللہ کے ساتھ اطاعت اور بندگی کے اپنے عہد کو توڑ دیا تو اس نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ ان کے اوپر لعنت ہے۔ ظاہر کے اعمال کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ دل کے اعمال کا ظاہر پر اثر ہوتا ہے۔ ہم روز اس بات کو دیکھتے ہیں کہ کوئی آپ کو گالی دے تو دل کی حرکت تیز ہو جائے گی، جبڑا اوپر چلا جائے گا، کنپٹی سرخ ہو جائے گی۔ ایک ایک لفظ کا اثر جسم پر پڑتا ہے۔ اگر کوئی آپ کی تعریف کر دے تو دل کو بڑی راحت اور اطمینان محسوس ہوگا۔ باہر کی بات کا، باہر کے اعمال کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ دل کا اثر باہر پڑتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کی فکر کرنے ہی سے انسانی زندگی درست اور صحیح راستے پر چلے گی۔ یہ وہ بات ہے جس کی بنا پر اس حدیث کو بڑی عظیم حدیثوں میں شمار کیا گیا ہے۔ بعض محدثین نے تو یہ تک کہا ہے کہ جن تین یا چار احادیث پر پورے دین کی عمارت قائم ہے، ان میں سے ایک حدیث یہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دل کی اصلاح کا راستہ کیا ہے؟ اس سوال کا ایک مختصر جواب دے رہا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے، جس طرح لوہے پر پانی گرے تو اس کو زنگ لگ جاتا ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے اور استغفار نہیں کرتا، توبہ نہیں کرتا اور پھر گناہ کرتا ہے تو ایک اور داغ پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پورے کا پورا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے، پورے کا پورا سیاہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضورؐ! اس کا علاج کیا ہے؟ دل کیسے صاف ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ کَثْرَةُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ۔ یہ بیہقی کی حدیث ہے جس میں آپؐ

نے فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد رکھو اور قرآن کی تلاوت کرو۔ اگر اعراب تھوڑا سا بدل کر پڑھے جائیں تو اس کا ایک ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ موت کو بھی کثرت سے یاد رکھو اور قرآن کی تلاوت بھی کثرت کے ساتھ کرو۔ ان اعراب کے ساتھ حدیث میں روایت تو نہیں آئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمہ بھی ممکن ہے۔ چنانچہ کثرت کے ساتھ موت کو یاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہے' اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا یہ وہ چیزیں ہیں جن سے دل کی برائیاں دور ہوتی ہیں' زنگ دھلتا ہے' سیاہی صاف ہوتی ہے اور دل چمکتا ہے۔ اس کے اندر ایمان کا نور پیدا ہوتا ہے' اور اس سے پوری زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ دل کا تعلق اللہ کے ساتھ قائم ہو جائے' اللہ کی یاد دل کے اندر آ جائے تو یہی چیز دل کو صحیح راستے پر لگاتی ہے۔

میرے بھائیو اور بہنو! اگر ہمیں اپنی زندگی کی تعمیر اس نقشے پر کرنی ہے جو نبی کریمؐ نے ہمیں دیا ہے تو ہمیں سب سے پہلے اسی چیز سے آغاز کرنا ہوگا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم عمل کو چھوڑ دیں گے۔ یہ میں نے بالکل واضح کر دیا ہے' جیسا کہ حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عمل بھی ساتھ ساتھ ہوگا' لیکن دل نقطۂ آغاز ہے۔ اس میں اللہ کی محبت' اس کا خوف' اس پر یقین و بھروسا' اچھے خیالات' ان کو اگر آپ پروان چڑھائیں گے تو دل میں زندگی پیدا ہوگی۔ دل میں زندگی پیدا ہوگی تو آپ کے اندر وہ قوت اور استعداد آئے گی جس سے آپ اللہ کی راہ اور اس کے نبیؐ کی راہ پر چل سکیں گے۔

جب ڈوری بہت زیادہ الجھ جائے تو آپ کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس ڈوری کا کہیں سے سرا پکڑ لیں تو پھر آہستہ آہستہ پوری ڈوری کھلتی جاتی ہے۔ آج ہماری زندگی اس ڈوری کی طرح بہت ساری گرہوں میں الجھ گئی ہے۔ معیشت میں' سیاست میں' معاشرت میں' روزمرہ کی زندگی میں' اپنی نفسیاتی زندگی میں' معاشرتی زندگی میں' گھر میں' بے شمار گرہیں ہیں جو زندگی کی اس ڈوری کے اندر پڑ چکی ہیں۔ ہم کو کہیں سے اس سرے کو پکڑنا ہے۔ پکڑ کر بیٹھ ہی نہیں جانا بلکہ پوری رسی کو کھولنا ہے۔ انسان کا سرا' اس کا دل ہے۔ جب بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ڈوری ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور زندگی ہمارے ہاتھ سے نکل کر خرابی کے راستے پر آ گئی ہے تو

پھر ہمیں واپس جا کر وہیں سے اپنے کام کو شروع کرنا چاہیے' اس کی نگرانی کرنا چاہیے' اسی پر نگاہ رکھنا چاہیے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی فکر کرنا چاہیے۔ دن میں جتنی بار بھی ممکن ہو اس بات کو یاد کریں کہ اللہ سے ملاقات کرنی ہے اور جتنا وقت بھی اللہ توفیق دے اس کی کتاب کی تلاوت کریں۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے' اس لیے کہ قرآن مجید کا بیشتر حصہ دراصل موت کو یاد دلاتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی کی تیاری کی دعوت دیتا ہے۔ گویا یہ دونوں چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

یہ ایک عظیم الشان حدیث کا مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

دنیا کی زندگی کی حقیقت

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِيْ فَقَالَ: "كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ" وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ: "إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ." (البخاری)

''رسول اللہؐ نے میرا مونڈھا یا کندھا پکڑا اور پھر آپؐ نے فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو جیسے کہ تم اجنبی ہو یا تم راستہ طے کر رہے ہو۔ حضرت ابنِ عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو۔ صحت کے زمانے سے مرض کے زمانے تک اپنا سرمایہ جمع کرو اور زندگی میں موت کے لیے جمع کرو۔''

نبی کریمؐ کی جو تعلیمات ہمارے سامنے آتی ہیں وہ ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کریں، اس کی مخلوق کے ساتھ شفقت اور رحمت کا برتاؤ رکھیں، سب کے حقوق ادا کریں، کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، سارے کام صرف اللہ کے لیے کریں، نیت کو خالص رکھیں، اور دل کی بھی اصلاح کریں۔ سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کس طرح پیدا ہو سکتی ہیں اور وہ منبع کیا ہے جس سے وہ سارے مطالبات جو نبی کریمؐ نے اپنا ساتھ دینے والوں اور ماننے والوں سے فرمائے ہیں، پورے ہو سکیں؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ سارے مطالبات دنیا کی زندگی میں پورے کرنے ہیں، اس لیے جب تک دنیا کی زندگی کی حقیقت آدمی کی سمجھ میں نہ آئے اور اس حقیقت کے مطابق دنیا کے ساتھ معاملہ نہ کرے اور

اس کے اندر اتنی استعداد اور قوت نہ ہو کہ وہ دنیا کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو دنیا کی حقیقت مطالبہ کرتی ہے، اس وقت تک ان ساری صفات کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ جو حدیث پیش کی جارہی ہے، وہ اسی موضوع پر ہے۔ میں صحیح بخاری کے الفاظ آپ کے سامنے پیش کروں گا‘ اگرچہ اس حدیث کو ترمذی، ابنِ ماجہ اور نسائی میں بھی روایت کیا گیا ہے۔ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ فرماتے ہیں:

رسول اللہؐ نے میرا مونڈھا یا کندھا پکڑا اور پھر آپؐ نے فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو جیسے کہ تم اجنبی ہو یا تم راستہ طے کر رہے ہو۔ حضرت ابنِ عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو۔ صحت کے زمانے سے مرض کے زمانے تک اپنا سرمایہ جمع کرو اور زندگی میں موت کے لیے جمع کرو۔

حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول حدیث کا حصہ تو نہیں ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو اس طرح نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلامِ نبوت کا حصہ ہے۔

صحابہ کرامؓ اس بات سے واقف تھے کہ جو بات بھی نبی کریمؐ کی طرف منسوب کی جائے وہ سو فی صد سچ ہونی چاہیے۔ اس لیے اکثر صحابہؓ احتیاط کی وجہ سے بہت ساری باتیں نبی کریمؐ سے نسبت دیے بغیر نقل کیا کرتے تھے۔ اس کو حدیث کی زبان میں ''اثر'' کہتے ہیں۔ آثارِ صحابہؓ اور کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ یا تقریباً اسی قسم کی بات حضورؐ سے سنی گئی تھی۔ لیکن اسے آپؐ کی بات قرار دینے کے بجائے اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جو الفاظ ان کو یاد تھے وہ انھوں نے واضح طور پر بیان فرمائے کہ دنیا کے اندر اس طرح رہو گویا کہ تم غریب ہو۔ غریب عربی لغت کے حوالے سے ہے‘ جب کہ عابری سبیل سے مراد ہے راستہ چلنے والے یا راستہ عبور کرنے والے۔

یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن کے الفاظ اگرچہ مختصر ہیں لیکن ان کا مضمون بڑا وسیع اور اہم ہے۔ سب سے پہلے تو طریقۂ تعلیم پر غور کیجیے کہ نبی کریمؐ نے اپنے ساتھیوں‘ یعنی صحابہ کرامؓ کی تربیت کے لیے ان کو متوجہ کیا اور قریب ہو کر ان کا کندھا پکڑ کر ان کی توجہ مبذول کر کے ان سے بات کی اور فرمایا کہ دنیا کے اندر غریب یا راستہ عبور کرنے والے کی

طرح رہو۔ غریب کا لفظ عربی میں ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا جن معنوں میں اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ غریب کے معنی عربی میں اجنبی کے ہیں، ایسا شخص جو ایسی جگہ رہتا ہو جہاں پر وہ اجنبی ہو۔

اس کی تشریح عربی لغت میں یوں بھی کی گئی ہے کہ جس کا کوئی اور گھر نہ ہو۔ ایسا گھر جہاں پر اس کو ٹھکانہ ملے، یا ایسا گھر جہاں پر وہ سکونت اختیار کرے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جہاں پر وہ رہ رہا ہو وہ جگہ اس کے لیے اجنبی ہے اور اس کو اس سے کوئی انس اور محبت نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اس جگہ پر قیام پذیر ہے لیکن وہاں پر اس کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس جگہ پر وہ ماحول کے لحاظ سے، آس پاس والوں کے لحاظ سے، اور اپنی زندگی کے لحاظ سے اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔

دوسرا لفظ آپؐ نے فرمایا کہ عَـابِرُ سَبِیْـلٍ، راستہ عبور کرنے والا۔ عبور کا لفظ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے عابر کا لفظ نکلا ہے' یعنی راستہ چلنے والے کی طرح رہو۔ راستہ چلنے والے سے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو آدمی مسلسل چل رہا ہے اور کہیں اس کو قیام یا سکونت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ مسلسل سفر کی حالت میں ہے، مسلسل اس کا سفر جاری ہے اور بیچ میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بیچ میں منزلیں بھی آتی ہیں، قیام بھی کرتا ہے لیکن مسافر کی طرح۔ وہ یہ جانتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہے، اپنے وطن سے دور ہے۔

اس حدیث میں آخرت کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ سے یہ بات واضح اور صاف ہے کہ اس کا مقصود آخرت کے ساتھ دنیا کے تعلق کو اور صحیح تعلق کو واضح کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ موت کے بعد جو زندگی آنے والی ہے، جہاں انسان کو جانا ہے اور اُسی عالم سے وہ دنیا میں آیا ہے، ان دونوں کے درمیان میں ماں کے پیٹ اور بچپن کے گہوارے سے لے کر قبر تک پھیلے ہوئے دنیا کے جو چند لمحات ہیں، جو بظاہر تو بہت طویل محسوس ہوتے ہیں مگر درحقیقت بڑے مختصر ہیں' ان کی حقیقی نوعیت کیا ہے، اور ان کا تعلق آخرت کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔ یہ حدیث اس بات کو واضح کرتی ہے کہ دنیا تو دراصل منزلوں میں سے ایک منزل ہے

اور کسی اور طرف جانے کے لیے ایک راستہ ہے۔ دنیا نہ خود منزل ہے اور نہ مقصود ہے، اور نہ رہنے کی جگہ۔ یہ تو اجنبی جگہ ہے اور عابر کا راستہ ہی اصل مقصود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بعد کی تشریح سے واضح ہوتا ہے کہ انسان موت کے بعد جو زندگی آنے والی ہے اس کا سامان تیار کرے۔ جو اس کا اصل گھر ہے وہاں پہنچنے کے لیے تیاری کرے۔ اس سفر میں وہ تجارت کرے جس کا نفع موت کے بعد ظاہر ہو اور وہ کھیتی بوئے اور فصل لگائے جس کو وہ دنیا کے بعد آنے والی زندگی میں کاٹ سکے اور نفع حاصل کر سکے۔ ان الفاظ میں دنیا کے ساتھ جس روش کو ظاہر کیا گیا ہے، اگرچہ دو ہی الفاظ ہیں، لیکن فی الواقع دنیا اور آخرت کے بارے میں انسان جتنی افراط و تفریط میں مبتلا رہے ہیں ان سب کو یہ بالکل صحیح رخ پر ڈال دیتی ہے۔ یہ حدیث دنیا کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتی ہے اور دنیا کے بارے میں ان تصورات کی نفی بھی کرتی ہے جن میں آدمی پھنس گیا ہے، یعنی یہ کہ دنیا سے انسان کو کوئی سروکار نہیں ہے، دنیا سے آدمی جتنا دور رہے اچھا ہے، دنیا چھوڑ کر گوشے میں بیٹھ رہے تو یہ سب سے بہتر ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ دنیا بڑی اہم اور ضروری ہے لیکن یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

امام غزالیؒ نے اس کی بڑی اچھی مثال دی ہے کہ جیسے آدمی کو کعبے کی طرف جانا ہو اور وہ یہ راستہ طے کرنے کے لیے اونٹ پر سوار ہو تو اونٹ تو اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ اونٹ کے بغیر اس کا سفر مکمل نہیں ہو سکتا اور اپنی منزل کعبہ تک پہنچ نہیں سکتا، جو مقصود اور مطلوب ہے۔ اس کے بغیر اس کو اللہ کے گھر کی زیارت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اونٹ کی خبر گیری، نگہداشت، اونٹ کا کھانا پینا، اونٹ کا چارا، اونٹ کی صحت کی فکر، یہ اس کے لیے ضروری اور لازم ہے۔ لیکن اگر وہ کعبے کو بھول کر اونٹ کی خدمت میں ہی لگ جائے اور اس بات کو بھول جائے کہ اس اونٹ پر سوار ہو کر کہیں پہنچنا ہے بلکہ اس کی ساری دلچسپی اور توجہ کا مرکز صرف اونٹ بن جائے تو وہ دراصل اپنی منزل کھوٹی کر رہا ہے اور جس مقصد کے لیے اس کو اونٹ دیا گیا تھا اس مقصد کو ضائع کر رہا ہے۔

یہی مثال دنیا کی اور انسان کے جسم کی اور اس کی خواہشات کی اور ان ترغیبات اور

لذتوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر رکھ دی ہیں۔ اس کا جسم اور بدن، اس دنیا کی ساری ترغیبات، وہ لذتیں جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر رکھ دی ہیں، وہ ترغیبات جو انسان کے نفس کے اندر اتار دی گئی ہیں، یہ سب کی سب اس سفر کو طے کرنے کے لیے ضروری ہیں جو اس کو اللہ کی طرف کرنا ہے۔ مال و دولت، اولاد اور بیوی بچے، کھیتی باڑی، کارخانے اور کاروبار و تجارت اور مکان، ان سب کی طرف اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں ترغیب رکھی ہے۔ اگر دنیا کا سفر اس کو طے کرنا ہے تو اس آزمائش سے گزر کر ہی وہ آخرت کو حاصل کر سکتا ہے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح ہوتا جن میں دنیا کی کوئی حس، کوئی لالچ، کوئی ترغیب نہ ہوتی، جن میں دنیا کی چیزوں کو حاصل کرنے کا کوئی شوق نہ ہوتا تو پھر وہ کسی آزمائش میں مبتلا نہ ہوتا۔ جب آزمائش میں مبتلا نہ ہوتا تو اس اجر کا مستحق نہ ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے آخرت میں رکھا ہے۔ یہ آزمائشیں اور ترغیبات دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خواہش کو آدمی کے ساتھ لگایا ہے۔ اگر یہ خواہش نہ ہوتی تو کوئی آدمی دنیا کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوتا، نہ خاندان بنانے کے لیے تیار ہوتا، نہ بچوں کی پرورش کرنے کے لیے تیار ہوتا، نہ نکاح و طلاق کے جھمیلوں میں پڑنے کے لیے تیار ہوتا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ کاروبار کرتا، اپنے لیے مکان بناتا، تہذیب و تمدّن کو ترقی دیتا۔ اس کو اس میں سے کسی کام کی ضرورت نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دلوں میں اس کی جو لالچ اور ترغیب رکھ دی ہے وہی اس کو مجبور کرتی ہے اور اس راہ پر لے کر جاتی ہے کہ وہ دنیا کو آباد رکھے، دنیا کے لیے کام کرے اور اس سے آخرت کی تیاری کرے۔

اس سے یہ بات بھی صاف اور ظاہر ہوگئی کہ دنیا تو اجنبی ہے لیکن وطن اور اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے۔ دنیا تو ایک سفر کا راستہ ہے جہاں آدمی مسافر ہے۔ منزل تو اللہ کا گھر ہے جہاں اس کو پہنچنا ہے۔ آدمی کا اپنے گھر سے دل کا تعلق ہوتا ہے۔ آدمی کسی اجنبی جگہ پہنچ جائے تو اس کا دل اپنے گھر میں اٹکا رہتا ہے۔ کہیں سفر پر نکل جائے، سفر خواہ کسی مقصد کے لیے بھی ہو، خواہ وہ تفریح کے لیے ہو یا کاروبار کے لیے، حصولِ علم کے لیے ہو یا رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے یا کوئی اور مقاصد ہوں لیکن آدمی اگر اپنے گھر سے نکل کر گیا ہے اور گھر کی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور گھر کے ساتھ اس کو محبت ہے اور گھر کی لذّت سے وہ آشنا ہے تو وہ

جہاں بھی جائے گا، جس مقصد سے بھی جائے گا گھر کے ساتھ اس کا دل اٹکا رہے گا۔ جب وہ سفر پر جائے گا تو اس کام کو پورا کرنے کی کوشش بھی کرے گا جس کے لیے اتنا سفر اختیار کیا ہے یعنی گھر میں دل کے اٹکنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سفر کے مقصد کو ضائع کر دے۔ اسے چاہیے کہ وہ اس سفر کے مقصد کو حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ چنانچہ سفر کے دوران دل کے گھر میں اٹکے ہونے کے باوجود اس کی ساری کی ساری محنت اور توجہ اس مقصد کے اوپر رہے گی جو اس کو زندگی میں حاصل کرنا ہے۔ اگر اس نے وہ تجارت نہ کی جس کے لیے سفر پر گیا تھا تو وہ اپنے منافع گھر نہیں بھیج سکتا اور جس گھر کے ساتھ اس کو محبت ہے' اس کی کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

سفر کا استعارا اور تشبیہ اپنی جگہ پر خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اگرچہ دل تو وطن کے اندر اٹکا رہنا چاہیے، لیکن وہ کام پورا کرنا چاہیے جس کے لیے سفر کو اختیار کیا گیا ہے۔ مسافر کے لیے بھی اور اجنبی آدمی کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس کام میں لگا رہے جو سفر سے اس کا مقصود ہے۔ لیکن اس سے وہ اتنا ہی تعلق رکھے جتنا اس کام کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ مسافر کی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے سفر پر گیا ہے، جلدی جلدی اپنے کام کو نبٹائے، اور کام کو نبٹانے کے بعد اپنے گھر کی طرف رخ کرے۔ وہ جہاں جاتا ہے وہیں کا ہو کر نہیں رہ جاتا۔ جس طرح اجنبی کسی مقصد کے لیے دیارِ غیر میں جا کر رہتا ہے تو اس دیارِ غیر سے جتنا تعلق ضروری ہے' اتنا ہی تعلق وہ اس سے رکھتا ہے' وہ بھی اسی طرح رکھے۔ یہ تعلق اگر زیادہ ہوگا تو اس کے اس مقصد کو نقصان پہنچائے گا اور اگر تعلق کم ہوگا تو بھی اس کے مقصد کو نقصان پہنچائے گا۔ اس لیے توازن کا راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دیارِ غیر کے سفر سے وہ تو حاصل کرے جس کے لیے اس نے سفر کیا ہے لیکن اس سے زیادہ حاصل کرنے میں نہ لگ جائے جس سے سفر کا اصل مقصد اور منزل کھوٹی ہونے لگے۔

اس حدیث کے اندر وہ تعلیم آ گئی جو بہت ساری احادیث کے اندر مختلف الفاظ میں مختلف انداز میں دی گئی ہے' مثلاً آدمی کا دل دنیا کے تیز دھارے پر ہے، اور دنیا کے عمل اس کے اوپر آتے ہیں: لکھنے کے، پڑھنے کے، کاروبار کے، رشتہ داروں کے ساتھ تعلق رکھنے کے،

اولاد کی تربیت کے، خاندان کو قائم کرنے کے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا عمل تو اس کے اندر رہے لیکن اس کا دل اللہ کے لیے دنیا سے فارغ رہے۔

اس میں قناعت کی تعلیم بھی آتی ہے۔ آدمی سفر پر ہے' اس لیے وہ قانع بھی ہو گا اور زاہد بھی۔ زاہد وہ ہے جس کو کم سے کم طلب ہو اور قناعت یہ ہے کہ آدمی کم سے کم کے اوپر راضی اور خوش رہے۔ جو اس کو مل جائے اس کے لیے کافی ہو۔ اگر آدمی اپنے آپ کو مسافر اور اجنبی سمجھ کر دنیا کی زندگی بسر کرے تو یہ صفات اس کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ جو آدمی مسافر ہوتا ہے یا کسی اجنبی دیار میں جا کر بستا ہے تو نہ تو وہ سفر اس طرح کرتا ہے نہ اجنبی دیار میں قیام اس طرح کرتا ہے کہ جیسے اسے ہمیشہ وہاں رہنا ہے۔ نہ مال اس طرح جمع کرتا ہے نہ کاروبار اس طرح کرتا ہے جیسے اسے ہمیشہ یہاں پر رہنا ہے۔ جو مال کو اس طرح جمع کرے' گن گن کر رکھے کہ جیسے یہ تو ہمیشہ رہے گا اور اس کے بعد بھی رہے گا، ہمیشہ کام آتا رہے گا، اور دنیا سے اس طرح دلچسپی لے کہ یہاں سے جانا ہی نہیں ہے تو یہ مسافر کی روش کے خلاف ہے۔ جو آدمی اجنبی ہو، دیارِ غیر میں آ کر بس گیا ہو یا وہاں رہنے کے لیے آیا ہو' اس کا طریقہ یہ نہیں ہوتا۔

جو مسافر اور اجنبی ہو گا اس کو اپنے وطن سے انس و محبت رہے گی۔ لیکن ان چیزوں سے بھی جس حد تک اپنے سفر کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہو گا' اس کو اس حد تک تعلق رکھنا ہو گا۔ اس لیے کسی بھی جگہ پر مطالبہ نہیں آتا کہ آدمی محبت کو صرف اللہ کے لیے خالص کر دے۔ بندگی کو اللہ کے لیے خالص کرے، نیت کو اللہ کے لیے خالص کرے، نفع نقصان کی امید کو اللہ کے لیے خالص کرے لیکن دل کو اللہ کے سوا محبت کے ہر تعلق سے خالی کرے تو پھر وہ دنیا کے اندر وہ مقاصد پورے نہیں کر سکتا جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو یہاں بھیجا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق دنیا کی ان چیزوں سے رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں بخشی ہیں اور عطا کی ہیں۔

جس جگہ رہنے کا انسان نہیں سوچے گا وہاں اس کو یہ خیال بھی لگا رہے گا کہ جلدی سے جلدی اپنا کام سمیٹو اور واپس جاؤ۔ اس پر یہ خوف طاری ہو سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کمایا ہے' واپس جانے کے بعد کم نہ ہو جائے۔ واپس جانے میں اس کو جو جسمانی تکلیف پہنچے گی،

اس کا خوف بھی اس پر طاری ہوسکتا ہے۔ آدمی مرنے سے اس لیے ڈرتا ہو کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے جو میں موت کی صورت میں اللہ کے پاس لے کر جاؤں تو یہ خوف تو دین کی نعمت ہے۔ آدمی پر یہ خوف طاری ہو کہ موت سے اس کو تکلیف ہوگی، نزع کا عالم ہوگا، جسمانی طور پر مصیبت ہوگی تو یہ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ لیکن موت سے آدمی اس لیے ڈرے کہ دنیا چھوٹ جائے گی تو یہ خوف ایمان اور اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتا۔ موت آتی ہے' انسان اپنے وطن کی طرف واپس لوٹتا ہے۔ اس کا سفر اپنی منزل کے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ مسافر جب گھر واپس جانے کا سوچتا ہے تو اس کو اس سے ڈر اور خوف نہیں لگتا۔ اس کو سفر کی مشقت اور صعوبت کی تکلیف ہوسکتی ہے، یہ پریشانی ہوسکتی ہے کہ اس نے اتنا نہیں کمایا جتنا کمانے کے لیے وہ گھر سے نکل کر آیا تھا۔ لیکن یہ خیال کہ اب سفر سے تو واسطہ چھوٹ جائے گا اور اب مجھے واپس اپنے وطن جانا پڑے گا' اس سے اس پر کراہت، ناپسندیدگی یا خوف کے تاثرات طاری نہیں ہوسکتے۔

اس مثال اور تشبیہ سے موت کے بارے میں جو تعلق اور رویّہ ہونا چاہیے' اس کا پتا چلتا ہے۔ اگر ہم عَابِرُ سَبِیْلٍ کے معنی یہ لیں کہ آدمی مسلسل سفر کرتا رہے تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آدمی دنیا کے اندر مسلسل سفر کے اندر ہے اور بغیر ٹھہرے اور ستائے، راہ حق پر اپنے سفر کو جاری رکھے۔ زندگی اگر حق کی راہ پر لگ جائے تو اس میں کوئی ایسا وقت اور مرحلہ نہیں ہے کہ آدمی کمر کھول کر بیٹھ جائے اور ستانے کا سوچے۔ زندگی تو مسلسل رواں دواں ہے اور آدمی نے جو وقت ستانے کے اندر ضائع کیا تو وہ وقت اس کا ضائع ہوگیا۔ اگر ہم عَابِرُ سَبِیْلٍ سے وہ مسافر مراد لیں جو مسلسل سفر کر رہا ہے، کہیں قیام نہیں کرتا، کوئی سکونت نہیں ہے، منزل نہیں ہے تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس زندگی کے اندر جس مقصد کے لیے وہ سفر کر رہا ہے' اس میں ڈھیلا پڑنے کا اور ستانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سستی، کاہلی اور لغزش فطری تقاضے کے طور پر آتی ہے۔ اس کی زندگی میں دنیا کے امتحان کے طور پر آتی ہے۔ وہ اپنی لغزشوں، کوتاہیوں اور سستیوں اور اپنے سارے گناہوں سے توبہ اور استغفار کر کے ان کی تلافی کرسکتا ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے سے یہ سوچتا ہے کہ میں نے اتنے دن نیکی کرلی' اب میں ذرا ستالوں کچھ اور کام کرلوں تو یہ اس مسافر کا ایجنڈا نہیں ہوسکتا جو مسلسل اللہ کے راستے پر سفر کر رہا ہو۔

مسافر راستے کے خطرات سے بھی آگاہ رہتا ہے اور ان کا اندیشہ بھی اس کو لگا رہتا ہے۔ جس وقت یہ حدیث بیان کی جارہی تھی اُس وقت بھی، اور آج بھی، سفر کوئی اتنا محفوظ بھی نہیں ہے کہ جس میں آدمی یہ سمجھے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس زمانے میں تو جانوروں کا سفر تھا، پیدل سفر تھا۔ راستے میں رہزنی کے بھی خطرات تھے، پانی نہیں ملے گا، غذا نہیں ملے گی، لمبی لمبی مسافتیں تھیں۔ آج ہوائی جہاز کریش ہوسکتا ہے، ٹرین کے اندر بم پھٹ سکتا ہے، موٹر گاڑی بھی حادثوں کا شکار ہوسکتی ہے۔ جو آدمی دنیا میں اس طرح رہے کہ گویا وہ مسافر ہے یا کسی اجنبی گھر میں ہے تو اجنبی گھر میں ہلاکت کے جو خطرات اور اندیشے ہوسکتے ہیں وہ اس کے دل کو لاحق رہیں گے۔ اس سے تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ ایک آدمی ایک اندیشے کے اندر مبتلا رہتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی چیز نہ آجائے کہ جو پورے سفر کو ہی کھوٹا کردے اور ہلاکت کا راستہ اس کے لیے کھل جائے تو پھر اگر وہ مسافر ہے تو وہ اس کی بھی فکر کرے گا کہ وہ زادِ راہ حاصل کرے جو اس سفر کو بھی کامیابی کے ساتھ طے کرائے، اور سفر کے بعد جو دنیا آنے والی ہے اس کے اندر بھی وہ کامیاب ہو۔

ایک چھوٹی سی مثال سے جو نبی کریمؐ نے دی کہ دنیا کے اندر اس طرح رہو گویا کہ تم غریب ہو، گویا تم راستہ چلنے والے مسافر ہو اس سے دنیا کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور دنیا اور آخرت کا تعلق بھی کھل کر سامنے آگیا۔ جو آدمی بھی دنیا کے اندر مسافر کی طرح رہے، اس کو زندگی کس طرح گزارنی چاہیے، یہ بات بھی کھل کر اور واضح ہوکر سامنے آگئی۔

امام غزالیؒ نے اسی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے احیاء العلوم میں ایک بڑی اچھی مثال دی ہے اور دنیا کے سفر میں جو مختلف معاملے لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں ان کو انھوں نے کھول کر بیان فرمایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ بہت سارے مسافر کسی سمندر میں ایک کشتی میں سفر کر رہے ہوں۔ راستے میں کہیں پر جزیرہ آئے اور ملاح کشتی کو روک کر مسافروں سے کہے کہ یہاں پر ہم رک رہے ہیں۔ آپ لوگ جزیرے پر اتر جائیں اور پانی، غذا، کھانے پینے اور حاجت کی اپنی ضروریات پوری کرلیں لیکن جلدی واپس آجائیں۔ ہم کسی کا انتظار نہیں کریں گے۔ جیسے ہی وقت ہوگا کشتی روانہ ہوجائے گی۔

اب ایک گروہ تو ایسا ہے کہ اس نے جزیرے میں اتنے ہی کام سے دلچسپی رکھی جتنا کام وہاں کرنا ضروری تھا اور اپنے وقت پر واپس آ گیا۔ اس کو کشتی میں بڑی فراخ اور اچھی جگہ ملی اور وہ آرام کے ساتھ کشتی میں آ کر بیٹھ گیا۔ باقی لوگوں میں سے ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو اپنی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ جزیرے کے اندر جو پھل پھول تھے، حُسن و جمال تھا، قیمتی پتھر تھے، دلکش نظارے تھے ان کے اندر مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب ملاح نے سیٹی بجا دی کہ کشتی روانہ ہونے والی ہے تو وہ بھاگ کر پہنچے۔ ان کو کشتی پر جگہ تو مل گئی لیکن خراب اور تنگ جگہ ملی۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوا جنھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ یہاں پر جو ہیرے جواہرات ہیں، بہت اچھے اچھے موتی ہیں، پھل پھول ہیں، اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کا بوجھ بھی اپنے ساتھ لا دلیں۔ وہ جمع کرتے گئے یہاں تک کہ جب ملاح نے سیٹی بجائی کہ اب کشتی روانہ ہونے والی ہے تو جو کچھ بھی بوجھ ان کے پاس تھا' وہ لے کر کشتی کے اندر پہنچے۔ ان کو اور بھی خراب جگہ ملی۔ بڑی مشکل سے وہ ہانپتے کانپتے پہنچے۔ کشتی پہلے ہی سے بھر چکی تھی۔ اس کے اندر وہ اپنے سامان کی جگہ کہاں سے نکالتے۔ بڑی مشکل سے اُن کو جگہ ملی۔ دو دن کے بعد انھوں نے دیکھا کہ جتنا سامان وہ جزیرے سے جمع کر کے لائے تھے، اس کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا، وہ سڑنا شروع ہو گیا ہے اور اس میں سے بدبو آنا شروع ہو گئی ہے۔ اب وہ ان کی گردن اور پیٹھ کے اوپر لدا ہوا ہے، نہ وہ اس کو پھینک سکتے ہیں نہ اُس سے بھاگ سکتے ہیں۔ ان کو کشتی کا سارا سفر اسی کے ساتھ طے کرنا ہے۔ اس سے اگلا گروہ ان لوگوں کا ہوا جنھوں نے جزیرے سے سامان جمع کرنے میں اور وہاں کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں اتنی دیر لگائی کہ کشتی روانہ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اسی سفر میں اسی اجنبی گھر میں پھنس کر رہ گئے اور بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔ کوئی بھوک سے، کوئی پیاس سے' کوئی درندوں کے کھا جانے سے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اسی طرح کا سفر ہے۔ کشتی بھی ضروری ہے، جزیرے پر اترنا بھی ضروری ہے، اس کی ایک مہلت اور مدت بھی مقرر ہے، اس کے بغیر سفر طے نہیں ہو سکتا۔ اپنی ضروریات بھی پوری کرنی ہیں۔ لیکن جو ان ضروریات کے اندر اتنا مگن ہوا کہ اُس ندا کو اور اُس پکار کو بھی فراموش کر دیا جو کشتی والے کی طرف سے بلند ہو رہی تھی' اُس کے حصے

میں نہ سفر آیا، نہ منزل آئی۔ جو کچھ آیا وہ ذلت، ملامت اور حسرت کا بوجھ تھا جو وہ لاد کر لے چلا۔

یہی مثال دنیا کے سفر کی ہے۔ جو اس بات کے لیے تیار رہتا ہے، وہ اپنی ضروریات جمع کرتا رہتا ہے اور صرف ضرورت پوری کرتا ہے اور جیسے ہی بلایا جاتا ہے وہ جانے کے لیے تیار ملتا ہے۔ وہ تو سب سے اچھی جگہ پاتا ہے اور بڑی کشادگی کے ساتھ، بڑے آرام کے ساتھ اور بڑی فراخی کے ساتھ اس کا آگے کا سفر طے ہوتا ہے۔ اپنے اپنے برتاؤ کے مطابق کچھ تکلیف اٹھاتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اُس سے کم درجے میں ہوتے ہیں اور بعض لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ بات ہے جس کی حضرت ابنِ عمرؓ نے اس حدیث میں اپنے الفاظ میں تشریح کی ہے کہ ”زندگی میں سے وہ کچھ حاصل کر لو جو موت کی آمد سے پہلے تم جمع کر سکتے ہو“۔ ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ”اپنے آپ کو اصحابِ قبر میں سے شمار کرو، اس طرح دنیا کی زندگی بسر کرو“۔ پہلی بات کا مطلب تو یہ ہے کہ موت کا آنا یقینی ہے لیکن موت کا وقت غیر یقینی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون سی صبح آخری صبح ہو گی اور کون سی شام آخری شام ہو گی۔ اس لیے آدمی صبح شام اس طرح گزارے کہ اگلی صبح شاید نہ آئے اور اگلی شام شاید نہ آئے۔

جب اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا معاملہ ہو، دین کی راہ پر چلنے کا معاملہ ہو، آخرت کے لیے سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کا معاملہ ہو تو یہ بات یاد رہے اور دنیا کو بھی اس لیے چلائے اور حاصل کرے کہ وہ اس سے آخرت کو جمع کرے، دنیا کے معاملات کو اس طرح کرے کہ ان کو ابھی مکمل کر کے پورا کرنا ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ بعد میں اس کا وقت ملے گا بھی یا نہیں۔ لہٰذا ہمیشہ تیاری کے عالم میں رہنا کہ جس وقت بھی بگل بج جائے اور موت کا فرشتہ پکارے اور قریب آ جائے کہ چلو اور ہاتھ پکڑے کہ اب آخری سفر کا وقت آ گیا تو آدمی تیار ملے۔ وہ وقت کب آئے گا؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آج کے بعد کل کی صبح آئے گی یا نہیں آئے گی اور آج کی شام کے بعد کل کی شام آئے گی یا نہیں آئے گی۔ اس کے معنی ہیں کہ ہر وقت تیاری میں لگے رہو۔ کسی کام کو اس لیے مت ٹالو کہ کل کر لیں گے، پرسوں کر لیں گے، اس لیے کہ نہ کل کا اعتبار ہے نہ پرسوں کا اعتبار ہے، نہ صبح کا اعتبار

ہے، نہ شام کا اعتبار ہے۔ جو گھڑی اس وقت ہاتھ میں ہے بس اُسی گھڑی کا اعتبار ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور قول امام بخاریؒ نے حضرت علیؓ کا نقل کیا ہے کہ ''آدمی کا حال تو یہ ہے کہ دنیا تو اس کے پیچھے بھاگی جارہی ہے اور آخرت اس کے سامنے سے آرہی ہے۔ تم میں سے کچھ لوگ ''ابناء الدنیا'' دنیا کے بیٹے ہیں اور کچھ لوگ ''ابناء الآخرت''، آخرت کے بیٹے ہیں۔ تو تم ''ابناء الآخرت'' بنو، ''ابناء الدنیا'' مت بنو۔''

بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو زندگی گزر رہی ہے' بھاگتی چلی جارہی ہے، آدمی اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اور جو زندگی آگے استقبال کے لیے، خیر مقدم کے لیے اپنی انواع واقسام کی نعمتوں اور بادشاہتوں کے ساتھ موجود ہے، اس سے وہ منہ موڑ رہا ہے۔ دنیا اُس سے منہ موڑ رہی ہے اور وہ دنیا کا رخ کیے ہوئے ہے اور آخرت اس کی طرف رخ کیے ہوئے ہے اور وہ آخرت سے منہ موڑے ہوئے ہے۔ چاہیے کہ آدمی ہر وقت اس زندگی کی تیاری میں رہے جو سامنے آنے والی ہے۔

پھر فرمایا کہ صحت کے وقت وہ کام کرلو جو مریض ہونے سے پہلے کرنا ضروری ہیں۔ آخرت کا زادِ راہ جمع کرنے کے لیے صحت کے زمانے کو غنیمت جانو۔ اس لیے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کب وہ بیمار ہو جائے گا۔ جب تک تم کو اللہ تعالیٰ نے صحت مند رکھا ہو، آنکھ دیکھ رہی ہے، کان سن رہے ہیں، ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، جسم چلتا پھرتا ہے، کوئی بیماری لاحق نہیں ہے، آدمی بستر کے اوپر پڑا ہوا نہیں ہے، صحت کے اس ایک ایک لمحے کو آخرت کا سرمایہ جمع کرنے کے لیے، آخرت کا کاروبار کرنے کے لیے، آخرت کی فصل بونے کے لیے غنیمت جانو۔ پھر اس بات کو اور پھیلا کر بیان فرمایا، کہ بیماری تو پھر بھی آئے گی اور چلی جائے گی اور آدمی بیمار بھی ہوتا ہے اور صحت مند بھی، لیکن جب موت کا پردہ گر جائے گا تو پھر اس کے بعد عمل کی کوئی مہلت نہیں ہوگی۔

حضرت علیؓ کے اس قول میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ آج کا دن عمل کا موقع ہے، لیکن آج کوئی حساب نہیں ہے۔ اور کل جو آنے والا ہے، اس دن کوئی عمل نہیں ہے، لیکن حساب ہے۔ تو آج کے دن تو کوئی حساب نہیں ہو رہا ہے۔ یہ عمل کی مہلت ہے۔ دنیا کی زندگی

میں عمل کی اِس گھڑی میں وہ کام کرلو جس کا کل حساب دینا ہے کہ کل یہ مہلت نہیں ملے گی۔ موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرو اور بیماری سے پہلے صحت کا جو وقت ہے اس میں موت کے لیے سرمایہ جمع کرو۔

صحت کے وقت میں مرض کے لیے کچھ کر لینے کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی طرف بعض احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے، کہ جب آدمی بیمار پڑتا ہے تو جتنے بھی اعمال وہ صحت کی حالت میں کیا کرتا تھا اور بیماری میں نہیں کرسکتا' اُن سارے اعمال کا ثواب اس کے اعمال نامے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ بات ایک حدیث میں نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں سے بے شمار احادیث میں بیان کی گئی ہے کہ اگر آدمی نیک عمل کرتا ہو، نیک عمل کی نیت رکھتا ہو اور اسے کسی ظلم، جبر یا بیماری یا عذر کی وجہ سے روک دیا جائے تو اس کو پورا پورا ثواب ملتا رہتا ہے۔ جو آدمی صحت کے عالم میں نیک اعمال کرتا رہتا ہے تو بیماری کی حالت میں اس کو اُن سارے اعمال کا ثواب ملتا رہے گا۔ نمازی صحت کی حالت میں مسجد جاتا ہے، نماز جماعت سے ادا کرتا ہے۔ بیماری میں اس کو جماعت نہیں ملے تب بھی جماعت کا پورا ثواب ملے گا۔ صحت کی حالت میں وہ کماتا ہے، اللہ کی راہ میں دونوں ہاتھوں سے خرچ کرتا ہے۔ بیماری کی حالت میں نہیں کما سکتا تو جو اُس نے صحت کی حالت میں خرچ کیا ہے' اس کا پورا اجر و ثواب اس کو بیماری میں بھی ملے گا۔ صحت کی حالت میں وہ بندوں کی خدمت کرتا ہے، بیماروں کی عیادت کرتا ہے، غریبوں کو کھانا کھلاتا ہے، اگر بیماری کی حالت میں وہ یہ کام نہیں کرسکتا، تب بھی اس کو پورا ثواب ملے گا۔ صحت میں وہ چیز جمع کرلو جو بیماری میں کام آئے۔ اُس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ بیمار ہونے سے پہلے صحت کو غنیمت جانو۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ بیماری میں بھی تم اُن اعمال کا ثواب پاؤ گے جو تم صحت کے زمانے میں کرتے تھے۔

یہ حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی گئی ہے صحیح بخاری میں، ترمذی میں، نسائی میں اور مسند احمد بن حنبل میں روایت کی گئی ہے۔ مختصر روایت ہے کہ دنیا میں اجنبی کی طرح، یا مسافر کی طرح رہو۔ اس کی تشریح میں حضور اکرمؐ کے بعض ارشادات کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نقل کیا ہے، وہ یہ ہیں کہ ہر وقت تیاری کرو، شام ہو جائے تو نیک کام کو صبح پر نہ ٹالو،

صبح ہو جائے اور کوئی نیک کام کرنا ہے، کسی کا حق ادا کرنا ہے، کسی کی تلافی کرنا ہے، تو شام کے انتظار میں مت ٹالو۔ صحت کے وقت کو غنیمت جانو اس سے پہلے کہ بیمار ہو۔ زندگی کے جو لمحات بھی اللہ تعالیٰ نے دیے ہیں، نہ معلوم کب ختم ہو جائیں۔ اس میں سے ایک ایک لمحے کو اللہ کی راہ کو طے کرنے کے لیے اور اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے غنیمت جانو۔

غلطیوں کو معاف کرنا

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِشِرَارِکُمْ؟ قَالُوْا بَلٰی اِنْ شِئْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ: اِنَّ شِرَارَکُمُ الَّذِیْ یَنْزِلُ وَحْدَهٗ وَیَجْلِدُ عَبْدَهٗ وَیَمْنَعُ رِفْدَهٗ۔ قَالَ: اَفَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِکَ؟ قَالُوْا بَلٰی اِنْ شِئْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: مَنْ یُّبْغِضُ النَّاسَ وَیُبْغِضُوْنَهٗ قَالَ: اَفَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِکَ؟ قَالُوْا بَلٰی اِنْ شِئْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ. قَالَ: اَلَّذِیْ لَا یَقِیْلُوْنَ عَثْرَةً وَّلَا یَقْبَلُوْنَ مَعْذِرَةً وَلَا یَغْفِرُوْنَ ذَنْبًا۔ قَالَ: اَفَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِکَ؟ قَالُوْا بَلٰی اِنْ شِئْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ: مَنْ لَا یُرْجٰی خَیْرُهٗ وَلَا یُؤْمَنُ شَرُّهٗ.

(بحواله مجمع الزوائد کتاب البرّ والصلة باب فیمن یرجیٰ خیرهٗ وخیر الناس وشرارهم جلد۸ ص ۱۸۳۔ طبع دار الکتاب بیروت طبع دوم ۱۹۶۷ء)

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ تم میں برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جیسا آپؐ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں برے وہ لوگ ہیں جو خدمت کریں تو صرف اپنی کریں، اور جو ان کا خادم اور غلام ہو اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کریں۔ اور جو کچھ وہ دے سکتے ہیں اس کو روک کر رکھیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو نہ بتاؤں اس سے بھی زیادہ برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے کہا: ہاں، ضرور اگر آپ چاہیں اے اللہ کے رسولؐ۔ آپؐ نے فرمایا: وہ آدمی جو لوگوں کو ناپسند کریں اور لوگ ان کو ناپسند کریں، جن کو لوگوں سے کراہت آئے اور لوگوں کو ان سے کراہت آئے، جو لوگوں سے دشمنی رکھیں اور لوگ بھی ان کو دشمن سمجھیں اور ان سے دشمنی رکھیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں نہ بتاؤں کہ اس سے بھی زیادہ برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ چاہیں تو ضرور بتائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو کسی دوسرے کی خطا سے درگزر نہیں

کرتے، کوئی معذرت یا عذر قبول نہیں کرتے اور کسی کی غلطی کو معاف نہیں کرتے اور اس پر پردہ نہیں ڈالتے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بھی زیادہ برا آدمی کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ضرور اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: جس سے بھلائی کی امید نہ رکھی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ ہوں۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حسنِ اخلاق کی تعلیم ہم کو دی ہے، اس میں امانت، پاس عہد، وعدہ نبھانا اور راہِ خدا میں دینا نمایاں ہیں۔ عطا (دینا) کا مطلب اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا ہے اس کو فراخی وفیاضی اور سخاوت کے ساتھ، اللہ کی امانت سمجھ کے دوسروں کو دینا اور دوسروں پر خرچ کرنا ہے۔ تعلیمات نبویؐ کے مطابق دینے اور خرچ کرنے سے مراد صرف مال ودولت نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں بندوں کی کسی بھی طرح سے مدد کرنا، سواری پر سوار کرا دینا، سامان اٹھا کر رکھ دینا، ڈول میں پانی ڈال دینا، راستے سے پتھر یا کوئی رکاوٹ دور کر دینا، اچھی بات کہنا، یہاں تک کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے کو ضرر، تکلیف یا نقصان پہنچانے سے روکنا، یہ سب بھی دینا، خرچ کرنا یا صدقے کی تعریف میں آتے ہیں۔

سخاوت کا ایک پہلو اور ہے اور وہ ہے معاف کر دینا۔ بظاہر معاف کر دینے کا تعلق مال دینے سے نہیں ہے لیکن یہ دل کی کشادگی، فراخی اور سخاوت ہی ہے جو ہمیں اس مقام تک پہنچاتی ہے کہ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، اللہ کا دیا ہوا ہے، اسے اپنے تک محدود نہ رکھیں بلکہ دوسروں کو بھی دیں۔ اسی فیاضی، فراخی اور سخاوت کا تقاضا ہے کہ اگر کسی سے کوئی قصور سرزد ہو جائے، یا کسی سے کوئی تکلیف پہنچے، یا کسی کو آدمی قرض دے تو وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معافی، سہولت اور آسانی کی روش اختیار کرے۔

یہ حدیث فیاضی، فراخ دلی اور قصور معاف کر دینے کے مضمون پر مشتمل ہے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے مضامین مختلف احادیث کے اندر، تقریباً حدیث کی تمام کتابوں میں، مختلف روایات میں پائے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ تم میں برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جیسا آپؐ

پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں برے وہ لوگ ہیں جو خدمت کریں تو صرف اپنی کریں' اور جو ان کا خادم اور غلام ہو' اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کریں۔ اور جو کچھ وہ دے سکتے ہیں اس کو روک کر رکھیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو نہ بتاؤں اس سے بھی زیادہ برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے کہا: ہاں' ضرور اگر آپ چاہیں اے اللہ کے رسولؐ۔ آپؐ نے فرمایا: وہ آدمی جو لوگوں کو ناپسند کریں اور لوگ ان کو ناپسند کریں' جن کو لوگوں سے کراہت آئے اور لوگوں کو ان سے کراہت آئے' جو لوگوں سے دشمنی رکھیں اور لوگ بھی ان کو دشمن سمجھیں اور ان سے دشمنی رکھیں۔

پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں نہ بتاؤں کہ اس سے بھی زیادہ برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ چاہیں تو ضرور بتائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو کسی دوسرے کی خطا سے درگزر نہیں کرتے' کوئی معذرت یا عذر قبول نہیں کرتے اور کسی کی غلطی کو معاف نہیں کرتے اور اس پر پردہ نہیں ڈالتے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بھی زیادہ برا آدمی کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ضرور اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: جس سے بھلائی کی امید نہ رکھی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ ہوں۔ (طبرانی)

یہ بڑی جامع حدیث ہے۔ اس کا بنیادی مضمون ایک ہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ فیاضی کا سلوک کرے' خود غرض نہ ہو' صرف اپنے لیے ہی نہ جیے' بلکہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کو روکنے' جمع کرنے اور گن گن کر رکھنے کے بجائے اللہ کی راہ میں دے۔ مال بھی دے' حسنِ سلوک سے بھی پیش آئے اور قصور بھی معاف کرے۔

آپؐ نے نہایت دلچسپ پیرائے میں اپنی بات کا آغاز کیا اور سوالیہ انداز میں صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ برے لوگ کون ہیں؟ پھر آپؐ نے وضاحت فرماتے ہوئے سب سے پہلے یہ بات فرمائی: اَلَّذِیْ یَنْزِلُ وَحْدَہٗ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ اترتا ہے تو اکیلا لیکن اترنا' مہمان ہونا بھی ہوتا ہے اور میزبانی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ عربی کا ایک محاورہ ہے: اَلَاتَنْزِلُ بِنَا' کیا آپ ہمارے مہمان نہیں ہوں گے' یا ہمارے پاس نہیں ٹھہریں گے' یا ہمارے پاس نہیں اتریں

گے۔ لہٰذا کسی کے پاس اترنا اس کا مہمان بننا ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا مال' اس کا کھانا پینا' اس کی اپنی توجہ' سب کچھ اپنی ہی خدمت کے لیے مختص ہوتے ہیں' اور وہ خود ہی اپنا مہمان بنا رہتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہی فکر لگی رہتی ہے کہ میں کیا کروں' کیا کماؤں' خود کیا کھاؤں اور بچوں کو کیا کھلاؤں۔ اس کے پیش نظر صرف اس کی اپنی ہی ذات ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے ایک شخص کے اپنے خادم یا ملازم سے' جو اس کے لیے کام کرتے ہیں' اس سے اس کے رویے کا ذکر فرمایا۔ یہاں عَبْـدَهٗ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو غلام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جب غلامی کا رواج نہ رہے تو یہ لفظ خادم کے لیے بھی استعمال ہوگا اور خادمین میں وہ بھی آئیں گے جو نوکر ہوں' وہ بھی جو دفتر میں ملازمت کرتے ہوں اور وہ بھی جو کارخانوں میں کام کرتے ہوں اور وہ بھی جو زیردست ہوں۔ یـجـلدُ کے معنی ہیں کہ جو ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے ہیں' مارتے بھی ہیں' برا بھلا بھی کہتے ہیں اور کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر سزا بھی دیتے ہیں۔ جو زیردست ہوں' ان کے ساتھ ان کا برتاؤ سختی درشتی اور مارنے پیٹنے کا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ برا معاملہ کرتے ہیں اور ان کو گالی دیتے' ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور پھٹکار دیتے ہیں۔ یہ ان کا وہ سلوک ہے جو وہ اپنے خادموں کے ساتھ یا جو زیردست ہوں ان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

وَیـمْـنَعُ رِفْدَهٗ اور اپنے عطایا اپنے دینے کو روک کر رکھتا ہے' اور جو اللہ نے مال دیا ہے' اس میں سخاوت اور فیاضی کے ساتھ دوسروں کا حصہ ادا نہیں کرتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حدیث ایک خاص ترتیب سے چلتی ہے۔ خودغرضی' دوسروں کے ساتھ برا سلوک' ان کو حقیر سمجھنا اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کو روک کے رکھنا' یہ بنیادی خامیاں ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے' لیکن جب یہ بڑھ جائیں تو برائیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں اور آدمی اور بُرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ کیا میں تمھیں اس سے بھی برے آدمی کے متعلق نہ بتاؤں؟ یہ آپؐ کی تعلیم کا ایک انداز تھا۔ یہ ایک انداز تعلیم و تربیت ہے کہ سوال کرنا' جواب دینا' لوگوں کو متوجہ کرنا' مختصر بات کرنا' بات کو دل میں اتار دینا اور ایسے انداز میں کہہ دینا کہ آدمی اس کو سمجھ بھی جائے' متاثر بھی ہو اور اس پر عمل کے لیے بھی آمادہ ہو جائے۔

اس سوال کے جواب میں صحابہ کرامؓ نے کہا کہ ضرور بتایئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ شخص جو لوگوں سے کراہیت رکھتا ہو'ان کو برا سمجھتا ہو اور لوگ بھی اس کو برا سمجھتے ہوں۔ جب آدمی لوگوں کا احترام نہ کرے' ان کی عزت نہ کرے' ان کی خدمت نہ کرے' ان سے محبت نہ کرے تو لوگ بھی اس سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ جب لوگوں سے دشمنی رکھی جائے تو لوگ بھی دشمنی رکھتے ہیں' خواہ یہ دشمنی آدمی اپنے قریبی لوگوں سے رکھے یا اپنے گھر والوں سے' اپنے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں سے رکھے یا اپنے محلے والوں سے۔ یہ رویہ خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی شخص دوسروں کی مدد سے اپنے آپ کو روک کر رکھے گا' جو لوگ بھی اس کے زیر دست آجائیں' ان کے ساتھ وہ برا سلوک کرے گا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ لوگوں کو ناپسند کرتا ہے تو لوگ بھی اس سے محبت نہیں کریں گے بلکہ اس سے دشمنی رکھیں گے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اس سے بھی بڑھ کر برے لوگ وہ ہوں گے جو کسی سے اگر کوئی خطا ہو جائے' یا کوئی ایسی بات کہہ دے جو ناگوار گزرے اور وہ شخص معافی طلب کرے اور عذر پیش کرے مگر اسے معاف نہ کیا جائے۔

غصے کو پی جانا اور معاف کر دینا اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا' دونوں صفات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اکثر احادیث میں ان کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے اور یہ مسلم کی روایت ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اللہ کی راہ میں صدقہ دینے سے کسی کا مال کم ہوتا ہو۔ مگر ہمیں تو یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر ہم نے مال دے دیا تو ہمارے پاس کیا رہے گا اور کیا بچے گا۔ مگر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا ہو اور اللہ نے اس کا مال کم کر دیا ہو۔ اسی طرح ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے کسی کو معاف کیا ہو اور اس کی عزت میں کمی آئی ہو بلکہ اللہ اس کی عزت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ درحقیقت معاف کرنے میں ناک اور انا کا سوال آڑے آجاتا ہے اور عزت پر حرف آنے لگتا ہے۔ آدمی یوں سوچنے لگتا ہے کہ میرے خلاف تو یہ یہ کچھ کہا گیا' اب اگر میں نے بدلہ نہیں لیا تو میری ناک کٹ جائے گی' میری آن پر حرف آجائے گا۔ حضورؐ نے اس بات کی نفی کی ہے اور فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ کی راہ میں مال دینے یا صدقہ کرنے سے مال میں کسی قسم کی کمی آتی

ہے' یا کسی کو معاف کر دینے سے کسی کی عزت میں فرق آتا ہے' بلکہ اللہ اس کی عزت میں بھی اضافہ کرتا ہے اور مال میں بھی۔ گویا یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ مال دو' مال میں اضافہ ہوگا' اور معاف کرو' تمھاری عزت میں اضافہ ہوگا۔ آدمی اگر تواضع اختیار کرے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پست رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند فرماتا ہے۔ جو معاف کرتا ہے' اس کی عزت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تینوں باتیں' یعنی معاف کر دینا' راہ خدا میں مال دینا اور تواضع اختیار کرنا' مسلم کی ایک حدیث میں ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

معافی کی بنیاد جہاں دل کی فراخی اور دل کی وسعت ہے' وہاں اللہ کی مغفرت کی توقع بھی ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر اس پہلو کو کھول کر بیان کیا گیا۔ وہاں اگر ایک طرف اللہ کی رضا کے لیے بھاگ دوڑ کرنے اور اس کی مغفرت طلب کرنے والوں کا ذکر آیا ہے اور ان کی ایک نمایاں صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ غصے کو پی جانے والے اور دوسروں کے قصور معاف کر دینے والے ہیں' تو دوسری طرف اگلی ہی آیت میں اس بات کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ بھی تمھارے گناہ معاف کر دے۔

ایک طرف تو انسان کی یہ روش ہے کہ دن میں ہزار گناہ کرتا ہے' صبح سے شام تک کتنی ناشکریاں اور ناقدریاں کرتا ہے' مگر اس کے بعد ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اللہ سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اسے معاف کر دے گا۔ دوسری طرف اگر کوئی انسان ایسا کام کر گزرے جو ناگوار ہو' جو مزاج پر گراں گزرے تو آدمی اس کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ **اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ۔** "کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھارے گناہ معاف فرمائے۔" لہٰذا جو آدمی اللہ کے سامنے عاجز' گنہ گار اور فقیر ہے اور اپنے گناہ معاف کروانے کے لیے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوتا ہے' وہ ان بندوں کو کیسے دھتکار سکتا ہے جو اس سے معافی کے درخواست گزار ہوں۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر بہت سی احادیث اور روایات میں معاف کرنے اور درگزر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو تم کو نہ دے اور محروم کرے اس کو دو' جو تم سے کٹے اس سے جڑو' جو تمھارے ساتھ زیادتی کرے اس کو معاف کر دو۔

مختلف احادیث میں ان تین صفات کے ساتھ اور بہت ساری چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ یہ صفات اخلاق میں سب سے زیادہ مکرم ہیں۔ اکرم الاخلاق یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ صفات موجود ہوں۔ پھر فرمایا کہ جو ایسا کرتا ہے اور ان صفات سے متصف ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی مغفرت بھی کرتا ہے اور اس کے درجات بھی بلند فرماتا ہے۔ وہاں وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں ملے گا اور وہ ہستی ان کی ضیافت کرے گی جو غفور اور رحیم ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کی یہ مختصر سی زندگی امن وسکون اور چین ومحبت کے ساتھ گزرے تو اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوسرے کے لیے وقف کردے، دوسروں کے لیے جیئے اور معافی کی روش اختیار کرے۔ قرآن مجید نے اس کے لیے یہی نسخہ پیش کیا ہے کہ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے" (حٰم السجدہ: ۳۴) گویا اگر کوئی برا سلوک کرے، برا بھلا کہے اور اس کے جواب میں آدمی صبر و حوصلے سے کام لیتے ہوئے بھلی روش ہی اپنائے تو دشمنی دوستی میں بدل جائے گی اور وہ جگری دوست بن جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ صبر تو یہ ہے کہ کوئی زیادتی کرے (برا سلوک کرے) تو آدمی اس پر صبر اختیار کرے اور برائی کا جواب بھلائی سے دے۔ دوسری بات یہ کہ اگر کوئی تکلیف پہنچائے تو آدمی اس کو معاف کردے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ زندگی کے اندر امن وسکون اور چین دے گا' اور دشمنوں کے دل نرم کردے گا اور ان کو بھی دوست بنادے گا۔

اس ضمن میں نبی کریمؐ کا اسوہ پیروی کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ کے وہ تمام دشمن جنھوں نے برسوں دشمنی کی' آپؐ کی جان کے درپے ہوئے، آپؐ کو آپ کے گھر سے نکالا' آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے' آپؐ کو پتھروں سے لہولہان کیا، آپؐ کے دندان مبارک شہید کیے، وہ سب آکر آپؐ کے غلام بن گئے۔ یہ آپؐ کی اسی روش کی وجہ سے تھا کہ آپؐ نے

برائی کا جواب بھلائی سے دیا اور غلطی کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا۔

مشہور واقعہ ہے کہ آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ یہ نبوت کا دسواں گیارھواں سال تھا اور مکہ کے تمام سہارے ختم ہو چکے تھے۔ حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکی تھیں۔ اہل مکہ میں اب کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اپنی اپنی جگہ لوگ فیصلہ کر چکے تھے یعنی جو مخالفت پر تھے وہ مخالفت پر تلے بیٹھے تھے، اور جن کو ایمان لانا تھا وہ ایمان لا چکے تھے۔ ایسے میں آپؐ طائف گئے کہ وہ ایک نئی سرزمین ہے، شاید وہاں کوئی دعوت کو قبول کر لے اور آپؐ کو وہاں کوئی ٹھکانہ میسّر آ جائے اور آپؐ وہاں رہ کر دعوت کا کام کر سکیں۔

طائف کے تینوں سرداروں نے آپؐ کو انتہائی حقارت اور ذلت آمیز سلوک کے ساتھ ٹھکرا دیا، برا بھلا بھی کہا اور نہ صرف یہ کہ مذاق اڑایا بلکہ آپؐ کے پیچھے بازاری لونڈے لگا دیئے جنھوں نے آپؐ کو پتھر مارنے شروع کر دیے۔ آپؐ کے جسم مبارک سے خون بہنے لگا۔ یہاں تک کہ خون آپؐ کے نعلین مبارک (جوتوں) میں جم گیا۔ تکلیف سے آپؐ نڈھال ہو گئے۔ ایک عیسائی غلام نے آپ کو باغ میں پناہ دی، آپؐ کے زخم دھوئے اور آپؐ کو انگور پیش کیے۔

روایات میں آتا ہے کہ اس کے بعد جب آپؐ آگے بڑھے تو ابر کا سایہ ہو گیا۔ آپؐ نے سر اٹھا کر دیکھا تو جبرئیل علیہ السلام تھے۔ انھوں نے کہا کہ آج آپؐ کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہے اور اس نے آپؐ کے لیے میرے ساتھ پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا ہے۔ آپؐ جو حکم دیں گے وہ آپؐ کی تعمیل کرے گا۔ پھر پہاڑوں کے فرشتے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ اگر آپؐ کہیں تو میں طائف کی وادی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں۔ بتایئے اتنی بڑی قوت کس کے پاس ہے۔ اگرچہ آپؐ کے پاس کوئی ایٹم بم، توپ و تفنگ اور بندوقیں تو نہیں تھیں لیکن فرشتہ آپؐ کے حکم کا منتظر تھا کہ جنھوں نے آپؐ کو پتھر مارے، خون بہایا، گالیاں دیں، دھتکارا، اور دعوت کو قبول نہیں کیا، اگر آپؐ حکم دیں تو دو پہاڑوں کے درمیان اس پوری بستی کو پیس ڈالے۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ شاید ان کی اولاد میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو میری دعوت کو قبول کر لیں۔ یہی وہ معافی کی روش تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک وقت آیا کہ طائف کے لوگ بھی ایمان لے آئے اور

پورا عرب آپؐ کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ نبی کریمؐ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان معاملات میں جہاں ہم معافی کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہاں بھی آپؐ نے عفو و درگزر کی روش اختیار کی۔

صلح حدیبیہ کے بعد کفار مکہ نے جب اس معاہدے کی خلاف ورزی کی تو آپؐ نے خاموشی کے ساتھ مکہ کو فتح کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ آپؐ کا خیال تھا کہ مکہ پر اچانک حملہ آور ہوا جائے تا کہ مکہ جیسی پر امن جگہ پر خون خرابہ نہ ہو اور حرم پر قبضہ کرنے کے لیے خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہانا پڑے۔ یہ آپؐ کا منصوبہ تھا اور آپؐ نے خاموشی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ ایک صحابی تھے۔ انھوں نے مکہ میں اپنے عزیز و اقارب کے تحفظ جان و مال کے پیش نظر ایک پرچے پر یہ لکھ کر کہ حضورؐ مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں اور تم اپنے بچاؤ کا سامان کر لو' ایک عورت کو دیا کہ اس کو مکہ پہنچا دے۔ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر بذریعہ وحی دے دی کہ یہ عورت مکہ پیغام لے کر جا رہی ہے۔ آپؐ نے اسے گرفتار کرنے کے لیے دو اصحاب حضرت علیؓ اور ایک اور صحابیؓ کو بھیجا۔ انھوں نے راستے میں اس عورت کو پکڑ لیا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا مگر جب انھوں نے اس کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے پرچہ نکال کے دے دیا اور وہ پرچہ لے کر آ گئے۔ اب بارگاہ نبویؐ میں مقدمہ پیش ہوا۔

حضرت عمرؓ نے فوراً کہا یا رسول اللہؐ مجھے اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں۔ آپؐ نے فرمایا صبر کرو! پھر حضرت حاطبؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضورؐ نے انھیں بلایا اور پوچھا: حاطبؓ تم نے یہ کیوں کیا؟ انھوں نے کہا کہ میں بڑا کمزور اور بے سہارا آدمی ہوں۔ میرے علاوہ یہاں باقی جتنے لوگ ہیں مکہ میں ان سب کے رشتہ دار ہیں جو بڑے با اثر ہیں۔ وہ ان کے تحفظ کا سامان کر لیں گے۔ میں نے سوچا کہ آپؐ تو اللہ کے حکم سے جا رہے ہیں اور آپؐ کی فتح میں کوئی شک نہیں ہے اور میری اس کوشش سے آپؐ کی فتح میں کوئی کمی نہیں آئے گی لیکن اس طرح میرے کمزور رشتہ دار اپنی جان بچا لیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ انھوں نے سچی بات کی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اُڑا دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات کو رد کر دیا اور فرمایا: عمر تمھیں پتہ نہیں کہ یہ بدری ہیں' غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اللہ تعالیٰ نے بدر والوں کے دل میں اخلاص

رکھا ہے ان کی نیت ٹھیک ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے گناہ قابل عفو ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کردیا ہے (بخاری)۔ اس پر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ اپنی بات پر پچھتائے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح بردباری سے معاملات کی تحقیق فرماتے اپنے اصحاب سے مشفقانہ سلوک فرماتے حسنِ ظن سے کام لیتے اور ان کے مقام ومرتبہ اور کام کی نوعیت کا پورا پورا خیال رکھتے اور انھیں معاف کردیتے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح فرمادیتے کہ یہ معافی کے مستحق ہیں۔

لوگ آپؐ کو تکلیف دیتے تھے' طعنے دیتے تھے، تنگ کرتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، دشمن اور منافق آتے تھے، یہودی آتے تھے جن کی دشمنی اور منافقت کا آپ کو علم ہوتا تھا' مگر کبھی آپؐ نے سختی سے کسی کو جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ ایک یہودی نے آکر آپ کو السلام علیکم کی بجائے السام علیکم کہا تو آپؐ نے کہا کہ اے عائشہ اللہ تعالیٰ نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی ہی پر ساری بھلائی موقوف ہے۔ نرم رویہ اختیار کرو' سختی مت کرو۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپؐ کے خادم تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دس سال تک میں نے آپؐ کی خدمت کی لیکن آپؐ نے کبھی کسی بات پر اُف تک نہیں کہا اور یہ تک نہ فرمایا کہ یہ کیوں کیا اور وہ کیوں نہیں کیا؟ دس سال کے عرصے میں آپؐ نے کبھی ایک دفعہ بھی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ معافی اور درگزر کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس کا کوئی ایک مخصوص پہلو نہیں ہے۔ یہ تو دشمنوں کے ساتھ بھی ہے اور دوستوں کے ساتھ بھی، گھر کے اندر بھی ہے اور باہر بھی' ملازمین کے ساتھ بھی ہے اور محلہ والوں سے بھی۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہوجائے یا وہ کوئی ایسی بات کہہ دے جو ناگوار ہو' یا کوئی کام ایسا کرگزرے جو ناپسند ہو' تو اس کو معاف کر دینا ہی فیاضی اور سخاوت ہے۔ جس طرح مال دینا فیاضی اور سخاوت ہے' اسی طرح معاف کر دینا بھی فیاضی اور سخاوت ہے۔

اس کا ایک پہلو قرض دینے سے متعلق بھی ہے۔ ہمارے ہاں قرض مانگنے والے بھی ہیں اور ضرورت مند بھی۔ قرض دینے اور لینے کا ہر شخص کو کسی نہ کسی طرح تجربہ ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی بات کی تاکید فرمائی ہے کہ اگر تم چھوڑ سکتے ہو تو قرض کو معاف کر

دو، ورنہ مہلت دو۔ احادیث میں تو اس کی اتنی تاکید ہے اور اس پر اتنی احادیث ہیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

ایک روایت میں ہے حضورؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں سے ایک شخص تھا جب وہ مر گیا تو فرشتوں نے اس سے پوچھا تم کچھ عمل کما کے لائے ہو؟ اس نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں قرض دیا کرتا تھا تو اپنے نوکروں اور خادموں سے کہا کرتا تھا کہ جو قرض ادا نہ کر سکتا ہو اس کو مہلت دو۔ جتنا وہ آسانی کے ساتھ دے سکتا ہو اتنا لے لیا کرو، اور جس کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہ ہو اس کو یا تو معاف کر دو یا اس کو جتنی مہلت وہ مانگتا ہو دے دو۔ اے اللہ! میں یہ صرف اسی امید پر کرتا تھا کہ جس طرح میں اپنے قرض داروں کو چھوٹ دیتا ہوں، معاف کرتا ہوں اور مہلت دیتا ہوں، اسی طرح تو بھی مجھے معاف کر دے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اگر کوئی تکلیف پہنچائے تو بدلہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ آدمی ہر صورت میں معاف کر دے، یہ انسانی فطرت، انسانی معاشرے اور باہمی تعلقات کے خلاف بات ہوئی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ۚ (الشوریٰ: ۴۰)

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔"

قرآن نے کہا کہ ہاں، برائی کا بدلہ لے سکتے ہو لیکن اس کے برابر جتنی تم سے زیادتی ہوئی ہو۔ یہ برابر کے بدلے کی شرط ایسی ہے کہ آدمی جتنا بھی سوچے اندازہ نہیں کر سکتا ہے کہ برابر کا بدلہ آخر کیا ہوگا۔ مال میں تو آدمی تول کے دیکھ سکتا ہے کہ برابر کا بدلہ کتنا ہے۔ ۱۰۰ روپے کے بدلے میں ۱۰۰ روپے لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی نے مارا تو کتنی چوٹ لگی، اگر کسی نے گالی دی تو کتنی ذلت ملی، اور اس کے جواب میں اگر گالی دی گئی تو دوسرے نے کتنی ذلت اٹھائی، اس کا کوئی وزن ہم دنیا کے اندر نہیں کر سکتے۔

ایک صحابیؓ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ میرے غلام اور نوکر ہیں۔ یہ خیانت بھی کرتے ہیں اور برا بھلا کام بھی۔ اس کے جواب میں میں بھی ڈانٹ ڈپٹ کر لیتا ہوں اور کبھی

مارتا بھی ہوں۔ میرا ان کا کیا معاملہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا تمھارے اعمال تمھارے لیے ہیں اور ان کے اعمال ان کے لیے۔ جو کچھ انھوں نے کیا اس کا حساب وہ دیں گے، اور جو کچھ تم نے کیا اس کا حساب تم دو گے۔ اگر یہ دونوں برابر ہوئے تو تم چھوٹ جاؤ گے لیکن اگر جو کچھ تم نے ان کے ساتھ کیا وہ زیادتی ہوئی تو پھر تمھیں اس کا بدلہ قیامت کے روز دینا پڑے گا۔ یہ سن کر وہ صحابیؓ اپنے آپ کو پیٹنے لگے اور کہنے لگے پھر تو میں تباہ ہوگیا۔ یہ کیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بدلے میں کس نے زیادتی کی۔ پھر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد واپس آکر انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں ان سب کو آزاد کر دوں۔ کیونکہ میں نہیں جان سکتا کہ بدلے میں کس نے کتنی زیادتی کی۔ میں اللہ کے سامنے اس طرح نہیں جانا چاہتا کہ میں نے زیادتی کی ہو۔ لہٰذا بدلہ لینے کی اجازت ضرور ہے لیکن یہ اس پابندی کے ساتھ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے یہ کہنے کے بعد کہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (الشوریٰ:۴۰) ”کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے“ معاف کرنے کی ترغیب دی ہے: فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (الشوریٰ:۴۰) ”پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔“

معاف کرنے کا اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ پھر عذر قبول کرنے کا حکم ہے اور یہ کہا گیا کہ اگر تمھارا بھائی کوئی عذر پیش کرے کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی یا اس وجہ سے بات منہ سے نکل گئی، مُحِقًّا اَوْ مُبْطِلًا، یعنی وہ سچا ہو یا جھوٹا اُس کو قبول کرو۔

اگر کوئی کسی کے مال پر ناجائز قبضہ کرلے یا ناجائز ٹیکس لے، اس حوالے سے احادیث میں اس کی کڑی سزائیں بتائی گئی ہیں لیکن اس کی اجازت نہیں ہے کہ آدمی کسی کا عذر قبول نہ کرے۔ کسی سے خفا ہو کے تین دن سے زیادہ تعلقات کو ترک کر دینا جائز نہیں۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ کسی مسلمان بھائی کے لیے اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض رہنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ جائز نہیں وہ سلام کرے تو منہ پھر لیا جائے۔

ہمارے ہاں جو یہ روش پائی جاتی ہے کہ بول چال نہیں ہے، مہینوں گزر گئے اور ترک

تعلق ہے‘ اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔

معاف کر دینے کے ضمن میں ایک اور اہم پہلو ہے جو ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے اور جسے حضورؐ نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے اور بیٹھے بیٹھے آپؐ اچانک مسکرائے اور اتنا مسکرائے کہ سامنے کے دانت دکھائی دینے لگے۔ حضورؐ بہ آواز بلند قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے تھے۔ آپؐ کی مسرت وخوشی کی انتہا یہ تھی کہ آپؐ اس طرح ہنستے تھے کہ دانت صاف دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ پر ہمارے ماں باپ قربان اور فدا ہوں‘ آپؐ کو کس چیز نے ہنسا دیا؟ حضرت عمرؓ نے بھی یہ سوال کیا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں‘ آخر کس چیز نے آپ کو خوش کیا کہ آپؐ مسکرا دیے؟

آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میری امت کے دو آدمی اللہ کے حضور اپنا مقدمہ لیے زانو سے زانو لگائے ہوئے‘ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا اے رب! اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ اس کا بدلہ مجھے یہاں دلوایئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تمھارے بھائی سے میں تمھیں کیا بدلہ دلواؤں‘ اس کے پاس تو کوئی بھی نیکی نہیں ہے کہ میں کچھ نیکیاں لے کر تمھیں دے دوں۔ اس نے کہا پھر میرے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈال دیں۔ یہ کہنے کے بعد حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بڑا عجیب دن ہوگا کہ جہاں آدمی کے لیے یہ بات بھی بڑی غنیمت ہوگی کہ وہ گناہوں کا جو بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر لایا ہے‘ اس میں کچھ کمی ہو جائے۔

جب مدعی یہ کہے گا کہ اگر اس کے پاس دینے کے لیے نیکیاں نہیں ہیں تو آپ میرے کچھ گناہ لے کر اس کے حوالے کر دیجیے‘ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا! تم ذرا نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھو۔ وہ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھے گا کہ ایک بڑی ہی عمدہ جگہ ہے۔ اس کے اندر سونے کے مکانات ہیں جو موتیوں سے مرصّع ہیں اور وہاں ہر قسم کی نعمتیں ہیں۔ وہ کہے گا کہ یہ کس کا محل ہے۔ شاید یہ کسی نبی کا ہے‘ کسی صدیق کا ہے یا کسی شہید کا ہے۔ یہ اتنا اعلیٰ مقام ہوگا کہ اس کے ذہن میں یہی آئے گا کہ اتنا اعلیٰ درجہ تو کسی نبی‘ صدیق یا شہید کو ہی مل سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو اس کی قیمت ادا کرے گا اس کو یہ مل سکتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ اس کی قیمت کون دے سکتا ہے؟ کس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ اس کی قیمت ادا کر سکے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اگر تو چاہے تو اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ وہ کہے گا کہ میرے پاس کیا رکھا ہے کہ قیمت دے سکوں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر تو اس بندے کو معاف کر دے تو تجھے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں پھر اس کو معاف کرتا ہوں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا۔

آج اس دنیا میں جو آدمی معاف کرے گا' معافی کی روش پر چلے گا' قیامت کے دن اس کے لیے بخشش بھی ہے اور نہایت بلند درجات بھی۔ مگر اس کے لیے دل کی کشادگی اور وسعت قلبی ہونی چاہیے۔ اسی سے جیب بھی کھلتی ہے' اسی سے برتاؤ میں فیاضی آتی ہے اور حقوق کے معاملے میں بھی آدمی کم لینے پر راضی ہو جاتا ہے اور زیادہ دینے پر اصرار کرتا ہے۔ اسی سے زندگی کے اندر احسان' محبت' چاشنی' مٹھاس اور شیرینی اور اس زندگی کا حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا فیاضی اگر ایک طرف راہ خدا میں مال دینا اور صدقہ کرنا ہے اور ہر قسم کی نیکی کرنا ہے' تو دوسری طرف لوگوں کی غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کرنا اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرنا بھی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم کھلے دل سے دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَ فِیْمَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ نَفْسًا فَسَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَھْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰی رَاھِبٍ فَاَتَاہُ فَقَالَ اِنَّہٗ قَتَلَ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ نَفْسًافَھَلْ لَہٗ مِنْ تَوْبَۃٍ فَقَالَ لَا فَقَتَلَہٗ فَکَمَّلَ بِہٖ مِائَۃً ثُمَّ سَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَھْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰی رَجُلٍ عَالِمٍ فَقَالَ اِنَّہٗ قَتَلَ مِائَۃَ نَفْسٍ فَھَلْ لَہٗ مِنْ تَوْبَۃٍ فَقَالَ نَعَمْ وَمَنْ یَّحُوْلُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ التَّوْبَۃِ؟ اِنْطَلِقْ اِلٰی اَرْضِ کَذَا وَکَذَا فَاِنَّ بِھَآ اُنَاسًا یَعْبُدُوْنَ اللّٰہَ تَعَالٰی فَاعْبُدِ اللّٰہَ تَعَالٰی مَعَھُمْ وَلَا تَرْجِعْ اِلٰی اَرْضِکَ فَاِنَّھَا اَرْضُ سَوْءٍ فَانْطَلَقَ حَتّٰی اِذَا نَصَفَ الطَّرِیْقَ اَتَاہُ الْمَوْتُ فَاخْتَصَمَتْ فِیْہِ مَلٰٓئِکَۃُ الرَّحْمَۃِ وَمَلٰٓئِکَۃُ الْعَذَابِ۔ فَقَالَتْ مَلٰٓئِکَۃُ الرَّحْمَۃِ جَآءَ تَآئِبًا مُقْبِلًا بِقَلْبِہٖٓ اِلَی اللّٰہِ وَقَالَتْ مَلٰٓئِکَۃُ الْعَذَابِ اِنَّہٗ لَمْ یَعْمَلْ خَیْرًا قَطُّ فَاَتَاھُمْ مَلَکٌ فِیْ صُوْرَۃِ اٰدَمِیٍّ فَجَعَلُوْہُ بَیْنَھُمْ فَقَالَ قِیْسُوْا مَابَیْنَ الْاَرْضَیْنِ فَاِلٰٓی اَیَّتِھِمَا کَانَ اَدْنٰی فَھُوَ لَہٗ فَقَاسُوْا فَوَجَدُوْہُ اَدْنٰی اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْٓ اَرَادَ فَقَبَضَتْہُ مَلٰٓئِکَۃُ الرَّحْمَۃِ۔ قَالَ قَتَادَۃُ فَقَالَ الْحَسَنُ ذُکِرَ لَنَا اَنَّہٗ لَمَّآ اَتَاہُ الْمَوْتُ نَاٰیٰ بِصَدْرِہٖ۔ (مسلم ج۳، کتاب التوبہ، باب قبول توبۃ القاتل)

"حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے ایک شخص تھا جس نے ۹۹ خون کیے تھے۔ اس نے دریافت کیا کہ زمین کے لوگوں میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟ لوگوں نے ایک راہب کا بتایا۔ (راہب نصاریٰ کے پادری) وہ بولا میں نے ۹۹ خون کیے ہیں۔ میری توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ راہب نے کہا کہ تیری توبہ قبول نہ ہوگی۔ اس نے اس راہب کو بھی مار ڈالا اور

۱۰۰ خون پورے کر لیے۔ پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ زمین میں کون سب سے بڑا عالم ہے؟ لوگوں نے ایک عالم کا بتایا۔ وہ اس کے پاس گیا اور بولا میں نے ۱۰۰ خون کیے ہیں۔ میری توبہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟ وہ بولا: ہاں، ہو سکتی ہے اور توبہ کرنے سے کون سی چیز مانع ہے۔ تم فلاں بستی میں چلے جاؤ وہاں کچھ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو بھی جا کر ان کے ساتھ عبادت کر اور اپنی بستی میں مت جا وہ بری بستی ہے۔ پھر وہ اس بستی کو چلا جب آدھے فاصلے پر پہنچا تو اس کو موت آ گئی۔ اب عذاب کے فرشتوں اور رحمت کے فرشتوں میں جھگڑا ہوا۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ یہ توبہ کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر آ رہا تھا۔ عذاب کے فرشتوں نے کہا کہ اس نے کوئی نیکی نہیں کی۔ آخر ایک فرشتہ آدمی کی صورت بن کر آیا اور انھوں نے اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کو مقرر کیا۔ اس نے کہا دونوں ملکوں تک ناپو اور جس ملک کے وہ قریب ہو وہیں کا ہے۔ ناپا تو وہ اس ملک کے قریب تھا جہاں کا ارادہ رکھتا تھا۔ آخر رحمت کے فرشتے اس کو لے گئے۔ قتادہ نے کہا حسن نے کہا ہم سے بیان کیا لوگوں نے کہ جب وہ مرنے لگا تو اپنے سینہ کے بل بڑھا (تاکہ اس ملک سے نزدیک ہو جائے)۔"

آج ہمارے لیے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر ہو سکیں اور ہمیں یہ سعادت نصیب ہو سکے کہ آپؐ سے براہِ راست استفادہ کریں، لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سن سکیں۔ آپؐ کی باتوں سے اپنی روحوں کو فیض یاب کر سکیں، آپؐ کے بخشے ہوئے انمول ہیروں سے اپنی جھولی بھر سکیں اور اپنی زندگیوں کو آپؐ کے نور سے روشن کر سکیں جو آپؐ کی ہدایت اور صحبت کے اندر موجود ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے لیکن میری نظر میں اس کے بعد دوسرا بڑا معجزہ آپ کی وہ سیرت طیبہ ہے کہ جس کا حسن و جمال اس کو اُسوۂ حسنہ بناتا ہے۔ اس لیے کہ آپؐ کا اسوہ چلتا پھرتا قرآن تھا۔

آپؐ کا تیسرا معجزہ انسانوں کی وہ جماعت ہے جسے آپؐ نے بنایا، سنوارا اور بلندیوں تک پہنچایا اور جنھوں نے آپؐ کی بات سنی، آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور آپؐ کے پیچھے چل پڑے۔ آپؐ نے ان کا ہاتھ تھاما، ان کے دلوں کے روگ کا علاج کیا، ان کے اخلاق کو پاکیزہ بنایا اور بالآخر وہ خدا کے ایسے بندے بن گئے کہ ایک طرف ان کے دل خدا کی محبت سے سرشار تھے اور ان کا عمل خدا کی مرضی کے مطابق تھا، اقبال کے الفاظ میں ہر ایک اس طرح

نور قرآنی اور نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تھا کہ ہر سینہ دل کاش اوست' یعنی ہر سینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کا ایک ٹکڑا پیدا ہو گیا تھا' اور دوسری طرف کامرانیوں کی یہ انتہا ہوئی کہ سو سال کے عرصے میں اس جماعت نے اسپین سے لے کر افریقہ تک دنیا کو مسخر کر لیا اور وہ اس کی امام بن گئی۔

کامیاب اور اچھی زندگی کی آرزو کس کو نہیں ہوتی' بلکہ غور کریں تو ہم سب کی کوششوں اور کاوشوں کا مقصود یہی ہے کہ ہماری زندگی اچھی اور کامیاب ہو۔ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس سے کامیاب اور اچھی زندگی نہ آسمان نے دیکھی اور نہ زمین پر بسر ہوئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی' اور جو آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی زندگی تھی۔ یہ وہ زندگی ہے جس کی تصویر ہم کو احادیث کے آئینے میں نظر آتی ہے۔ اگر ہم اس آئینے کو دیکھیں اور اس سے روشنی حاصل کریں' تو آج بھی ہمارے لئے وہ راہ کھل سکتی ہے کہ جس پر چل کر سب سے پہلے صحابہ کرامؓ نے آپؐ کا ساتھ دیا تھا' اور دنیا و آخرت کی ساری سر بلندیاں حاصل کی تھیں۔ اس لیے تذکیر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صحبت ہماری زندگی کے لیے بھی بڑی اہم اور مبارک صحبت ثابت ہو سکتی ہے۔

زندگی کا وہ سفر جو کامیابی' بھلائی اور نیکی کی جستجو میں بسر ہو' اس راہ کا پہلا قدم کیا ہے؟ اس پر چلنے کے لیے ہمیں کس زادِ راہ کی ضرورت ہے اور وہ کون سی شرائط ہیں جن پر چلنے سے یہ سفر کامیابی کے ساتھ پورا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہمارے پیش نظر رہیں گے' اور ان کا جواب اس حدیث کے اندر موجود ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

ہم جیسے ہی نیکی اور بھلائی کا سفر شروع کرتے ہیں' تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو ہم خود ہیں۔ ہزار ارادے باندھتے ہیں لیکن وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے لیکن ہم نہیں کرتے یا کر نہیں پاتے' اور ہمیں یہ بھی خوب معلوم ہوتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے' اور کیا نہیں کرنا چاہیے' مگر جو نہیں کرنا چاہیے اس سے ہم نہیں رک پاتے۔ کہیں وسوسے ہوتے ہیں' کہیں دنیا کی ترغیبات آڑے آجاتی ہیں اور کہیں نفس کی خرمستیاں۔ ہم سب کو اس کا بھی بخوبی اندازہ ہے کہ ہر روز ہم سے دانستہ یا نادانستہ بہت

سے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث ہمارے اس سب سے پہلے مسئلے سے بحث کرتی ہے۔ اس کے راوی ایک انصاری صحابی حضرت کعب بن مالکؓ ہیں۔ ان کی کنیت ابو سعید خدریؓ ہے اور وہ اسی نام کے ساتھ پکارے جاتے ہیں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں ایک آدمی ایسا تھا، جس نے ۹۹ آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ پھر اس نے پوچھنا شروع کیا کہ زمین والوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اس کو ایک راہب کا پتا بتایا گیا۔ وہ اس راہب کے پاس آیا اور کہا کہ اس نے ۹۹ آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ کیا اس کے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟

جب راہب نے انکار کیا تو اس نے اس کو بھی مار ڈالا اور اس طرح اس نے ۱۰۰ قتل پورے کر لیے۔ پھر اس نے پوچھنا شروع کیا کہ زمین والوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اس کو پھر ایک عالم کا پتا بتلایا گیا۔ وہ وہاں گیا اور پوچھا کہ اس نے ۱۰۰ انسانوں کو قتل کر دیا ہے۔ کیا اب اس کے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ عالم نے کہا کہ ہاں، تمہارے اور توبہ کے درمیان کیا چیز رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس بستی کی طرف چلے جاؤ، اس میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ تم ان کے ساتھ مل کر اللہ کی بندگی کرو اور اپنی اس بستی کی طرف لوٹ کر نہ آنا، اس لیے کہ یہ برے لوگوں کی بستی ہے۔ چنانچہ اس نے اس بستی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اس کو موت آ گئی۔

اب اس کے بارے میں رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ یہ آدمی توبہ کر کے سچے دل کے ساتھ اللہ کی رحمت کی طرف آیا تھا۔ مگر عذاب کے فرشتوں نے کہا کہ اس نے تو ایک بھی نیکی نہیں کی۔ اس کے بعد ان کے پاس ایک فرشتہ انسانی صورت میں آیا۔ انھوں نے اس کو اپنے درمیان جھگڑا نبٹانے کے لیے ثالث بنا لیا۔ اس نے کہا کہ دونوں بستیوں کے درمیانی فاصلے کو ناپو اور یہ شخص جس بستی کے قریب پایا جائے، وہ اسی بستی میں شمار ہو گا۔ لہٰذا فاصلہ ناپا گیا اور وہ اس بستی کے قریب پایا گیا جس کی طرف ارادہ کر کے وہ جا رہا تھا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کی

روح قبض کرلی۔ بخاری اور مسلم دونوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

ایسی حدیث کو جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہو، علم حدیث کی اصطلاح میں متفق علیہ کہا جاتا ہے، اور جو حدیث ایسی ہو کہ جس پر بخاری اور مسلم دونوں متفق ہو گئے ہوں اپنے درجے کے لحاظ سے اس کا شمار بہت اونچی احادیث میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بڑی صحیح اور اونچے درجے کی حدیث ہے۔

امام بخاریؒ جن کا نام محمد بن اسماعیل تھا، ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ ان کی کتاب صحیح بخاری میں ۹ ہزار سے زائد احادیث ہیں لیکن بعض احادیث بار بار بیان ہوئی ہیں۔ اگر ہم صرف ان احادیث کو شمار کریں جن کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے تو وہ ساڑھے تین ہزار احادیث ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تیاری کے لیے سخت اور کڑا معیار رکھا۔ راویوں کو پرکھنے کے بعد جب وہ کوئی حدیث اس میں درج کرتے تو اس سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے اور پھر وہ حدیث درج کرتے۔ یہ حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتاب شمار ہوتی ہے۔

امام مسلم کی پیدائش ۲۰۴ھ کی ہے، اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔ آپ تقریباً امام بخاریؒ کے ہم عصر ہیں۔ ان کی کتاب صحیح مسلم میں ۴ ہزار احادیث درج ہیں۔ ان دو کتابوں کے علاوہ اس حدیث کو امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند، احمد میں اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

اب آئیے اس حدیث پر غور کریں۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے لیے ایک بڑا موثر طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ آپؐ نے ایک کہانی بیان فرمائی ہے۔ کہانی کے لفظ سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ کہانی سچی بھی ہوتی ہے اور جھوٹی بھی۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ آپؐ نے کہانی بیان فرمائی اور ان لوگوں کی کہانی بیان فرمائی جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

بخاری کی روایت کے مطابق اس شخص کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ امام احمد بن

حنبلؒ نے اپنی روایت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ یہ آدمی پہلے زمانے کا تھا یا بنی اسرائیل میں سے تھا' بلکہ یہ کہا ہے کہ یہ اللہ کا ایک بندہ تھا' جس نے ۹۹ قتل کیے۔ یہاں اس کا اطلاق صرف پرانے لوگوں پر نہیں ہے بلکہ ہر اس بندے پر ہوگا جو گناہوں میں مبتلا ہو۔ دیکھیے الفاظ کے فرق سے ہم کو یہ روشنی ملی کہ یہ واقعہ محض ایسا واقعہ نہیں ہے کہ ہم اسے صرف واقعہ سمجھ کر اس پر سے گزر جائیں' بلکہ جو بندہ بھی گناہوں کے اندر مبتلا ہو' اس کے لیے یہ واقعہ رہنما ہے۔ کہانی کے ذریعے تعلیم اس لیے بھی بڑی موثر ہے' کہ وہ بات جس کو کہنے کے لیے بڑے لمبے چوڑے دلائل اور فلسفے کی ضرورت ہوتی ہے' کہانی کے کردار اور واقعات اس کو کھول کر واضح اور روشن کر دیتے ہیں۔ عام آدمی بھی بڑی جلدی سمجھ سکتا ہے کہ کیا بات کہی جارہی ہے' اور دل پر بھی وہ براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔

اگر اس حدیث کی تشریح نہ بھی کی جائے تو مجھے یہ یقین ہے کہ آپ سب اس کا اصل مفہوم پا گئے ہوں گے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنے ہی گناہ کیوں نہ کرلے' اور کتنے ہی بڑے گناہ اس سے کیوں نہ سرزد ہو جائیں' یہاں تک کہ انسانی جان ضائع کرنا' اس کا خون بہانا' جو کہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے ایک انسان کو مارا' گویا اس نے سارے انسانوں کو مار دیا اور جس نے ایک انسان کو بچایا' گویا اس نے سارے انسانوں کی جان بچالی اگر اتنا بڑا گناہ بھی سرزد ہو جائے اور وہ بھی ایک نہیں ۱۰۰ قتل کرلے' توبہ کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوتا ہے' بشرطیکہ وہ چند شرائط کو پورا کرے۔ اس کے اندر اضطراب اور بے چینی ہو اور وہ نادم اور شرمندہ ہو۔ وہ اپنی اصلاح کا جذبہ رکھتا ہو' اور اپنی اصلاح کے لیے اپنی سی کوشش کرنے کے لیے تیار ہو۔ یہ اس حدیث کا مرکزی مضمون ہے۔

انسان اور گناہ کا بالکل ایسا تعلق ہے' جیسے کوئی آدمی پانی پر چلے تو وہ لازماً بھیگے گا۔ لہٰذا جو آدمی دنیا میں رہے گا اس سے لازماً گناہ سرزد ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں اختیار دیا ہے کہ ہم چاہیں تو نیکی کریں اور چاہیں تو برائی' اور ہمیں اس آزمائش کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنے ارادے اور اختیار سے نیکی کا راستہ اختیار کریں۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

(الملک: ۲)

"جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

گویا موت اور زندگی کے درمیان جو مہلت دی گئی ہے' یہ اس لیے ہے تاکہ اللہ آزما کر دیکھ لے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔ جب یہ اختیار دیا گیا ہے کہ انسان چاہیں تو اچھے عمل کر سکیں اور چاہیں تو برے' لہٰذا برے کام کرنے کا امکان پیدا ہو گیا' اور جب زندگی ایک آزمائش ٹھہری تو پھر یہ بھی امکان ہے کہ ہم برے کام کریں اور یہ بھی اختیار ہے کہ نیک کام کریں' نیکیاں بھی ہوں اور گناہ بھی۔ اس لیے گناہ کا سرزد ہونا انسان کے اس اختیار کے ساتھ ہے اور جن ترغیبات کے درمیان اسے رکھا گیا ہے' اس کا فطری تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اس وقت کھول کر بیان کر دیا تھا جب پہلا انسان پیدا کیا تھا۔ اس نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور ان کو ایک حکم دیا' اور ان کے اس اختیار کی آزمائش کی۔ ان پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ اللہ کے حکم کی اطاعت کریں' لیکن حضرت آدمؑ بھول گئے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ (طٰہٰ: ۱۱۵)

"ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا تھا' مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔"

جب انسان کو پیدائش کے پہلے دن ہی یہ بات کھول کر بیان کر دی گئی کہ جس آزمائش گاہ میں تم جا رہے ہو' تم ضعیف اور کمزور ہو' بھول اور غفلت تمھارے ساتھ لگی ہوئی ہے' ارادے کی کمزوری بھی تمھارے اندر موجود ہے' تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس امتحان اور آزمائش سے بخیر و خوبی گزرنے کے لیے اس کو مزید دو ہتھیار دیے۔

سب سے پہلے اس نے خود حضرت آدمؑ کو استغفار کے الفاظ سکھائے: فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ: ۳۷) "اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی۔" ایسا نہیں کہ اس نے ان کو چھوڑ دیا ہو بلکہ خود اس نے یہ کلمات حضرت آدم و حوا کو سکھائے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۲۳)

"اے رب ہم نے اپنے اوپر ستم کیا' اب اگر تم نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

گویا انسان پر یہ بات کھول دی گئی' کہ گناہ تو ہوگا' لیکن اس پر اصرار نہ کرنا' اس پر اکڑ نہ جانا بلکہ شرمندہ اور نادم ہو کر ہماری بارگاہ میں لوٹ آنا' تم ہمارا دروازہ کھلا پاؤ گے۔ اَتُوْبُ اِلَیْکَ پھر اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

دوسرا ہتھیار جو اللہ تعالیٰ نے پہلے روز ہی انسان کو دیا وہ اپنی ہدایت سے نوازنا ہے۔ اس نے کہا کہ تمھیں راستہ دکھانے کے لیے ہمیشہ میں اپنی ہدایت بھیجتا رہوں گا تاکہ جب تم بھول جاؤ تو میری ہدایت تمھیں یاد دلاتی رہے کہ سیدھا راستہ اور صحیح رویہ کیا ہے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی (البقرۃ:۳۸) یعنی تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت آتی رہے گی۔

توبہ دراصل وہ ہتھیار ہے جس سے انسان اپنی فطرت کی ساری کمزوریوں کے باوجود اس امتحان گاہ میں جب گناہ کے اندر مبتلا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو پاک صاف کر کے' دوبارہ صحیح راستے پر آسکتا ہے۔ اس لیے خدا کے جتنے انبیاءؑ آئے' انھوں نے اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت' اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ استغفار اور توبہ کی دعوت بھی دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں یہ فرمایا کہ لوگو! اللہ کے حضور توبہ کرو، میں دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ فرمایا ہے کہ جو بھی توبہ کرے گا' ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کرے گا' میں اس کو بخش دوں گا۔ چنانچہ توبہ دراصل علاج ہے ان سارے مسائل کا جو دنیا میں رہتے ہوئے ہمیں پیش آتے ہیں۔ ہم ارادہ کرتے ہیں اور ارادہ کمزور نکلتا ہے۔ منصوبے بناتے ہیں مگر وہ پورے نہیں ہوتے۔ ہم نیکی کرنا چاہتے ہیں' لیکن نیکی کے راستے پر چل نہیں پاتے۔ ہم برائی سے بچنا چاہتے ہیں لیکن پھر اس برائی میں لت پت ہو جاتے ہیں۔ اس کش مکش میں صرف ایک ہی چیز ہے جو ہمارا سہارا ہے' اور وہ ہے توبہ کا راستہ اور اللہ کی رحمت۔

اس حدیث پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ ہے جس نے بہت گناہ کیے تھے۔ جیسا کہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے ۹۹

قتل کیے تھے۔ ۹۹ سے مراد واقعی ۹۹ بھی ہو سکتے ہیں اور بہت سارے قتل بھی، لیکن ہم ۹۹ ہی فرض کرتے ہیں۔ البتہ اس میں اپنے گناہ کے اوپر اضطراب اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ اگر اس کے اندر یہ اضطراب اور بے چینی نہ پائی جاتی، یا اس کو ندامت اور شرمندگی نہ ہوتی، تو وہ کیوں پوچھتا پھرتا کہ کیا میرے لئے کوئی توبہ کا دروازہ ہے۔ جو آدمی غافل اور لاپروا ہو، اس کو اس بات کی کیا پروا ہوتی ہے کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اس شخص کو اس بات کی فکر تھی اور ۹۹ آدمی قتل کرنے کے بعد بھی اس کو یہ فکر لاحق تھی۔ اس کا ضمیر زندہ تھا جو اسے برابر کچو کے لگا رہا تھا، اور وہ بے چین تھا کہ میں آخر اپنے گناہوں سے کیسے نجات پاؤں، اور کیسے توبہ کروں اور کیسے واپس اپنے اللہ کی طرف لوٹوں!

دراصل گناہوں کی زندگی سے نکل کر نیکی کا سفر شروع کرنے کے لیے سب سے پہلا تقاضا اپنے گناہوں کا احساس، اور ان کے اوپر ندامت اور شرمندگی ہے۔ ندامت اور شرمندگی کے بغیر اگر آدمی سو دفعہ بھی استغفر اللہ، کہے تو اس کا کوئی فائدہ اس کو نہیں پہنچے گا، سوائے اس کے کہ زبان نے ایک اچھا لفظ بولا اور اس کے منہ سے اچھے الفاظ نکلے۔

توبہ کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ آدمی اپنے بارے میں فکرمند ہو۔ وہ اپنی غلطیوں کی تاویل نہ کرے کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے، یا اب کیا ہو سکتا ہے، یا ہم تو بڑے گناہ گار ہیں۔ درحقیقت جب ہم کہتے ہیں ہم بڑے گناہ گار ہیں تو اس کے پیچھے اپنے گناہ کو دور کرنے کے لیے کوئی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا اور نہ شرمندگی اور ندامت ہی ہوتی ہے، بلکہ یہ گناہ کرنے کی ایک تاویل اور عذر ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ توبہ دراصل ندامت اور شرمندگی کا نام ہے۔

ہم میں سے کون ہے جس سے کوئی گناہ نہ ہوتا ہو۔ ہر قسم کے گناہ ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ گناہ جو ہمارے دل پر بھی داغ لگاتے ہیں اور روح کو بھی مضطرب و بے چین کرتے ہیں، آخرت کے عذاب کا مستحق بھی ٹھہراتے ہیں اور وہ رحمان و رحیم آقا جو ہم سے محبت کرتا ہے، اور جس سے ہم کو محبت کرنا چاہیے، اس سے بھی ہم کو دور کرتے ہیں۔ نتیجتاً اس کے اور ہمارے درمیان پردہ اور حجاب ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی کہا ہے کہ لوگ گناہ

کرتے رہتے ہیں اوران کے دلوں پر زنگ جمتا رہتا ہے' یہاں تک کہ ان کے اوران کے رب کے درمیان پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ مگر جسے یہ احساس ہو کہ میں نے کوئی نقصان دہ چیز کھالی ہے' میری روح بے چین ہے' میرے سفید دامن پر سیاہ داغ پڑ گیا ہے' اور میرے دل پر کوئی سیاہ دھبہ پڑ گیا ہے' مجھ سے محبت کرنے والے آقا کی نگاہ پھر گئی ہے اور میں اس سے دور ہو گیا ہوں' تو اس کے دل میں آگ لگ جائے گی' وہ لوٹ کر واپس لوٹے گا۔ دراصل گناہ سے جو گندگی روح اور دل کے اندر پیدا ہوتی ہے' شرمندگی اور ندامت کی آگ اس کو جلا کر صاف کر دیتی ہے۔ جس طرح آگ پر کسی چیز کو گرم کیا جائے تو اس کا میل کچیل جھاگ بن کر نمایاں ہو جاتا ہے اور خالص چیز چھٹ کر الگ ہو جاتی ہے' اسی طرح جب دل کے اندر ندامت اور شرمندگی کی آگ لگتی ہے تو اس بے دل کے سیاہ داغ مٹ جاتے ہیں اور گناہوں کی گندگی سے آدمی پاک صاف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا توبہ اور اپنی اصلاح کے لیے پہلی شرط شرمندگی اور احساس ندامت ہے۔

توبہ کے لیے دوسری شرط جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے' وہ گناہ سے بچنے کا مصمم ارادہ ہے۔

اس حدیث کے مطابق اس آدمی کا اس قدر مضبوط ارادہ تھا' کہ پہلے تو وہ پوچھتا پھرتا رہا کہ زمین میں کون ہے جو مجھے بتائے' کہ توبہ کا کوئی راستہ ہے؟ جب وہ اسی راستے کی تلاش میں ایک راہب کے پاس پہنچ گیا' گوشے میں بیٹھ کر عبادت کرنے والے کے پاس' اور اس نے کہا کہ نہیں' تمہارے لیے کوئی توبہ نہیں ہے' بلکہ امام احمد بن حنبلؒ کے الفاظ میں راہب نے کہا کہ ۹۹ کے قتل کے بعد تو توبہ کرنا چاہتا ہے' تو اس نے اس کو بھی مار دیا۔ بظاہر انسان کو قتل کرنا تو ایک بڑا سنگین جرم تھا' لیکن یہ بھی اس کے دل کے کرب اور بے چینی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وقت تو وہ کچھ نہیں جانتا تھا' جاہل انسان تھا اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ توبہ کا راستہ کیا ہے؟ اس کو اس پر غصہ آیا کہ کیا میرے لیے کوئی توبہ کا راستہ نہیں ہو سکتا اور اس کے نتیجے میں یہ اقدام کر ڈالا۔ مگر اسے توبہ کی فکر لاحق تھی' اور اس کا ارادہ مضبوط تھا۔ پھر وہ اس کے پاس پہنچا جس کے پاس علم تھا' اور اس نے جب اس کو توبہ کا راستہ بتایا' تو وہ اس راستے کے اوپر چل کھڑا ہوا۔

دراصل یہ وہ مضبوط ارادہ تھا جس نے اس کو اس منزل تک پہنچایا۔ لہٰذا توبہ کے لیے دوسری چیز مضبوط ارادہ ہے۔

توبہ کے لیے تیسری چیز گناہوں سے بچنے کی پوری پوری کوشش ہے۔ توبہ کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اس چیز کو ترک کر دے' جو بری ہے اور اگر تلافی کر سکتا ہو تو اس کی تلافی بھی کرے اور اس چیز کو اختیار کرے جو اچھی ہو۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جب اس عالم نے اس کو کہا کہ اس بستی کو چھوڑ دو' جو برے لوگوں کی بستی ہے' اور اس بستی میں چلے جاؤ جو قریۃ الصالحہ ہے' جو نیک لوگوں کی بستی ہے' جہاں لوگ اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر اللہ کی بندگی کرو' تو اس نے اس راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ بغیر توقف اور بغیر ٹھہرے' وہ اس راستے پر نکل کھڑا ہوا۔ اس کی یہ کوشش' دراصل توبہ کے لیے تیسری شرط تھی جو اس نے پوری کی۔

نیکی کی راہ پر چلنے کے لیے یہ تین چیزیں ضروری اور ناگزیر ہیں' یعنی احساس گناہ ہو' اپنی غلط کاریوں پر ندامت اور شرمندگی ہو اور مضبوط ارادہ ہو کہ ان برائیوں سے پیچھا چھڑانا ہے اور پھر اس کے لیے آدمی بھرپور سعی اور کوشش شروع کر دے۔ یہ تین چیزیں تھی جو اس آدمی کا سرمایہ بھی تھیں اور اسی کے لیے اس نے کوشش بھی کی' اور یہی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں۔ اس کو انسان کے اعمال کے نتائج مطلوب نہیں۔ اس لیے کہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ وہ کتنا کمزور ہے اور کتنی خواہشات اور ترغیبات کے اندر گھرا ہوا ہے۔ دراصل جو چیز انسان کے اختیار میں ہے وہ یہ کہ آدمی اپنی غلطی پر نادم اور شرمندہ ہو' اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کا پختہ ارادہ کرے' اور اس کے لیے مقدور بھر کوشش کرے۔

اب یہ کوشش کتنی کامیاب ہوتی ہے' نیکی کی راہ پر یہ سفر پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے یا نہیں' یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ خدا کو تو بس خلوص نیت کے ساتھ کوشش اور سعی مطلوب ہے۔

اس کے بعد' کہانی آگے بڑھتی ہے کہ جب اس آدمی نے چلنا شروع کر دیا' ابھی وہ آدھے راستے ہی میں تھا کہ اس کو موت نے آلیا۔ یہاں روایات میں الفاظ مختلف ہیں اور ہر ایک روایت ایک مختلف پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب وہ مرنے لگا تو

اس نے اپنے سینے کا رخ اس بستی کی طرف کر لیا جو نیک لوگوں کی بستی تھی۔ اس کے اضطراب' بے چینی اور کوشش کا یہ عالم تھا کہ اس نے جب یہ سمجھا کہ موت آ گئی اور میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا' تو کم از کم رخ ہی اس بستی کی طرف کر لوں' چنانچہ اس نے اپنے سینے کا رخ موڑ کر اس بستی کی طرف کر لیا۔ امام احمد بن حنبلؒ کی روایت میں ہے کہ جب اس نے یہ جان لیا کہ موت آ گئی تو اس نے اپنے آپ کو گھسیٹنا شروع کر دیا' اور گھسٹ گھسٹ کر وہ اس بستی کے قریب ہونے لگا' جہاں اسے جانا تھا۔ یہ بھی ایک کیفیت ہے اس کی ندامت اور ارادے کی مضبوطی کی کہ جب اس نے خیال کیا کہ آخری وقت آ گیا ہے' تو اس نے گھسٹ گھسٹ کر اپنے آپ کو اس بستی کے قریب کرنے کی کوشش کی جو اس کی منزل تھی۔ اب اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی کوشش کس درجے کی تھی۔

اس کے بعد دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت اور رحمت کے لیے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ جب فرشتے جمع ہو گئے' عذاب کے بھی اور رحمت کے بھی' تو عذاب کے فرشتوں نے بالکل بجا کہا کہ اس آدمی نے تو ایک بھی نیکی نہیں کی بلکہ ۱۰۰ قتل کیے ہیں۔ اس لیے یہ خدا کے عذاب کا مستحق ہے۔ اس کے مقابلے میں رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ: چونکہ یہ توبہ کر کے اور اپنے دل کو اللہ کی طرف متوجہ کر کے اپنے رب کی طرف جا رہا تھا' اس کی رحمت کی طرف جا رہا تھا' لہٰذا یہ خدا کی رحمت کا مستحق ہے۔

اس بات کا فیصلہ کیسے ہوا کہ اس کا انجام کیا ہو؟ اب یہاں پر مختلف روایات ہیں۔ میں نے جو روایت بیان کی ہے وہ مسلم کی روایت ہے' کہ ایک فرشتہ انسانی صورت میں آتا ہے اور دونوں فرشتے اس کو حکم بناتے ہیں' کہ تم اس کا فیصلہ کر دو۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو اس برائی اور بری بستی کو حکم دیا کہ دور ہو جا اور دوسری بستی کو حکم دیا کہ تو اس شخص کے قریب ہو جا' اور پھر فرشتوں کو کہا کہ زمین ناپ لو۔ جب فرشتے زمین ناپتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ اس بستی سے ایک بالشت بھر قریب ہے جدھر وہ جا رہا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا' اور اس کی جان رحمت کے فرشتے قبض کر کے لے گئے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وہ جلوہ ہے' جو زندگی میں ہر وقت نظر آتا ہے۔ اگر ہم اللہ سے

امیدیں باندھ لیں تو یہ اس کی رحمت ہی ہے جو نیکی کے راستے پر سب سے بڑا سہارا ہے۔ خدا خوفی بھی ہے لیکن خوف سے بڑھ کر اس رحمان اور رحیم آقا کی رحمت اور مغفرت اور اس کی شفقت ہے جو ہر وقت ہماری دل جوئی کرنے کے لیے تیار ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کو اپنے بندے کی توبہ سے اتنی خوشی ہوتی ہے، کہ جیسے کوئی آدمی ریگستان میں جا رہا ہو اور اس کے پاس ایک ہی اونٹنی ہو اور اسی پر اس کا کھانا اور پانی لدا ہو۔ ایک جگہ وہ آرام کرنے کے لیے لیٹ جائے اور جب اٹھے تو دیکھے کہ اونٹنی سامان سمیت غائب ہے۔ اب ریگستان میں سورج چمک رہا ہے، نہ راستہ ہے، نہ پانی اور نہ کھانا۔ ایسے میں اس کی مایوسی کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے بعد وہ جگہ جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے لیکن اونٹنی کہیں نہیں ملتی اور بالآخر بالکل مایوس ہو کر لیٹ جاتا ہے کہ اب تو جان دینا ہے، اس لیے کہ نہ کھانا ہے نہ پانی اور نہ اونٹنی۔ اس حالت میں اس کی آنکھ لگ جاتی ہے اور جب آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی پاس ہی کھڑی ہوئی ہے۔ اب اس آدمی کی خوشی کا کیا عالم ہوتا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں کہ اس کو اس قدر خوشی ہوتی ہے کہ اس کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے اور وہ مارے خوشی کے کہتا ہے کہ اے اللہ تو میرا بندہ ہے میں تیرا رب، یعنی اس قدر حواس باختہ ہو جاتا ہے کہ الٹی بات اس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے، جتنی اس آدمی کو اپنی کھوئی ہوئی اونٹنی کو پانے سے ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے بندوں کی تلاش میں ہے کہ وہ آئیں اور اس کی راہ پر چلیں۔ یہ اس کی رحمت ہے جو برائی اور انسان کے درمیان راستے کو سمیٹ دیتی ہے اور نیکی اور آدمی کے درمیان راستہ مختصر کر دیتی ہے، اور صرف ایک بار ہی اس کے قریب ہونے پر رحمت کی آغوش کھول کر اس کو سمو لیتی ہے۔

حدیث میں اپنی جگہ پر پوری ایک کہانی بیان ہوئی ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک پہلو ایسا ہے کہ اس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس واقعے کو اگر ہم یاد رکھیں تو اس میں رہنمائی کا سارا سامان موجود ہے۔ نیکی کی راہ پر سفر کرنے کے لیے آپ کو جتنے اسباق کی

ضرورت ہے وہ اس واقعے کے اندر بیان ہو گئے ہیں۔ ان کو اگر آپ مضبوطی کے ساتھ تھام لیں تو آپ سیدھی راہ پر چل سکتے ہیں۔

اس حدیث میں غور وفکر کے لیے مزید دو پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ وہ آدمی پہلے راہب کے پاس گیا۔ مگر وہ راہب جو گوشے میں بیٹھ کر' اللہ کی راہ چھوڑ کر' اس کی عبادت کرتا تھا وہ اس کی صحیح راہ نمائی نہ کر سکا۔ پھر وہ عالم کے پاس گیا۔ عالم نے اس کو صحیح راستہ بتایا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں علم کا بڑا درجہ ہے۔ بہت ساری احادیث ہیں جن میں علم کی فضیلت' عبادت پر ظاہر کی گئی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ صحبت بڑی چیز ہے۔ آدمی کو نیک بننے کے لیے جہاں ندامت' اپنے ارادے' اور اپنی کوشش کی ضرورت ہے' وہاں اسے صالح صحبت کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ عالم نے کہا کہ بری صحبت ترک کر دو' اور نیک صحبت اختیار کر لو اور بری صحبت کی طرف لوٹ کر مت جانا۔

اب اگر ایک بار پھر ہم اس پوری حدیث پر غور کریں' اگرچہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے اس شخص کا ہے جس نے ۹۹ قتل کیے تھے لیکن اس کا تعلق ہم سے بھی ہے۔ اس کہانی میں ایک کردار ہے اور وہ کردار ہم سب کے سامنے ایک سوالیہ نشان کے طور پر کھڑا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک سے روزانہ نہ جانے کتنے گناہ جانے ان جانے میں سرزد ہو جاتے ہیں اور اگر وہ گناہ بھی شمار کر لیے جائیں جو دل کے ہوتے ہیں' جیسے کسی کو حقیر یا ذلیل سمجھنا' اور وہ گناہ جو زبان کے ہوتے ہیں اور عمل کے ہوتے ہیں' برتاؤ کے ہوتے ہیں' گھر کے ہوتے ہیں تو ان کا کوئی شمار نہیں ہے۔ اس لیے ابتدا ہی میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ خواہ کوئی بھی بندہ ہو' گناہ ضرور ہوں گے۔ اس لیے توبہ ہماری زندگی ہے اور اپنے رب کی طرف لوٹنا اور پلٹنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

اگر غور کریں تو دنیا کے اندر کوئی ایک بستی ایسی نہیں پائی جاتی کہ نیکی کے لیے ہم اس کی طرف ہجرت کریں' بلکہ طرح طرح کی بستیاں دنیا کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اگر ایک نیک مقاصد کی بستی ہے تو دوسری برے مقاصد کی بستی ہے۔ اب اگر زندگی کا مقصد نیکی کی راہ پر چلنا

ہے تو آدمی برے مقاصد کی زندگی سے نیک مقاصد کی زندگی کی طرف چلنا شروع کر دے اور اگر وہ آدھے راستے میں بھی ہو گا تو اس کی مغفرت ہو جائے گی۔

دل کی دنیا میں بھی اگر ایک طرف اچھے خیالات کی بستی ہے اور دوسری طرف برے خیالات کی بستی، تو آپ برے خیالات سے اچھے خیالات کی طرف چلنا شروع کر دیں۔

اسی طرح اعمال کی بھی ایک بستی ہے۔ ایک طرف اچھے اعمال ہیں اور دوسری طرف برے اعمال، ہمیں چاہیے کہ ہم برے اعمال ترک کر دیں اور اچھے اعمال کی طرف سفر شروع کر دیں۔

اسی طرح انسان ہیں، اچھے انسان بھی ہیں اور برے بھی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اچھے انسانوں کی صحبت اختیار کریں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی بستی کو چھوڑ کر یا کسی محلہ کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر رہا جائے۔ صبح سے شام تک ہم سو مرتبہ ایک بستی سے دوسری بستی کی طرف سفر کر سکتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے، کانا فی بعد طریق، وہ راستے میں کہیں بھی تھا، گویا خدا کی راہ میں ہی تھا۔

اس دنیا میں کہیں اس راستے کی منزل نہیں ہے۔ اس میں پہلے قدم پر ہی منزل ہے۔ جہاں کسی نے توبہ کے راستے پر قدم رکھ دیا، وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور منزل نہیں ہے۔ جس نے آدھے سے زیادہ راستہ طے کر لیا، تو وہ بھی کامیاب ہو گا، اور اگر کوئی چلتا ہی رہا اور آدھے راستے پر بھی نہ پہنچ سکا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس فاصلے کو کم کر دے گی جہاں پر اس کو پہنچنا ہے۔

یہ وہ سبق ہے جو ہم کو اس حدیث سے ملتا ہے۔ اگر ہم اس کو یاد رکھیں تو زندگی کا یہ سفر جو ہمارے سامنے ہے، جو ہمیں درپیش ہے کہ ہم اس دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر دنیا میں بھی کامران اور سربلند ہوں، اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے حصول کے مستحق ٹھہریں، اس کے لیے اس ضمن میں رہنمائی اس حدیث سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے لیے ایک بنیادی بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ کو یہ سفر شروع کرنا ہے' تو آپ رات یا دن میں تنہائی میں تھوڑا سا وقت نکالیے' اور بالکل تنہا' آنکھیں بند کر کے بیٹھ جایئے' اور اپنی پوری زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں۔ اپنے دل' اپنے دماغ کے بارے میں' اپنے مقاصد اور تصورات کے بارے میں' اپنی کمائی اور اعمال کے بارے میں' دوسرے انسانوں سے برتاؤ کے بارے میں' سوچیے اور غور و فکر کیجیے۔ جہاں جہاں آپ کا علم یہ بتاتا ہو کہ آپ نے غلط کیا' وہاں اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں اور پختہ ارادہ کریں کہ اب آپ اس کو دوبارہ نہ کریں گے' اور نیکی کی راہ پر چلنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ اس توبہ کے بعد بھی اگر خدانخواستہ سو دفعہ بھی پلٹ کر یہ گناہ سرزد ہو جائے مگر جب تک آپ پلٹتے رہیں گے' اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کرتے رہیں گے اور گناہوں سے بچنے کی بھرپور کوشش میں لگے رہیں گے' اللہ کا در ہمیشہ کھلا پائیں گے۔